جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

حق آیا اور باطل مٹ گیا بے شک باطل کو مٹنا ہی تھا (بنی اسرائیل ۸۱)

اِحقاقِ حق

قرآن کریم پر ستھیارتھ پرکاش کے اعتراضات کا جواب

آریہ دھرم ہندومت اور آواگون (تناسخ) کے فلسفیانہ اوہام کا محققانہ بطلان

تصنیف:

حضرت صدر الافاضل مولانا مفتی سید محمد نعیم الدین مرادآبادی رحمہ اللہ تعالیٰ

مرتب:

حضرت علامہ مفتی حکیم سید غلام معین الدین نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ

ناشر:

فرید بک سٹال

۳۸ اردو بازار لاہور

نام کتاب • احقاق حق

تصنیف • مولانا مفتی سید محمد نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ

ترجمہ • مولانا علامہ مفتی غلام معین الدین نعیمی قدس سرہ

تصحیح ونظر ثانی • مولانا حافظ محمد شاہد اقبال

مطبع • [illegible] پرنٹرز لاہور

اشاعت [illegible] • [illegible] ۱۴۲۳ھ / [illegible] ۲۰۰۲ء

ہدیہ • -/75 روپے

ناشر

فرید بک سٹال (پرائیویٹ) ۳۸ اردو بازار لاہور

فون نمبر 042-7312173 ، فیکس نمبر 092-042-7224899

ای میل ایڈریس Email: info@faridbookstall.com

Visit us at: www.faridbookstall.com ویب سائٹ

فہرست

احقاق حق

قرآن کریم پر ستیارتھ پرکاش کے اعتراضات کا جواب

آریہ دھرم اور آواگون (تناسخ) کے فلسفیانہ اوہام کا محققانہ بطلان ____ 5

اعتراض بر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ____ 6

اعتراضات متعلق سورۂ فاتحہ ____ 15

آواگون یعنی تناسخ کی بحث اور اس کا بطلان ____ 21

جوابات اعتراضات متعلق سورۂ بقرہ ____ 37

جنت کا بیان ____ 88

بہشت میں اہل جنت کا شاندار داخلہ ____ 89

جنت کی وسعت ____ 93

جنت کی فضا ____ 94

اہل جنت کے لباس و فروش ____ 98

جنتی بیبیاں ____ 99

حیات دوام اور موت سے امن ____ 106

جنتی جو چاہیں گے وہ ملے گا ____ 107

دیدار الٰہی ____ 107

احقاقِ حق

قرآن کریم پر ستیارتھ پرکاش کے اعتراضات کا جواب

آریہ دھرم اور آواگون (تناسخ) کے فلسفیانہ اوہام کا محققانہ بطلان

جس طرح دنیا میں ہر صاحب کمال کے لیے معاند و حساد لازم ہیں اور ہر یکتائے دوراں کو رشک و حسد کے سنان و سہام کا ہدف بننا ناگزیر ہے اور جس طرح حاسدوں کے حسد اور معاندوں کی عداوت سے اہل کمال کی شہرت و رواج اور ان کے کمال کا اظہار و اعلان اور زیادہ ہوا کرتا ہے' اسی طرح مقدس اسلام کو حاسدوں اور معاندوں سے واسطہ پڑا اور پڑتا رہتا ہے اور جس قدر اس کے ساتھ حسد اور عداوت کی رسمیں برتی گئیں اور اس کو مٹانے اور نیست و نابود کرنے کے لیے اہلِ باطل کی ساری قوتیں تل تل کر آئیں اور انھوں نے اپنی زور آزمائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا' اسی قدر اسلام کے کمالات اپنی شان و شوکت دوبالا کرتے گئے۔ دورِ حاضر میں جہاں صدہا مشینیں اور ملیں اور طرح طرح کی عجیب و غریب چیزیں ایجاد ہو رہی ہیں' مذہب سازی کی صنعت بھی اپنے اوج کمال پر پہنچ گئی ہے اور آئے دن نئے نئے مذہب ایجاد ہوتے رہتے ہیں۔ انھیں میں ایک "دیانندی" مذہب بھی ہے (جو اپنے آپ کو آریہ کہلاتا ہے) جو تھوڑے زمانہ سے پیدا ہوا ہے' اس نے مذہبی دنیا میں ہلچل مچا رکھی ہے اور اپنے دل آزار طرزِ عمل سے دنیا کو جگر خراش صدمے پہنچاتی ہیں۔ سخت کلامی اور بدزبانی تو گویا

انہوں نے جزو مذہب قرار دے لی ہے کہ ان کے مذہب کی مستند کتاب پنڈت دیانند کی تصنیف "ستیارتھ پرکاش" دریدہ دہنی اور بد زبانی بلکہ سب و شتم کا ذخیرہ ہے۔ اس کتاب کا چودھواں باب قرآن پاک پر اعتراض کرنے کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے اور اس میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ قرآن پاک کی ایک ایک سورہ کی علیحدہ علیحدہ سرخی قائم کر کے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں اور مسلمانوں کے دلوں کو صدمے پہنچائے ہیں۔ ان اعتراضات کی جو حقیقت ہے اور پنڈت کے علم و لیاقت کا جو مبلغ ہے، وہ ان کے اعتراضات سے آپ کو معلوم ہو گا اور اسی سے اس کی شرافت کا پتا چل سکے گا۔ میں اس کی عبارت بجنسہ نقل کر کے جواب لکھتا ہوں۔ واللہ الموفق والمعین۔

○ ○ ○

اعتراض بر بسم اللہ الرحمن الرحیم

"شروع ساتھ نام اللہ بخشش کرنے کرنے والے مہربان کے" (منزل اول سپارہ اول سورہ فاتحہ آیت اول، محقق) مسلمان لوگ ایسا کہتے ہیں کہ یہ قرآن خدا کا کلام ہے لیکن اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بنانے والا کوئی دوسرا ہے کیونکہ اگر خدا کا بنایا ہوتا تو شروع ساتھ نام اللہ کے ایسا نہ کہتا بلکہ شروع واسطے ہدایت انسانوں کے، ایسا کہتا۔ (ستیارتھ پرکاش ص ۶۵۹ باب ۱۴)

جواب: کسی چیز پر اعتراض کرنے کے لیے پہلے اس کی واقفیت حاصل کرنا چاہیے لیکن معترض قرآن پاک سے محض نابلد ہے حتیٰ کہ اس کو یہ بھی خبر نہیں کہ قرآن پاک خود اپنی نسبت کلام الٰہی ہونے کی شہادتیں دے رہا ہے اور ایسی زبردست براہین پیش فرما رہا ہے جن کے جواب سے زمانہ ہمیشہ سے عاجز ہے اور ہمیشہ عاجز رہے گا۔ ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداء کم من دون اللہ ان کنتم صادقین۔ یہ وہ تحدی تھی جو معارضہ

تھا جس کی ہیبت نے ہاتھوں سے قلم چھڑا دیئے، بولنے والی زبانیں ساکت بلکہ گنگ ہوگئیں، قلم کی جگہ تلوار ہاتھ میں لینا پڑی اور ایک آیت کا نظیر پیش کرنے کی بجائے دشمنانِ اسلام خونوں کی ندیاں بہانے کے لیے تیار ہوگئے۔ بلغاء عرب کی ہمتیں پست ہوگئیں اور انہوں نے عملی طور پر اپنے عجز کا اعتراف کرلیا۔ قرآن پاک نے کچھ ایک ہی جگہ نہیں جابجا اپنے کلام الٰہی ہونے کا اعلان کیا ہے، لیکن پنڈت جی ابھی بے خبر ہیں اور یہی سمجھتے ہیں کہ مسلمان لوگ ایسا کہتے ہیں اور اس پر غرور یہ کہ اپنے آپ کو محقق لکھتے ہیں۔ اپنے منہ سے اپنی غلط تعریف، کیا کسی ذی علم کا کام ہوسکتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ پنڈت جی نے کون سے ایسے تحقیق کے دریا بہائے ہیں جس سے وہ محقق کے خطاب کے مستحق ہوسکیں اور یہ خود ساختہ خطاب ان کے لیے موزوں ہوسکے۔ جس بات کا قرآن پاک بصراحت مدعی اور دھوم دنیا میں مچ گئی، پنڈت صاحب کو اس کی تو خبر نہیں مگر ہیں محقق، عجب تحقیق ہے اس کے بعد پنڈت جی نے لکھا ہے کہ اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کلام کا بنانے والا کوئی دوسرا ہے۔ یہ ہے آپ کے محقق ہونے کی حقیقت اور قابلیت کا نمونہ جس کی سخن فہمی اس درجہ پہنچ گئی ہو، وہ ضرور محقق کے خطاب کے شایاں ہے۔ آیت میں کونسا لفظ ہے اور بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ کا کونسا حرف ہے جس کا مدلول یا مفہوم یہ ہو کہ اس کتاب کا بنانے والا خداوند عالم کے سوا کوئی دوسرا ہے؟ خود پنڈت جی نے جو ترجمہ کیا ہے اس کے کون سے لفظ میں اشارہ ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہونے کا کس طرح منافی ہوسکتا ہے؟ کیا کوئی دیانندی اس کے ثابت کرنے کی ہمت رکھتا ہے؟ اگر ناممکن کسی طرح ممکن ہو، تو کوئی آریہ بھی اس کا جواب دے سکے گا۔ کیا بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ میں اللہ کا نام آنا اس بات کی دلیل ہوسکتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں؟ ہر شخص اپنے رسالہ یا کتاب میں، اپنے خط و تحریر میں اول یا آخر اپنا نام لکھ دیتا ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ یہ کتاب یا خط اس شخص کا لکھا ہوا نہیں ہے اگر نام مذکور ہونے سے کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے تو بجز اس کے اور کیا کہا جائے گا کہ اس کا دماغ ماؤف ہوگیا ہے۔ خود پنڈت نے اپنی اسی ستیارتھ میں اپنا نام لکھا ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہوسکتے ہیں کہ یہ کتاب اس کی تصنیف نہیں؟ جو کتاب قلوب پر

عظمت الٰہی کے سکے بٹھانے اور جمانے کے لیے آئے، کیسے ممکن ہے کہ اس کا آغاز اللہ کے نام سے نہ ہو؟ پھر ایک ایک مضمون کی سرخی اور ہر ایک بحث کے عنوان میں ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جن سے مضمون کی جھلک معلوم ہو اور مدعا کا نشان ملے، تو جس کتاب کا مقصود ذات و صفات حق سے باخبر کرنا ہو، اس کی ابتدا میں نام خدا سے نہ ہونا جائے تعجب ہے، نہ کہ خدا کے نام سے شروع کرنے پر اعتراض کیا جائے۔ ہر شخص جو خداوند عالم کے کارساز حقیقی ہونے پر یقین رکھتا ہے اور اس کو قادر مطلق سمجھتا ہے، اپنے ہر کام میں اس کی کارسازی اور قدرتِ کاملہ پر نظر رکھنا اور اسی کے نام سے شروع کرنا اس کے لیے ضروری ہے، تاکہ وہ اپنے ہر کام میں اپنا عجز اور اس کی آثار قدرت کا مشاہدہ کر سکے اور کسی وقت اس سے غافل نہ ہو، یہ قرآن پاک کا سب سے پہلا سبق ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان اپنے کام میں رہ کر بھی اپنے رب کو فراموش نہ کرے اور اس کی عقیدت و نیاز کے روابط منقطع نہ ہونے پائیں۔ پنڈت جی کی نظر "وید" کی طرف گئی۔ انھوں نے جب یہ خیال کیا ہوگا کہ وید کے کلام الٰہی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے مگر یہی سخت اعتراض اور شدید الزام سے بچنے کی یہی صورت پنڈت جی کے خیال میں آئی کہ قرآن پاک کے حسن و کمال ہی کو عیب قرار دیجیے۔

چشم عداوت بزرگ تر عیبے ست
گل ست سعدی و در چشم دشمناں خار ست

کسی خوبی کو عیب قرار دینا اور کمال کو مورد الزام بنانا کسی شائستہ اور نیک مزاج آدمی کا فعل نہیں ہو سکتا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ وید کا خدا کے نام سے شروع ہونا تو درکنار تمام وید میں کہیں کسی جگہ خدا کا نام (اسم ذات) تک نہیں ہے۔[1] ایسی حالت میں

[1] تنہا وید ہی نہیں بلکہ سنسکرت زبان ہی خدا کے نام سے محروم ہے۔ پنڈت دیانند سرسوتی "ستیارتھ پرکاش" میں لکھتے ہیں: "سب وید وغیرہ شاستروں میں پرمیشور کا افضل اور ذاتی نام "اوم" کہا گیا ہے اور سب نام صفاتی ہیں۔" (ستیارتھ پرکاش باب اص ۲) اس سے معلوم ہوا کہ اوم کے سوا کوئی نام پرمیشور کا ذاتی (اسم ذات) نہیں رہا۔ "اوم" بھی وہ بھی صفاتی ہے، اسم ذات وہ بھی نہیں۔ ستیارتھ پرکاش کے اسی صفحہ میں پنڈت صاحب نے تصریح فرمائی ہے کہ

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کسی کتاب کا اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ شروع ہونا ویدوں کی تعلیم کے عادی شخص کے لیے ضرور تعجب خیز ہونا چاہیے۔ جس شخص نے عمر بھر میں کبھی خدا کا نام (اسم ذات) ہی نہیں سنا، وہ اگر بسم اللہ سن کر چونک اٹھے تو کچھ بعید نہیں، لیکن جو قلوب خدا شناسی کا ذوق رکھتے ہیں ان کے جذبات صادقہ کا یہی مقتضاء ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ہر کام کو نام خدا سے شروع کریں۔

شاہی فرمان میں مضمون سے قبل بادشاہ کے نام کا طغراء ہوتا ہے تو جو کتاب فرمانِ الٰہی ہو، اس میں سب سے پہلے نام خدا ہونا چاہیے۔ پنڈت صاحب کی الٹی منطق یہ کہتی

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

"پرمیشور کا کوئی بھی نام بے معنی نہیں ہے۔" (ستیارتھ ص ۳) اور اسی صفحہ میں ہے: حفاظت کرنے کے باعث "اوم" بہ معنی "حافظ" ہے۔

تو اب ثابت ہو گیا کہ "اوم" بھی اسم صفت ہے، اسم ذات کوئی نہیں۔ اس کا ذکر اگر کہیں آ گیا ہے تو استعاروں اور صفتوں سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کی ذات کے لیے ایک لفظ تک خرچ نہیں کیا گیا؟ کس قدر تنگ اور بخیل زبان ہے جس میں خدا کی ذات کے لیے ایک لفظ بھی نہیں۔ کیا یہی زبان الہام کی زبان اور ایسی ہی کتاب ہو سکتی ہے؟ جس میں خدا کا نام تک نہ ہو؟ جن ملکوں میں کسی چیز کا رواج نہیں ہوتا وہاں کی زبانوں میں اس چیز کا کوئی نام بھی نہیں ہوتا، پھر ضرورت کے وقت استعاروں اور مجاز سے کام لیا جاتا ہے یا صفات سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

جیسے اطباء مرکبات کو صفات کے ساتھ پکارتے ہیں: ہاضم، مقوی، مسہل، مصفی خون وغیرہ، اگر ان مرکبات کے ذاتی نام ہوتے تو صفات کا ذکر ان کے مواقع پر کیا جاتا مگر نام لینے سے مجبوری نہ ہوتی۔ سنسکرت زبان میں زمین، آسمان، گائے، بیل وغیرہ تمام کار آمد چیزوں کے لیے نام ہیں جن کا مدلول ان اشیاء کی ذات ہے مگر خدا کی ذات پاک کے لیے کوئی نام نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان والوں کو خدا کی ہستی کی اور وجود کی کچھ خبر نہ تھی اور غافلانہ زندگی بسر کرتے تھے، حتیٰ کہ ان کی زبان میں اللہ کی ذات پاک کے لیے کوئی لفظ بھی وضع نہ ہوا تھا۔ جب دوسری قوموں سے اختلاط ہوا اور خدا کی ہستی کا کچھ پتا چلا تو اس کو صفات کے ساتھ تعبیر کرنے پر مجبور ہوئے جو لوگ اس قدر پستی میں ہوں کہ ان کی کتاب اور زبان میں خدا کا نام نہ ہو وہ اگر قرآن پاک میں اول ہی بسم اللہ الرحمن الرحیم دیکھ کر بھڑک اٹھیں تو کیا بعید ہے۔ منہ ۱۲۔

ہے کہ اوّل نہیں بادشاہ کا نام ہونے سے وہ فرمان شاہی فرمان ہی نہیں رہ سکتا۔ خدا کا نام ابتدا میں ہونے سے قرآن شریف کے کلام الٰہی ہونے میں پنڈت صاحب کو تردد ہو گیا۔ یہ عقل و حواس ہیں جس پر "محقق" ہونے کا دعویٰ ہے۔ تعجب تو ان عقلمندوں پر ہے جو ایسے لچر اعتراضات پر ناز کرتے ہیں اور معترض کے غلام بنے بیٹھے ہیں۔

برادران نوع آپ اپنی عقل و انصاف سے کام لیجئے اور عدل کی میزان میں پنڈت صاحب کے اقوال کو تولیے جب آپ دیکھ لیں کہ اس میں واقفیت کا شائبہ بھی نہیں ہے تو اپنی کار آمد ہستی کھوٹے داموں فروخت نہ کیجئے۔ کسی کتاب کی عالمگیر عظمت و جلالت اور شہرہ آفاق کمالات پر پردہ ڈالنے کی غرض سے لغو اعتراضات کرنا اس کی خوبیوں کو بتانا، روز روشن کو شب تاریک کہنا اور جوش تعصب کو اس مذموم طریقہ سے ادا کرنا در حقیقت دنیا کے سامنے اپنے قلب کی سیاہی نمودار کرنا ہے۔ اہل خرد کی نگاہ میں ایسے معترض کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ افسوس پنڈت صاحب نے قرآن پاک کے کمال کو محض تعصب کے جوش میں عیب قرار دیا، اگر نفسانیت کی پٹی ان کی آنکھوں پر نہ بندھی ہوتی تو وہ قرآن پاک کی نعمتوں سے بہرہ مند (مسلمان) ہوتے اور اس کی روحانی اور الٰہی تعلیم سے فائدہ اٹھاتے اور جس قدر شہرت و رواج پنڈت جی کو حاصل ہوا، وہ بھی انہی چند باتوں کا نتیجہ ہے جو وہ قرآنی اور اسلامی تعلیم سے لے اڑے تھے۔

○ ○ ○

اعتراض: اگر انسان کو نصیحت کرتا ہے تم بھی ایسا کہو تو بھی درست نہیں کیونکہ اس سے گناہ کا شروع بھی خدا کے نام سے ہونا صادق آئے گا اور اس کا نام بھی بدنام ہو جائے گا۔

جواب: پنڈت صاحب کو خیال آیا یا کسی مسلمان کی زبان سے انہوں نے سنا ہو کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" بندوں کو تعلیم ہے کہ تلاوت قرآن پاک کی ابتدا اس طرح نام خدا سے کیا کریں، کیونکہ سب سے اول جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے

"اقرء باسم ربک الذی خلق۔" اس کا پہلا لفظ قرأت کا امر ہے یعنی پڑھئے تو اس کے بعد جو کچھ بھی وہ تعلیم ہے جس طرح کچہری میں حلف دینے والا کہتا ہے "کہو میں سچ کہوں گا" اس سے کوئی نادان بھی یہ نہیں سمجھتا کہ حلف دینے والا یہ حلف کر رہا ہے بلکہ اس کا کام فقط سکھانا ہے۔ (قرآن پاک میں پہلا لفظ جو نازل ہوا وہ اقرء ہے جس کے معنی تھے، پڑھئے۔ تو اب آئندہ جو کچھ ہے وہ تعلیم ہے)۔

پنڈت جی نے جب یہ دیکھا کہ اب کوئی جائے اعتراض نہیں تو اپنے دل کا غبار اس طرح نکالا کہ "اگر انسان کو نصیحت کرتا ہے تو بھی درست نہیں کیونکہ اس سے گناہ کا شروع بھی خدا کے نام سے صادق آئے گا۔" پنڈت کا یہ باطل دعویٰ کہ گناہ کا شروع بھی خدا کے نام سے صادق آئے گا کسی دلیل سے ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا بطلان بدیہی ہے۔ کتاب ہدایت کا شروع نام خدا سے کیا جاتا ہے، اس میں گناہ کا کیا ذکر مگر پنڈت کو تو کسی نہ کسی طرح اعتراض کرنا اور الزام لگانا تھا اس لیے ایسی بے اصل اور غلط بات کہی۔ مسلمانوں کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ ناجائز کام پر بسم اللہ پڑھنا ممنوع ہے، اسی کو مسلمانوں کے سر منڈھنا ایک جھوٹ بات لکھ کر دنیا کو غلطی میں ڈالنے کی کوشش کرنا نہایت شرمناک جرم ہے۔

پنڈت جی کو واضح رہنا چاہیے کہ قرآن پاک گناہ کو منع کرتا ہے اور بندوں کو گناہوں سے بچانا چاہتا ہے تو ضرور جس کام کے شروع کی وہ اجازت دے گا وہ ہرگز گناہ نہ ہوگا پھر نام خدا سے کس طرح ممکن ہو سکتا ہے جو کتاب گناہ مٹانے آئی ہے اس کی تعلیم کا آغاز نام خدا سے ہو، صاف بتاتی ہے کہ امور خیر کا آغاز ہو۔ پنڈت جی کی نظر میں وہ کتابیں ہوں گی جن میں گناہوں کی تعلیم ہو، ممکن ہے انہیں پر قیاس کر کے پنڈت صاحب نے یہ اعتراض جمایا ہو لیکن قرآن پاک کی نسبت یہ اعتراض سراپا لغو اور باطل ہے۔ قرآن پاک کی حکمتوں سے پنڈت جی کو کیا مس ہے اور ان کا دماغ وہاں تک کب پہنچتا ہے؟ لیکن اہل عقل سمجھ سکتے ہیں کہ بندوں کو ہر کام میں بسم اللہ کے ساتھ آغاز کرنے کی عادت ڈالنا گناہوں کے دروازہ کا بند کر دینا ہے۔ اس لیے جب بندہ کسی کام کو شروع کرتے وقت اپنے پروردگار کا نام لے گا اور اس کی عظمت و جلال کا پرتو اس کے

قلب پر پڑے گا تو خوفِ الٰہی اس پر غالب ہوگا اور وہ گناہ کی جرأت نہ کرے گا۔ ایک نکتہ میں گناہوں کا انسداد فرما دیا۔

کتاب برحق کی اس نفیس تعلیم پر قربان ہونا چاہیے کہ کتنے بڑے سیلاب کو روکنے کے لیے کیسی آسان تدبیر تعلیم فرمائی۔ لیکن جو دماغ گناہوں میں محو ہیں اور وہ عظمت و جلال خداوندی کو بھول کر گناہ کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔

پنڈت صاحب نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے لفظ لفظ پر اعتراض کرنے کی کوشش کی، چنانچہ وہ الرحمٰن الرحیم پر یہ اعتراض کرتے ہیں۔

○ ○ ○

اعتراض: اگر وہ بخشش و رحم کرنے والا ہے تو اس نے اپنی مخلوق میں انسانوں کے آرام کے واسطے دوسرے جانداروں کو مار، سخت ایذا دینا اور ذبح کروا کر گوشت کھانے کی اجازت کیوں دی؟ کیا وے (وہ) ذی رُوح بے گناہ اور خدا کے بنائے ہوئے نہیں ہیں؟

جواب: ایسے اعتراض پنڈت صاحب کی علم و لیاقت کا نمونہ ہیں۔ اس اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ اپنے بنائے ہوئے اور ذی روح کو ذبح کرنے اور ایذاء دینے کی اجازت دینا رحم کے خلاف ہے۔ یہ اعتراض اس قابلیت سے کیا گیا ہے کہ اس کی زد خود پنڈت جی پر پڑتی ہے کیونکہ اگر ایذاء دینے کی اجازت دینا رحم کے خلاف ہے تو جانوروں سے خدمتیں لینا اور ان کی آزادی کو آسائش کے لیے برباد کرنا، ہل جتوانا، بوجھ لادنا، سواری لینا، سردی اور بارش کے وقت میں دق کرنا، منزلوں لیے پھرنا۔ تھک جائیں تو مار مار کر لہولہان کرنا، ان کے بچے کا حق دودھ ان سے چھین لینا، ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے بچوں کی گردنوں میں رسیاں ڈال کر ان سے علیحدہ کرنا، ان کی قدرتی غذا چھیننے کے لیے انھیں ترسانا، ادھر بچہ چلاتا ہے ادھر ماں بے قرار ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھنا اور ذرا پرواہ نہ کرنا، ان سب باتوں کی اجازت آپ کے پرمیشور نے دی ہے؟ تو

بقول آپ کے وہ رحم والا نہیں۔ اگر نہیں دی ہے تو آپ کے یہ سب افعال ناجائز ہیں۔ دودھ، دہی، گھی سب آپ کے قاعدہ پر حرام، سواری، زراعت بار برداری میں ان سے کام لینا سب ناجائز لیکن کیا پنڈت جی نے یا ان کے کسی اور ہم خیال نے کسی رشی منی نے کبھی ان ناجائز مظالم کے ترک کا عملی ثبوت دیا ہے؟ اور ان کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کی کوشش کی ہے؟ لیکن عمل پنڈت صاحب کی تکذیب کرتا ہے۔ آپ کا گھی، دودھ استعمال کرنا جانوروں سے سواری، بار برداری کی خدمتیں لینا ثابت کرتا ہے کہ آپ اپنے ایشور کو رحم والا نہیں مانتے۔

پرندوں میں شکرہ، باز، شاہین وغیرہ کچھ تو ایسے ہیں کہ ان کے پاس آلات شکار موجود ہیں اور کچھ کبوتر کی طرح ایسے بے بس اور کمزور ہیں کہ وہ اپنی حفاظت کا بھی کوئی سامان اپنے پاس نہیں رکھتے۔ اور اسی طرح چوپایوں میں شیر کے پاس تو شکار کرنے کے آلات ہیں لیکن دوسرے جانوروں کے پاس اپنی حفاظت کے لیے بھی کوئی چیز نہیں۔ یہ سب خدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں یا کسی اور کے؟ گوشت خور جانوروں کی غذا اس نے مقرر کی نیچیا کسی دوسرے نے؟ آلات صید اس نے عنایت فرمائے یا کسی اور نے، قتل و شکار پر ان کی غذا اور زندگی کا مدار اس نے مقرر فرمایا یا نہیں؟ اب پنڈت صاحب یہ بتائیں یہ رحم کے خلاف ہے اور ان کا ایشور رحم کا دشمن ہے یا اس کو رحم کے خلاف کہنا ہی نادانی اور بے ادبی ہے۔

اس اعتراض کے ضمن میں پنڈت جی کے قلم سے ایک لفظ "بے گناہ" کا بھی نکل گیا ہے جو پنڈت صاحب شوق اعتراض میں لکھ گئے ہیں لیکن انہیں خبر نہیں کہ اس لفظ نے ان کے مذہب کا ہی خاتمہ کر دیا۔ اصول تناسخ کی بنیاد پر تو کوئی جانور بے گناہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جانور کو جون ہی اس کو کسی نہ کسی گناہ کی پاداش میں ملتی ہے۔ علاوہ بریں بے گناہ کو ایذاء پہنچنا یہ بھی اصول تناسخ کے خلاف ہے جو کوئی تکلیف کسی کو پہنچتی ہے باقاعدہ تناسخ ضرور کسی خطاء قصور کا بدلہ ہوتی ہے اب تو پنڈت صاحب کو اعتراض نہ کرنا چاہیے جو کوئی جانور ذبح ہوتا ہے وہ ضرور کسی نہ کسی گناہ کی پاداش میں ذبح ہوتا ہے اور اس کے لیے ذبح ہونا باقاعدہ تناسخ ضروری ہے۔

البتہ اگر دنیا کی قومیں گوشت خوری چھوڑ دیں اور ذبح کا دستور جہاں سے ناپید ہو جائے تو پھر پنڈت جی کا ایشور اس طریقہ کی سزا کسی کو نہ دے سکے گا جو باقاعدہ تناسخ اس پر لازمی اور ضروری تھی۔ ایشور کی وہ مجبوری قابل رحم ہو گی۔ ہندوستان کے مسلمان اس وقت گائے کا ذبیحہ ترک کرنے کی فکر میں ہیں۔ آریوں کو بہت جلد اعلان کر دینا چاہیے کہ مسلمان ایسا ہرگز نہ کریں، ورنہ ایشور کو ناگفتہ بہ مصیبت کا سامنا ہو گا اور اس کا قانونِ سزا نکما ہو کر رہ جائے گا۔ جرائم پیشہ جیو کی چڑ بن جائے گی اور وید کے ایشور کو بہ مجبوری معطل ہو جانا پڑے گا۔ پنڈت جی نے یہ جو لکھا ہے کہ کیا وے (وہ) خدا کے بنائے ہوئے نہیں اس سے پنڈت جی کا یہ مدعا ہے کہ اپنے بنائے ہوئے کے ساتھ ضرور بنانے والے کو ایسا محبت کا تعلق ہو جاتا ہے کہ وہ اس کا ذبح ہونا گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے اگر وہ ذبح کی اجازت دے تو یہ رحم کے خلاف ہے۔

میں دریافت کرتا ہوں کہ اپنے بنائے ہوئے کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے وہ اس بات کو تو گوارا نہیں کرتی کہ اس کے ذبح کی اجازت دی جائے لیکن یہ گوارا کرتی ہے کہ اپنے آپ کو اس پر فنا کر دیا جائے، جس کے لیے یہ بھی گوارا نہیں کہ دوسرا ایذاء اس کی جان لینے کے لیے خود آمادہ ہو جانا تو اعلیٰ درجہ کی بے رحمی اور پرلے سرے کا ظلم عظیم ہو گا تو کیا پنڈت صاحب کے نزدیک موت خدا کے اختیار سے باہر ہے۔ خدا کے اختیار سے باہر کوئی چیز ہے کہ بغیر اس کے قصد و ارادہ کے واقع ہو جاتی ہے؟ یا کوئی دوسرا فنا کر دیتا ہے؟ اور ایشور اپنی بنائی ہوئی مخلوق کی موت کے صدمے اٹھایا کرتا ہے۔ ایسا مجبور اگر ہے تو اس کو پرمیشور کہنا اور کارساز عالم اور سرو شکتیمان و قادر مطلق اعتقاد کرنا بالکل باطل و غلط ہے۔

یہ وہ اشکال ہے جس کا پنڈت صاحب کے پاس جواب نہیں۔ اعتراض کے شوق میں ایسی ایسی لغو و باطل باتیں کہنا پنڈت صاحب کی قابلیت کا نتیجہ ہے اور اس پر اپنے آپ کو محقق ہونے کا دعویٰ بھی ہے۔ تعصب کا جوش جو پنڈت صاحب کے سینہ میں بھرا ہوا تھا اس نے مجبور کیا کہ پنڈت صاحب قرآن شریف پر اعتراض کرنے کے لیے باطل و غلط اور لغو و رکیک باتیں لکھ کر شیخی مارنے پر تل گئے اور قرآن پاک کی روشن

تعلیم سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ چشم بینا اور نظر انصاف ہو تو انسان قرآن پاک دیکھنے کے بعد اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور اپنی درستی و اصلاح کے علاج اس میں تلاش کر کے سعادت دارین کے منازل تک پہنچتا ہے لیکن نظر عداوت خوبیوں کے دیکھنے سے مجبور ہے' اس کو ہر کمال عیب ہی معلوم ہوتا ہے۔ اللھم ارنا الحق حقا والباطل باطلا۔

○ ○ ○

اعتراضات متعلق سورہ فاتحہ

اعتراض: اگر قرآن کا خدا دنیا کا پروردگار ہوتا اور سب پر بخشش اور رحم کیا کرتا' تو دوسرے مذہب والوں اور حیوانات وغیرہ کو بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے قتل کرانے کا حکم نہ دیتا' اگر معاف کرنے والا ہے تو کیا گناہ گاروں پر بھی رحم کرے گا اور اگر کرے گا تو آگے ذکر آئے گا کہ کافروں کو قتل کرنا یعنی جو قرآن اور پیغمبر کو نہ مانے' وے (وہ) کافر ہیں' ایسا کیوں کہتا؟ اس لیے قرآن خدا کا کلام ثابت نہیں ہوتا۔

جواب: ایسے رکیک اور لایعنی اعتراض پیش کرتے ہوئے پنڈت صاحب کو عار نہیں آتی جس سے ان کی غایت نافہمی اور انتہا درجہ کی نادانی کا پتا چلتا ہے' انہیں یہ بھی خبر نہیں کہ ماں باپ کا رحم دنیا میں کون نہیں جانتا لیکن اولاد کی خطاؤں پر والدین کا سزا دینا کیا کسی نے بے رحمی سمجھا ہے؟ پنڈت صاحب کی فہم اتنا سمجھنے سے بھی قاصر ہے' ان کے خیال میں گناہ گار کو سزا دینا تقاضائے رحم کے خلاف ہے اور اس سے مدت العمر کے احسانات جو ایک ایک آن میں بے حد و پایاں شامل حال رہے ہیں' سب جاتے رہتے ہیں کہ قصور کی سزا دینے سے وہ رحیم نہیں رہتا۔ کیا پنڈت صاحب کے نزدیک سزا دینے والے والدین اور مارنے والا استاد بچوں کا دشمن اور بے رحم ہوتا ہے؟ یہ عقل اور قرآن پاک پر اعتراض؟

گر در روغ گو را حافظہ نباشد

پنڈت صاحب کو خود اپنی تحریر یاد نہیں ہے۔ ستیارتھ پرکاش ص ۳۵۳ میں لکھتے ہیں: "یہ کام اراکین سلطنت کا ہے کہ جو جانور یا آدمی ایذا رساں ہوں' ان کو سزا دیں اور جان سے بھی مار ڈالیں۔"

یہ رحم کی تعلیم ہو رہی ہے یا بے رحمی کی؟ یہی پنڈت دیانند صاحب ستیارتھ پرکاش ص ۲۲۰ پر لکھتے ہیں: "اعضائے تناسل' پیٹ' زبان' ہاتھ' پاؤں' آنکھ' ناک' کان دولت و جان یہ دس موقع سزا کے ہیں کہ جن پر سزا دی جاتی ہے۔"

ص ۲۲۲ پر لکھتے ہیں: "چور جس طریق پر جس جس عضو سے انسانوں میں نامناسب حرکات کام کرتا ہے' اس عضو کو سب کی عبرت کے لیے راجہ کاٹ دیوے۔"

کیسے یہ رحم کی تعلیم ہے یا بے رحمی کی؟ ص ۲۲۳ پر لکھتے ہیں: "خواہ گرو ہو خواہ بیٹا وغیرہ' اولاد ہوں خواہ باپ وغیرہ' بزرگ ہوں خواہ برہمن' خواہ شاستر وغیرہ کا سننے والا کیوں نہ ہو' جو دھرم کو چھوڑ کر ادھرم میں پھنسا ہوا دوسرے کو بلا جرم مار ڈالنے والے ہیں' ان کو بغیر تامل کے مار ڈالنا چاہیے یعنی پہلے مار کر بعد میں سوچ کرنی چاہیے۔"

کیا عجیب فلسفہ ہے سزا کا حکم تو پہلے دے دیا جائے مگر مقدمہ کی تحقیقات' شہادتوں کی سماعت اور واقعات میں غور و فکر بعد کو کیا کریں۔ پنڈت جی کی یہ دماغی قابلیت اپنا جواب نہیں رکھتی جاہے کہ کسی افیونی کا لوٹا ٹوٹ گیا تھا' تو اس خیال سے کہ پانی نہ نکل جائے وہ حاجت انسانی سے افراغ کے قبل ہی آبدست لے لیا کرتا تھا۔

پنڈت جی کے فلسفہ کی رو سے ان کا اصول بالکل ٹھیک تھا جہاں تجویز سزا کے بعد واقعات پر غور کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تعجب تو ان عقل کے پتلوں پر ہے جو باوصف اس ذکاء و فہم کے پنڈت صاحب کے گرویدہ بنے ہوئے ہیں۔ خیر مجھے تو یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ پنڈت جی جرم کی سزا کو رحم کے خلاف بتاتے تھے۔ انہوں نے سزا قبل فیصلہ تک کا حکم دے دیا اور کیسی کیسی سخت اور مہذب سزائیں تجویز کیں۔

صفحہ ۲۲۴ میں لکھتے ہیں: "جو عورت اپنے حسب و نسب کے گھمنڈ سے شوہر کو چھوڑ کر زنا کرے' اس کو جیتے جی بہت عورتوں اور مردوں کے سامنے کتوں سے کٹوا کر مروا ڈالے۔"

کیا معقول سزا ہے اور کس قدر رحم کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ذرا گریبان میں منہ ڈالیے، پھر اسی صفحہ میں لکھتے ہیں: "اسی طرح اپنی عورت کو چھوڑ کر دوسرے کی عورت خواہ رنڈی سے زنا کرے تو لوہے کے پلنگ کو آگ میں تپا کے اور سرخ کر کے اس پر گناہ گار مرد کو سلا کر بہت سے آدمیوں کے سامنے جلا دیوے۔"

کیوں پنڈت صاحب! آپ کے مذہب نے جو یہ سزائیں بتائی ہیں، آپ ان کو رحم سمجھتے ہیں یا بے رحمی؟ آپ نے کس منہ سے قرآن پاک پر اعتراض کر دیا؟ کون عقلمند ہے جو سزائے جرم کو رحم کے خلاف سمجھتا ہے؟ ذبح حیوانات کا مسئلہ تو میں آپ کو سمجھا ہی چکا ہوں، باقی رہا قتل کفار، اس پر آپ کیا اعتراض کر سکتے ہیں۔ جیسا زنا کا جرم آپ کے نزدیک اس برے طریقہ سے قتل کا مستحق ہے تو خداوند عالم کی ذات و صفات، کتاب و رسل کا منکر اور رب العالمین کی تکذیب کرنے والا کیسی شدید اور سخت ترین سزا کا مستوجب ہوگا، یہ تو اپنے اصول سے آپ کو تسلیم کر لینا پڑے گا کہ کافر کو سخت سے سخت سزا دینا چاہیے۔ اگر آپ خداشناسی کی کچھ بھی قدر جانتے ہیں، تو یہ اعتراض آپ کے قلم سے نہ نکل سکتا۔

قرآن پاک اور پیغمبر اسلام علیہ السلام چونکہ حق تعالیٰ کی معرفت کرا کے نفوس انسانیہ کو رذائل سے پاک کرنے اور علوم حقیقیہ اور معارف کی تعلیم فرماتے ہیں اور بندوں کو خدا کی طرف متوجہ کرتے ہیں، اس لیے ان سے اعراض و انحراف بے شک کفر اور سب سے بڑا سنگین جرم ہے۔

اب آپ اپنے اعتراض کو یاد کیجئے کہ "اگر قرآن کا خدا دنیا کا پروردگار ہوتا اور سب پر بخشش اور رحم کیا کرتا تو دوسرے مذہب والوں اور حیوانات وغیرہ کو بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل کرانے کا حکم نہ دیتا۔" یہ اعتراض آپ ہی پر لوٹ پڑا۔ اپنے قوانین سزا پر نظر ڈالیے اور پھانسی کو اپنی گردن سے نکالنے کی کوشش کیجئے۔ کیا آپ اپنے خیال میں ایشور کو پروردگار نہیں مانتے؟ اور مانتے ہیں تو یہ قتل و خونخواری کے قوانین جو آپ کے اصول پر اس کی پروردگاری کو نیست و نابود کیے ڈالتے ہیں، اس سے کیسے صادر ہوئے اور اگر یہ اس کے احکام نہیں ہیں اور آپ نے اپنی طرف سے لکھ

دیئے ہیں تو کیا آپ کا مذہب آپ کی اپنی من گھڑت کا نام ہے؟

پاؤں صنم کا الجھا ہے زلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

○ ○ ○

اعتراض: خداوند ون انصاف کا تجھ ہی کی عبادت کرتے ہیں ہم اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں ہم، دکھا ہم کو راہ سیدھا۔ (منزل اول سپارہ اول سورۃ فاتحہ آیت ۴، ۵) (محقق) کیا خدا ہمیشہ انصاف نہیں کرتا؟ کسی خاص دن انصاف کرتا ہے۔ یہ تو اندھیر کی بات ہے۔ اسی کی عبادت کرنا اور اس سے مدد چاہنا تو ٹھیک ہے، کیا بری بات میں بھی مدد کا چاہنا درست ہے اور سیدھا راستہ صرف مسلمانوں ہی کا ہے یا دوسروں کا بھی؟ سیدھے راستہ کو مسلمان کیوں نہیں قبول کرتے؟ کیا راستہ برائی کی طرف کا تو نہیں چاہتے؟ اگر اچھی باتیں سب کی یکساں ہیں تو پھر مسلمانوں میں خصوصیت کچھ نہ رہی اور اگر دوسروں کی اچھی باتیں نہیں مانتے تو متعصب ہیں۔

جواب: پنڈت صاحب کے اعتراضات کا مادہ افسوس ہے کہ تماسوء فکر اور خالص ناسمجھی رفع کی جا سکتی ہے لیکن عناد ایک ناقابل علاج امراض میں سے ایک سخت بیماری ہے۔ اس ظلم کی کیا انتہا ہے کہ جس بات کا قرآن پاک میں نشان نہیں، رمق اور بو بھی نہیں اس کو قرآن پاک کی طرف بے دھڑک منسوب کیا جاتا ہے۔ جس معترض کا سرمایہ اعتراض، افتراء و بہتان ہو، بجز ذلت و رسوائی کے اور کیا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

قرآن پاک میں کہیں نہیں ہے کہ خدا ہمیشہ انصاف نہیں کرتا کسی خاص دن انصاف کرتا ہے، پھر اس کو قرآن شریف کی طرف منسوب کر کے اعتراض جمانا اور جھوٹ بول کر اس مقدس کتاب کو بدنام کرنے کی کوشش کرنا کس درجہ کی کمینہ حرکت ہے؟ ایسے لچر اور لغو اعتراض جو قرآن پاک سے چھو بھی نہیں گئے اور اس پاک کتاب کے کسی ایک لفظ سے ان کا تعلق نہیں، پنڈت صاحب کی عرق ریزی کا نتیجہ ہیں۔ حقانیت قرآن کی

ظاہر اور روشن دلیل ہے کہ دشمن معاند جوش عداوت میں اعتراض کرنے بیٹھتا ہے، اس کو قرآن پاک میں جائے حرف زدن نہیں ملتی، مجبور ہو کر افتراء کرتا ہے اور اپنے دل کے پھپھولے توڑتا ہے۔

پنڈت صاحب کا ترجمہ بھی غلط ہے اور اس غلط ترجمہ کی بنیاد پر بھی اعتراض صحیح نہیں کیونکہ "انصاف کا دن" مرکب اضافی ہے جہاں اضافت تخصیص کے لیے ہوتی ہے وہاں مضاف الیہ قید ہوتا ہے اور مضاف خاص ہوتا ہے نہ کہ مضاف الیہ خاص ہو جائے۔ زید کا گھوڑا اور بکر کی کتاب، اس میں گھوڑے اور کتاب کی تخصیص ہے نہ کہ زید بکر کی، مگر پنڈت صاحب کو سخن فہمی سے کیا مطلب اور ان کا دماغ ان باتوں سے کب آشنا ہے کہ وہ مضاف الیہ (انصاف) کی تخصیص نہیں بلکہ انحصار کے مدعی ہیں۔ ایک چیز کا دوسرے کی طرف مضاف ہونا مضاف الیہ کی نسبت کو مضاف کے فرد مذکور میں منحصر نہیں کرتا ورنہ زید بکر کا بیٹا ہے، اس کے یہ معنی ہوں گے کہ بکر کا بیٹا ہونا زید میں منحصر ہے اور دیانند صاحب آریہ کے پنڈت ہیں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ آریہ میں دوسرا پنڈت ہی نہیں، یہ ایسی باطل بات ہے جس کو ہر سلیم العقل جانتا ہے، مگر شوق اعتراض نے پنڈت صاحب کو ایسی بدیہی اور صاف بات میں ٹھوکر کھلائی اور انہوں نے "روز انصاف" کے یہ معنی سمجھے کہ انصاف اس روز معین میں منحصر ہے۔ اس علم و فہم پر آپ کو "محقق" ہونے کا دعویٰ ہے اور قرآن پر اعتراض کرنے کی ہمت، غنیمت ہے کہ پنڈت صاحب نے یہ اعتراض نہ کیا کہ روز جزا کا مالک اور کسی دن کا مالک نہیں کیونکہ اس کی فہم سے کچھ بعید نہ تھا ورنہ پھر انہیں سمجھانا پڑتا کہ سلاطین کو مالک تاج و تخت کہتے ہیں اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ صرف تاج و تخت کے مالک ہیں، جاگیرات و اراضی، فوج و لشکر، کنیز و غلام، کچہری و دفتر وغیرہ کسی چیز کے مالک نہیں۔

پنڈت صاحب کی عادت ہے کہ وہ اپنے خیالات کو قرآن کی طرف منسوب کر کے ان پر اعتراض کیا کرتے ہیں۔ باوجودیکہ قرآن پاک میں ان کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ سوء فہم اور بلادت تو پنڈت صاحب سے کچھ بعید نہیں لیکن بے اصل بات کا الزام لگانا اور جس بات کا قرآن پاک میں شمہ اور اشارہ بھی نہ ہو، اس کو قرآن کا مدلول یا مفہوم ٹھہرانا

غایت درجہ کی ذلیل حرکت ہے' لیکن قرآن پاک کے بے عیب ہونے کی دلیل ہے کہ معترض اس کے کسی حرف پر اعتراض نہیں کرتا، مجبوری جھوٹی اور بے اصل باتیں اپنے دل سے گھڑتا ہے تاکہ لوگوں کو بہکائے۔

پنڈت صاحب نے لکھا ہے کہ "کیا بری بات میں بھی مدد چاہنا درست ہے؟" کس قدر بے اصل بات ہے یہاں بری بات کا ذکر ہی کہاں ہے؟ پنڈت صاحب خود لکھ چکے ہیں کہ "اسی کی عبادت کرنا اور اسی سے مدد چاہنا تو درست ہے۔" یہ ٹھیک ہے۔ قرآن پاک پر کیا اعتراض؟ جو بات اس میں ہے ہی نہیں، اس کا الزام قرآن پاک پر کیونکر آ سکتا ہے۔ بری بات کا تو قرآن پاک دروازہ بند کر رہا ہے اور دنیا کی تمام برائیوں کو نیست و نابود کیے ڈالتا ہے' اس کی نسبت یہ الزام بالکل ایسا ہے جیسا کوئی شخص یہ کہے کہ آفتاب میں سب خوبیاں ہیں لیکن اس کا توے کی طرح کالا ہونا باعث عیب کی بات ہے' اس کے جواب میں جو کہا جائے گا پنڈت اسی کے مستحق ہیں۔ پنڈت صاحب یہ دریافت کرتے ہیں: "سیدھا راستہ کیا صرف مسلمانوں ہی کا ہے؟" یہ کوئی اعتراض تو نہیں' ایک سوال ہے جس کا جواب یہ ہے کہ بے شک منزل مقصود تک پہنچانے والا سیدھا راستہ صرف مسلمانوں ہی کا ہے۔ "ان الدین عند اللہ الاسلام۔" پنڈت صاحب فلسفہ سے بہت واقف ہیں اس لیے انہوں نے یہ سوال کیا ورنہ کوئی صاحب خرد ایسا سوال نہیں کر سکتا۔

ہر منزل کے لیے کسی خاص مقام سے ایک ہی راستہ سیدھا ہو سکتا ہے' باقی اور جس قدر راستے ہوں گے سب ٹیڑھے اور خمیدہ ہوں گے۔ کاغذ کے صفحہ پر دو نقطے قائم کیجیے' ان کے درمیان راستوں کے خطوط کھینچیے' ایک سیدھا ہوگا باقی سب ٹیڑھے ہوں گے۔ کیا پنڈت صاحب یا ان کا کوئی ہوا خواہ دو نقطوں کے درمیان ایک خط مستقیم کے علاوہ دوسرا خط مستقیم بھی بنا کر دکھا سکتا ہے؟ اسی پر گھمنڈ تھا کہ وید سرچشمہ علوم ہے؟ آج تک آپ کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ سیدھا راستہ ایک ہی ہو سکتا ہے' دوسرا ناممکن۔ پنڈت صاحب نے اپنی عادت کے موافق یہ بھی کہا ہے کہ "سیدھا راہ بدی کا تو نہیں چاہتے؟" باوجودیکہ قرآن پاک میں موجود ہے: صراط الذین انعمت علیھم

غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔ اس میں صراط مستقیم کو متعین کر دیا ہے کہ "ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے رحمت فرمائی، نہ ان لوگوں کا جن پر تو نے غضب کیا، نہ گمراہوں کا۔" اس پر بھی روز روشن میں آنکھیں میچ کر رات رات پکارے جانا، پنڈت صاحب کے باطن کا نمونہ ہے۔ ان حرکات سے دنیا کو جو نفرت ہونا چاہیے محتاج بیان نہیں۔ مجھے پنڈت صاحب کے معتقدین پر تعجب ہے کہ ان کا کیسا مضبوط اعتقاد ہے جو باوجود ایسے بطلان کے خلل پذیر نہیں ہوتا۔ مگر اس پر اعتراض کی تقریر میں پنڈت صاحب نے اپنے مذہب کا خاتمہ ہی کر ڈالا جو یہ فرمایا کہ "اگر اچھی باتیں سب کی یکساں ہیں تو مسلمانوں کی خصوصیت نہ رہی اور اگر دوسروں کی اچھی باتیں نہیں مانتے تو متعصب ہیں۔"

○ ○ ○

آواگون یعنی تناسخ کی بحث اور اس کا بطلان

اعتراض: راہ ان لوگوں کی جن پر فضل کیا تو نے ان کی راہ مت دکھا کہ جن پر تو نے غصہ کیا نہ گمراہوں کا راستہ دکھا۔ (منزل اول سپارہ اول سورۃ فاتحہ آیت ۶-۷)

محقق۔ جب مسلمان تناسخ اور پہلے کیے ہوئے گناہ اور ثواب نہیں مانتے تو بعض لوگوں پر رحمت کرنے اور بعض لوگوں پر نہ کرنے سے خدا طرف دار ٹھہرتا ہے کیونکہ گناہ و ثواب کے بغیر رنج و راحت کا دینا قطعی بے انصافی کی بات ہے اور بلا سبب کسی پر رحم اور کسی پر غضب کرنا یہ بات ہی نہیں بن سکتی۔

جواب: پنڈت صاحب کے دماغ کی کہاں تک تعریف کی جائے جو بات ہے بے محل جو صدا ہے بے ہنگم، وہاں بندے کو دعا کی تعلیم و تلقین ہے کہ وہ خداوند کریم سے راہ راست پر چلنے کی توفیق طلب کرے جس کے اوپر چلنے والوں پر انعام ہوا ہے اور کج روی سے محفوظ رہنے کی دعا کرے۔ (جس کے اختیار کرنے والوں پر خدا کا غضب

ہے) تو یہ ظاہر ہے کہ یہاں اس نعمت و غضب کا تذکرہ ہے جو راہ راست پر چلنے اور اس سے انحراف کرنے کی جزا یا سزا میں ہو' اس پر یہ کہہ دینا کہ "بعض لوگوں پر رحمت کرنے اور بعض پر رحمت نہ کرنے سے خدا طرف دار ٹھہرتا ہے کیونکہ گناہ اور ثواب کے بغیر رنج و راحت کا دینا قطعی بے انصافی کی بات ہے۔" اس کلام کا یہاں کیا محل تھا؟ یہاں بغیر عمل کے رنج و راحت کا تذکرہ ہی کس نے کیا؟ جو آپ تناسخ لے دوڑے۔

ع سخن شناس نئی دلبرا خطا ایں جاست

لالہ صاحب کو ابھی تک فہم سخن کا تو سلیقہ ہی نہیں' اتنا شعور ہی نہیں متکلم کے کلام کو سمجھ سکیں کہ کیا کہہ رہا ہے' مگر نام کے محقق بن کر اعتراض بازی شروع کر دی' اب ذرا سی آپ کے تناسخ کی بھی خبر گیری کرتے چلیں جس کو آپ نے یہاں بے موقع دھنسایا ہے۔ تناسخ کی سب سے بڑی دلیل جو پنڈت صاحب کے پاس ہے وہ یہی ہے کہ رنج و راحت بے سابقہ عمل متصور نہیں۔ درحقیقت یہ خود ایک دعویٰ ہے جو محتاج دلیل کا ہے۔ پنڈت صاحب اور ان کے متبعین نے رنج و راحت کے جزا و سزا پر منحصر ہونے پر آج تک کوئی دلیل نہیں پیش کی' نہ آئندہ کبھی پیش کر سکیں گے بلکہ خود ان کی عبارتیں اور ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ اور ان کے وید کا طرز بیان ان کے اس دعوے کی تکذیب اور بطلان کے لیے کافی شہادت ہے۔

"رگوید آدی بھاشیہ بھومی کا مین پر جنم"

یعنی بیانِ تناسخ میں سب سے منتر یہ پیش کیا ہے: "اے پرانوں کے قائم رکھنے والے ایشور ہم اگلے جسم میں ہمیشہ سکھ پاویں گے یعنی جب ہم پچھلے جسم کو چھوڑ کر اگلا آنے والا جسم اختیار کریں تو اس جسم میں ہمیں پھر آنکھ اور پران ملیں' اے بھگوان ہمیں اگلے جنم میں تمام سامانِ راحت دیجیو۔ ہم تمام جنموں میں سورج کی روشنی دیکھ سکیں اور اندر اور باہر جانے والے جوان سے بہرہ یاب ہوں۔ اے سب کو عزیز رکھنے والے پرمیشور! ہم آپ سے یہی التجا کرتے ہیں کہ آپ کی رحمت سے تمام جنموں میں سکھ حاصل ہو۔" (رگوید اشٹک ودھیا ورگ ۲۳ منتر ۶)

وید میں اس قسم کے صدہا منتر ہیں جن میں اس قسم کی التجائیں تعلیم کی گئی ہیں جو

پنڈت صاحب کے دعوے کو باطل کر رہی ہیں اگر تکلیف و راحت، رنج و خوشی، سکھ اور دکھ عملوں اور کرموں پر موقوف ہے اور پرمیشور اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کر سکتا تو دعا کی تعلیم سراسر لغو اور ابلہ فریبی ہے۔ اصول تناسخ کی بنیاد پر ایشور مجبور ہے کہ جیسے عمل ہوں ویسا بدلہ دینے پر، اگلے جنم میں تمام سامانِ راحت دینا اس کے اختیار میں کیا ہے جس کی دعا وید میں تعلیم کی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وید کے مصنف کے نزدیک بھی تناسخ باطل ہے اور ایشور قادر ہے کہ وہ اپنے کرم سے جس انسان کو چاہے راحت دے۔ رگوید کا ساتواں منتر ملاحظہ فرمایئے:

"اے بھگوان! آپ کی عنایت سے ہمیں پران، اشیاء خوردنی اور قوت ہر جنم میں حاصل ہوں۔ زمین، سورج، انترکش، (خلا بالائے زمین) اور بہرم (نباتات) ہمیں پھر اگلے جنم میں زندگی دینے والے اور جسم کی پرورش کرنے والے ہوں۔ اے قوت عطا کرنے والے پرمیشور! ہمیں اگلے جنم میں پھر دھرم کا راستہ دکھائیو، ہمیں ہر جنم میں آپ کی رحمت سے سکھ حاصل ہو، یہی آپ سے التجا ہے۔"

پنڈت صاحب جب آپ کے قواعد سے نیکی کا بدلہ راحت دینے پر مجبور ہے اور بدی کا بدلہ رنج و تکلیف دینا بھی اس پر ایسا ہی لازمی اور ضروری ہے اور معاف کرنا آپ کے مذہب میں ایشور کے مقدور اور امکان سے باہر ہے تو رحمت و عنایت کے معنی کیا اور سکھ کی التجا کیسی؟ وید آپ کے مدعا کو خاک میں ملا رہا ہے اور تناسخ کے اصول میں بیخ کنی کر رہا ہے، اگر میں آپ کو وید کے منتر شمار کراؤں جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو آپ پریشان ہو جائیں۔ یجروید ادھیائے ۴ منتر ۱۵ ملاحظہ ہو:

"اے جگدیشور المالک جہاں! مجھے اگلے جنم میں آپ کی عنایت سے علم وغیرہ نیک گنوں سے آراستہ من (دل) اور عمر نیک خیالات سے پُر اور پاک آتما آنکھ اور کان عطا ہوں، تمام دنیا کو نور یا بصارت چشم عطا کرنے والا پرمیشور جو مکر وغیرہ تمام عیبوں سے پاک اور جسم وغیرہ کا محافظ عین علم و راحت مطلق ہے، جنم جنم میں ہمیں پاپ کے کاموں سے بچائیو اور ہماری حفاظت کیجیو تاکہ ہم پاپ سے بچ کر ہر جنم میں سکھ پاویں۔"

اب فرمائیے کہ دعا پر دعا، سوال پر سوال ایسے ایشور سے جو اپنی طرف سے کوئی راحت و آسائش دینے کا مالک و مختار نہیں، کسی تکلیف سے بچانا اس کے اختیار میں نہیں، کیونکہ کرم کا پھل بھوگنا ضروری ہے۔ ایسے مجبور اور لاچار ایشور سے سوال اور دعا لغو و بے حاصل نہیں تو کیا ہے؟ اور اگر اس کا کچھ حاصل ہے اور ایشور کو بغیر عمل کے عنایت و مرحمت کا اختیار ہے تو تناسخ باطل اور آواگون غلط اور آپ کا اعتراض، آپ کی گردن پر سوار کہ بغیر سابقہ عمل کے کس طرح اس نے رنج و راحت پہنچایا؟ اس سے اور بھی زیادہ سخت تر تکلیف اور عظیم مصیبت آپ کے لیے وہ ہے جو وید میں بایں الفاظ تحریر ہے: "جنم جنم میں ہمیں پاپ کے کاموں سے بچائیو۔" اگر ایشور کی قدرت میں ہے کہ وہ مخلوق کو گناہوں سے بچالے تو کسی کو بچالینا اور کسی کو نہ بچانا بلکہ دیدہ و دانستہ گناہ میں مبتلا کرنا، آریہ اصول کی بناء پر انتہا درجہ کی ستم گاری اور ظلم ہے۔

درحقیقت آریہ ایشور کو مالک و مختار نہیں مانتے بلکہ مجبور و بے اختیار سمجھتے ہیں۔ جب تو پنڈت دیانند نے قرآن پاک پر اعتراض کرتے وقت کہہ دیا کہ بعض لوگوں پر رحمت کرنے اور بعض پر نہ کرنے سے خدا طرف دار ٹھہرتا ہے کیونکہ گناہ و ثواب کے بغیر رنج و راحت کا دینا قطعی بے انصافی کی بات ہے۔ یہ اعتراض قرآن پاک کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتا جیسا کہ میں گزارش کر چکا ہوں اور مسلمانوں کا اعتقاد اس مضمون کی دھجیاں بکھیر دیتا ہے۔

اہل اسلام خداوند عالم کی عظمت و جلالت سے باخبر اور اس کی قدرت تامہ اور مالکیت حقیقیہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ مالک الملک، وہ قادر مطلق ہے جو اپنے ملک میں، اپنی ملک میں جو کچھ بھی تصرف کرے وہ حق و بجا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو مالک و قدرت کے معنی ہی کیا ہیں؟ لیکن پنڈت صاحب اللہ کے اوصاف کمال، اس کی عظمت و جبروت سے بالکل ناواقف اور محض ناآشنا ہیں۔ ان کے نزدیک ایشور کا یہی مرتبہ ہے کہ وہ کسی کو ذرہ بھر تکلیف یا راحت نہیں پہنچا سکتا لیکن وید کی دعاؤں کا سلسلہ ان کے قدم نہیں جمنے دیتا اور ان کے خیال کو باطل کر دیتا ہے اور جو اعتراض انہوں نے قرآن پاک پر جمانا چاہا تھا قرآن شریف تک تو نہیں پہنچ سکتا خود

پنڈت جی کی گردن کے لیے پھانسی بن گیا' جس سے اُن کی رہائی کسی طرح ممکن نہیں۔
رگوید آدی بھاشیہ بھومکا مطبوعہ مفید عام پریس لاہور ص ۱۳۱ میں ہے:
"جو پاپ کا کام بہت ہوتا ہے' وہ اگلے جنم میں انسان کا جسم نہیں پاتا بلکہ حیوان وغیرہ کا جسم پاکر دکھ بھوگتا ہے۔"

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کا جسم وہی پاتے ہیں جو پچھلے جنم میں بالکل بے گناہ تھے کیونکہ پاپی کو انسان کا جسم نہیں مل سکتا۔ تو اس قاعدہ سے کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس نے پچھلے جنم میں کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ پھر حمل و وضع کی تکلیفیں جو سب کو پہنچتی ہیں کس گناہ کی پاداش میں ہیں؟ اب پاپ کس کے گھر سے آئے گا؟ کسی کو امیر' دولت مند' کسی کو مفلس' غریب' فقیر' حاجت مند' کسی کو عورت' کسی کو مرد' کسی کو مخنث' کسی کو تندرست' کسی کو بیمار کر دینا بے سبب' بے گناہ اور ظلم عظیم آپ کے اصول سے ایشور اس سخت جرم کا مرتکب ہے کہ اس نے بغیر کسی گناہ کے انسان کی پیدائش میں اس قدر فرق رکھے۔ دیکھئے آریہ اس کے لیے کیا سزا تجویز کریں؟

علاوہ بریں آریہ نے کسی کو معصوم تو مانا نہیں' انسانوں کی عام حالت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ ایسی چیز ہے جس سے کوئی شخص نہیں بچتا' بڑا نہیں چھوٹا سہی' بہت نہیں تھوڑا سہی' کچھ نہ کچھ گناہ بندہ سے ہو ہی جاتا ہے اور ایشور معاف کرنے کی تو قدرت ہی نہیں رکھتا اور پاپی انسان کی جون نہیں پا سکتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی بھی انسان کی جون ہی نہ پائے اور انسان صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو جائے۔

اگر عالم کا انتظام آریوں کے اعتقاد کے موافق ہوتا تو عالم میں کہیں انسان کا نام و نشان بھی نہ ہوتا لیکن انسانوں کی کثرت اور مردم شماری کا روز افزوں ترقی کرنا' ویدک دھرم اور اعتقادات آریہ کے بطلان کی زبردست شہادت ہے۔ کہو پنڈت جی پھر قرآن پاک پر اعتراض کرو گے؟ غیرت' شرم' گھبرایئے نہیں' میں آپ کی پوتھی اور کھولتا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ کس سرمایہ پر آپ کو غرور ہے اور کن اباطیل کو آپ کلام حق مان رہے ہیں' آپ کی اندرونی حالت بھی آشکار ہو جائے۔

اپنے سایہ سے کہیں آپ ہی جائے نہ جھجک
اوچر پوش تو ادھر ناز سے آنا کیا ہے
چٹکیوں میں اڑا دوں ترا جوبن تو سہی
اے بت پردہ نشین تو مجھے سمجھا کیا ہے

رگوید آدی بھاشیہ بھومکا صفحہ ۱۴۱ میں ہے: "جو جیو ایشور کے کلام یعنی وید کو بخوبی جان اور سمجھ کر اس پر عمل کرتا ہے وہ مثل سابق پھر عالموں کا جسم پا کر سکھ بھوگتا ہے۔"

وید کی اس عبارت میں صراحت ہے کہ جو وید کے پورے پورے عالم ہیں اور اس کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں اگر وید کے مطابق عمل کریں تو اگلی جون میں ان کو عالموں کا جسم ملے گا اور وہ سکھ ہی پائیں گے، دکھ نہ پائیں گے۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ جب سے دنیا میں سلسلہ آمد ورفت (آواگون) مانا جاتا ہے" آیا کبھی کسی شخص کو بھی ایشور نے اپنے اس قانون سے نوازا اور کبھی اس اصول پر عملدرآمد ہوا؟ میں یقین کرتا ہوں کہ کسی سمجھدار انصاف پسند شخص، خواہ وہ آریہ ہی ہو اس کا جواب نفی میں دے گا اور بات یقینی ہے کہ ایشور نے کبھی کسی پر ایسی مہربانی نہیں کی۔

مثال کے طور پر آریہ مذہب کے پیشوا پنڈت دیانند کو سامنے لائیے وہ آریہ مذہب اور رویدک دھرم کے عالم ہیں، وید کو اس قانون سے لازم آتا ہے کہ انھوں نے عالموں کا جسم پچھلے جنم کی راست بازی اور نیکوکاری اور علم و عرفان کی وجہ سے پایا ہو لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جب وہ پچھلے جنم میں وید کے بخوبی عالم تھے اور انھوں نے اس کے مطابق عمل کیے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے عالموں کا جسم پایا، تو پھر کیا وجہ ہے کہ وید کے وعدہ کے مطابق اور ایشور کے قانون کے بموجب وہ پورا پورا سکھ حاصل نہ کر سکے اور دکھ سے بالکل محفوظ نہ رہ سکے۔ یہ دعویٰ باطل ہو گا کہ پنڈت دیانند کو اپنی حیات میں کوئی تکلیف بدنی، مالی، اعزازی پہنچی ہی نہیں، بچپن سے بڑھاپے تک وہ کبھی بیمار نہیں ہوئے، کسی عضو میں درد نہیں ہوا، آنکھ نہیں دکھی، کھانسی اور زکام تک سے محفوظ رہے، کسی کام سے تھکن نہیں ہوئی، مناظرہ کی مجلسوں میں جانے سے پہلو تہی نہیں کی؟ اگر کبھی مناظرہ کا اتفاق ہوا تو اپنے مقابلے سے مجمع کے سامنے شرمندگی نہیں اٹھائی؟ میں

امید کرتا ہوں کہ آریوں میں سے کوئی ایسا دعویٰ کرنے کی جرات نہ کرے گا۔ تو پنڈت صاحب کے لیے دکھ ثابت ہو گیا اور اس سے بھی بڑھ کر ان کا رجسٹری شدہ دکھ ثابت کر دیا جائے جو رگوید کے اسی صفحہ میں نرکت ادھیائے ۱۳ کھنڈ ۲۹ سے منقول ہے:

"میں مرا ہوں اور پھر پیدا ہوا ہوں اور پھر پیدا ہو کر پھر مرا ہوں' ہزاروں قسم کی جون میں پڑ چکا ہوں' قسم قسم کی غذائیں کھائیں اور مختلف پستانوں کا دودھ پیا' بہت سی مائیں دیکھیں اور بہت سے باپ اور دوستوں سے تعلق ہوا' اوندھے منہ بڑی تکلیف میں حمل کے اندر رہا۔"

اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی ہے کہ حمل میں بچہ کو بہت سخت تکلیف پہنچتی ہے' کیا آریہ یہ ثابت کرنے کی ہمت کر سکتے ہیں کہ پنڈت دیانند صاحب حمل میں نہیں رہے؟ ایسا نہیں ہے' حمل میں انہیں تکلیفیں پہنچیں اور ضرور پہنچیں تو وید کے ایشور کا سکھ دینے کا وعدہ غلط ہو گیا اور جب تمام انسان اسی طریقہ سے پیدا ہوتے ہیں تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا یہ وعدہ کبھی پورا نہیں ہوا اور اس قانون کو کبھی نفاذ میسر نہیں آیا۔

آپ کے پاس سب سے مقدس اور پاک ہستیاں صرف ان چار رشیوں کی ہیں جن پر آپ کے زعم میں وید کا الہام ہوا۔ وہ بھی اگر اس طریقہ سے پیدا ہوئے تو ان کا بھی یہی حال ہے' کامل سکھ سے وہ بھی محروم رہے' دکھ اور تکلیف سے وہ بھی نہ بچ سکے' ایشور کا قانون ان کے حق میں بھی بے کار اور نکما ہی رہا اور وید کا ایشور اپنے وعدہ کو حاملانِ وید کے ساتھ وفا کرنے سے بھی مجبور رہا اور اگر یہ کہتے کہ وہ توالد و تناسل کے طریقہ سے ماں اور باپ سے نہیں پیدا ہوئے' بلکہ وہ انہی بہت سے لوگوں میں سے تھے جو آریہ اعتقاد کی رو سے ابتدائے دنیا میں بغیر ماں باپ کے جوان جوان پیدا کیے گئے تھے تو یہ دریافت طلب ہے کہ الہام کے لیے ان کثیر میں سے ان چار کی کیا تخصیص؟ اور پھر یہ ثبوت دینا ہو گا کہ ان کو مدت حیات میں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچی؟ کم از کم موت آنا تو ان کے حق میں مسلم ہو گا' وہ کیا کچھ کم دکھ ہے؟ بہرحال یہ وعدہ کسی طرح پورا نہیں ہو سکتا اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایشور کی خدائی میں سب پاپی اور بدکار ہی

بستے ہیں۔ آج تک نیک، راست باز کوئی ہوا ہی نہیں جس کو وہ اپنی مہربانی سے نوازتا اور سکھ عنایت کرتا اور دکھ سے بالکل نجات دیتا یا یوں کہیے کہ اس کی ایسی عادت ہی نہیں۔

ع وہ ظالم کسی کو نہیں بخشتا ہے

نیک و بد سب کو آزار پہنچانا ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکنا اس کی خود خصلت میں داخل ہے۔ در حقیقت تناسخ ایک ایسا لچر خیال ہے جس کے ماننے والوں کو لامحالہ بے شمار الزامات کھانا اور ندامتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ رگوید کی عبارت میں "عالموں کا جسم پانا" بہت عجیب بات لکھی ہے، اگر یہ کہا جاتا کہ اگلے جنم میں جیو کو علم دیا جاتا ہے تو چنداں قابلِ گرفت نہ تھا مگر عالموں کا جسم پانے سے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مصنف کے خیال میں علم جسم دینے کے تو یہ معنی ہوئے کہ مختلف قسم کے جسم تیار ہیں، کوئی علم والا، کوئی جہل والا، جس کو علم والا جسم دیا عالم ہو گیا، جس کو جہل والا جسم دے دیا جاہل ہو گیا، اگر در حقیقت یہی مراد ہے تو عقل و خرد پر ہزار آفریں۔ ایسی بدیہہ البطلان بات زبان سے نکالنا آپ کا حصہ ہے اور اگر کسی اور معنی کو ان الفاظ میں ادا کرنا چاہا ہے اور ناقص و بے محل عبارت لائی گئی ہے تو یہ علم و لیاقت کی خوبی ہے، اس قابلیت پر محقق ہونے کا دعویٰ کتنا زیبا ہے۔ ہم لفظی اغلاط کے درپے نہیں ہونا چاہتے۔

رگوید آدبھاش بھاشیہ بھومکا میں پاپ اور پن کا پھل بھوگنے کے دو راستے بتائے ہیں: ایک "پتری یان" اور دوسرا "دیویان"... دوسرے کی نسبت لکھا ہے: "اور دیویان وہ ہے جس میں موکش کے درجہ کو حاصل کر کے مرنے اور پیدا ہونے کے جنجال یعنی دنیوی بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے، ان میں سے پہلے میں جیو اپنے کمائے ہوئے پن کے پھل بھوگ کر پھر پیدا ہوتا ہے اور پھر مرتا ہے اور دوسرے راستہ پر چلنے سے دوبارہ پیدا نہیں ہوتا۔"

اس عبارت نے تو تناسخ کا خاتمہ ہی کر دیا ہے۔ اس سے تو عالم کے ابدی ہونے کا خیال بھی باطل ہے جو آریوں کے عقائد میں سے ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں جیو موکش کے درجہ کو حاصل کر کے مرنے اور پیدا ہونے کے جنجال سے آزاد ہو جائیں تو عالم حیوانات و نباتات بالکل معدوم ہو جائے گا۔ گائے، بیل، بھینس، بکری، اونٹ،

ہاتھی، چرند، پرند، حشرات الارض سب ناپید ہو جائیں گے اور اس سے آریوں کے اس قول کا بطلان ظاہر ہوتا ہے کہ سلسلہ توالد و تناسل قدیم ہے اور ہمیشہ اسی طرح جاری رہے گا۔ جب ارواح نجات پاکر دوبارہ پیدا ہونے اور مرنے سے آزاد ہو جائیں گی تو یہ سلسلہ کہاں رہا؟

نیز پنڈت دیانند کا یہ قول بھی باطل ہوتا ہے کہ ایشور کسی کو ہمیشہ کے لیے راحت نہیں دے سکتا بلکہ نیک سے نیک شخص کو بھی ایک مدت معینہ کے لیے مکتی خانہ بھیج دیا جاتا ہے، جس طرح قیدیوں کو مدت مقرر کر کے جیل بھیج دیا کرتے ہیں اور جب وہ مدت ختم ہوئی تو مکتی خانہ سے نکال دیے گئے۔

روئے گل سیر ندیدند و بہار آخر شد

لیکن رگوید کی یہ عبارت بتاتی ہے کہ وہ دیوی ایندھن سے آزاد ہو جاتا ہے اگر بالفرض اس کو پھر گرفتار کیا جائے اور کسی جون میں لایا جائے تو اس کا قصور بتانا ضروری ہوگا اور جو جون اس کو دی جائے گی تو وہ کس عمل کی پاداش میں ہوگی۔ کیا آریہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کریں گے؟

علاوہ بریں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیو یعنی رُوح کو کسی نہ کسی جسم سے متعلق ہونا واجب اور ضروری نہیں، بلکہ رُوح مجرد بھی رہ سکتی ہے۔ یہ بات ہے جس نے تناسخ کے دلائل کا قلع قمع کر دیا اور در حقیقت آریوں نے یہ مسئلہ نہایت مضحکہ انگیز اور غیر عاقلانہ طریقہ سے مانا ہے، جیو کے ایک جسم سے دوسرے جسم تک پہنچنے کی جو صورت وید نے بتائی ہے اس کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ یجروید ادھیائے ۱۹ منتر ۴۷ میں ہے: "جب جیو پچھلے جسم کو چھوڑ کر ہوا، پانی اور نباتات میں سے گزرتا ہے، باپ یا ماں کے جسم میں داخل ہوتا اور بازہ جنم پاتا ہے، تب وہ جیو جسم اختیار کرتا ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آریوں کے اعتقاد میں روح بدن سے نکل کر ہوا میں گھومتی پھرتی ہے، پھر پانی میں غوطے لگاتی ہے، پھر نباتات یعنی ساگ وغیرہ پر بیٹھ کر غذا کے ساتھ مرد یا عورت کے جسم میں داخل ہوتی ہے۔ اول تو یہ ترکیب کتنی عجیب و غریب ہے، سنتے ہی عقل کو ایک حیرت ہوتی ہے، اس کے علاوہ یہ کس قدر نجس

بات ہے کہ روح نباتات ہی کی وساطت سے جسم میں داخل ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص نباتاتی غذائیں ترک کر دے اور حیوانی غذائیں کھایا کرے، گوشت، کباب، دودھ، دہی میں اس کی غذا منحصر ہو تو وید کے اصول سے کبھی اس کے اولاد نہیں ہو سکتی کیونکہ جیو اس کے جسم میں داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ داخل تو جب ہی ہوتا ہے جب وہ بھجیا کھاتا ہے مگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وید کے قاعدہ سے اس کے اولاد نہیں ہو سکتی لیکن تجربہ وید کے اس قانون کو غلط ثابت کر دے گا اور گوشت خور کی اس قدر کثیر اولاد ہو گی کہ بھجیا والے دیکھ کر ترساہی کریں گے۔

عالم حیوانات میں اگر نظر ڈالیے تو آپ کو بہت کثیر ایسے حیوانات ملیں گے جو نباتات سے آشنا نہیں۔ بعض مٹی چاٹتے ہیں، بعض ہوا یا پانی کے کیڑے مکوڑے کھاتے ہیں، بعض شکاری ہیں کہ وہ پرند یا چرند کے شکار ہی پر بسر کرتے ہیں اور ان سب کی نسلیں جاری ہیں، یہ تمام شہادتیں وید کی اس بعید از عقل و قیاس تعلیم کو لغو و مہمل ثابت کرتی ہیں۔ علاوہ بریں یہ کس قدر نرالی بات ہے کہ نباتات کے ذریعے جیو ماں یا باپ کے جسم میں داخل ہو کر جنم پاتا ہے۔

فرض کیجئے جس بوٹی پر جیو سوار تھا اس کو کسی نابالغ بچہ نے کھالیا تو چاہیے کہ اس بچہ کے اولاد ہو یا جیو زمانہ بلوغ تک اس کے پیٹ میں قید رہے تو یہ جنم لینے سے پہلے سزا ہو گئی اور جب بغیر جنم لیے سزا ممکن ہوئی تو سزا کے لیے جنم غیر ضروری ہوا، تناسخ باطل اور اگر ناگہانی طور پر کسی برہمچاری (مجرد) نے اس بوٹی کو کھالیا اور وہ جیو اس کے جسم میں داخل ہوا تو فرمایئے کہ مدت العمر قیدی رہے گا یا اس برہمچاری مجرد کے بچہ پیدا ہو گا؟ کیا اب تک وید کی اس تعلیم کا کوئی نشان پایا گیا ہے؟ اور کسی برہمچاری نے بچہ جنا ہے اگر وہ بوٹی عنین (نامرد) یا خصی مجبوب مقطوع الالہ کی غذا بنی اور جیو اس کے جسم میں داخل ہوا تو وہ کس راہ سے جنا جائے گا کان سے، ناک سے؟ اور اگر کسی ناکتخدا کنواری لڑکی یا برہم چریہ کرنے والی عورت نے وہ بوٹی کھالی تو بغیر شوہر ہی کے اس کے اولاد ہو جائے گی۔ آیا آریہ ایسا مانتے ہیں؟ اگر روح غذا کے ذریعے سے بلا ماں کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے تو اولاد ہونے کے لیے مرد کیوں درکار ہے؟ ایسا غلط اور ہوشمندانہ

خیال تعجب ہے کہ عقل و ہوش رکھنے والوں کا عقیدہ ہوسکے۔

پنڈت دیانند ایسی تناسخ کے معتقد ہیں اور قرآن مجید کی آیات میں اس کو ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ یقیناً کتاب الٰہی ایسی لغویات سے پاک ہوتی ہے بلکہ کسی عقلمند آدمی کی زبان و قلم سے ایسی باتیں نہیں نکل سکتیں جو بچوں کی نگاہوں میں بھی قابلِ مضحکہ ہیں۔

اب میں آریہ صاحبان سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ آیا دارالعمل اور دارالجزاء میں کوئی فرق و امتیاز کرتے ہیں یا نہیں؟ اور اس لحاظ سے ان کے نزدیک جونیں دو قسم پر منقسم ہیں یا نہیں، یعنی ایک تو ایسی جونیں جن میں جیو کو عمل کرنے کے لیے آزاد چھوڑا گیا ہو اور اس جون میں کسی قسم کی جزا و سزا سے کوئی تعلق نہ ہو۔ دوسری وہ جونیں جن میں جیو کے پاپ اور پن کے لحاظ سے جزا اور سزا دی جائے۔ اگر آریہ دھرم میں کہیں ایسی تقسیم ہے تو اس کا پتا دیجیے؟ مگر میں جانتا ہوں کہ آریہ کے اصول ان کو اس تقسیم کی طرف نہ جانے دیں گے، اس لیے دکھ اور سکھ کو، ہر رنج یا راحت کو وہ جزاء و سزا میں منحصر مانتے ہیں اور کوئی جون اس سے خالی نہیں ملتی تو پھر جون دارالجزاء ہے اور جزا کے لیے تقدم عمل ضروری اور جب کوئی جون جزا سے خالی نہیں تو لامحالہ عمل ہی ان تمام جونوں میں تسلیم کرنا پڑے گا تو نتیجہ یہ نکلا کہ ہر جون دارالعمل بھی ہے اور دارالجزاء بھی۔

میں پوچھتا ہوں کہ ایک جیو جس نے رنڈی کے گھر میں جنم لیا اور ایک جیو جس نے راجہ کے گھر میں جنم لیا اور ایک جیو جس نے کسی وید کے عالم پنڈت کے گھر میں جنم لیا، کیا ان سب کے عمل اپنی پچھلی زندگی میں یکساں تھے؟ اگر ایسا ہو تو ان کے ساتھ مختلف قسم کا سلوک ظلم ہوگا کہ ایک کو ایسے گھر میں پیدا کیا جس میں پیدا ہونا اس کے لیے انتہا درجہ کی ذلت ہے اور باوجود اس کے اس گھر میں ایسی تعلیم ملتی ہے ایسی تربیت و صحبت ملتی ہے جس سے اس کے لیے بدکاری طبیعت ثانیہ ہو جائے۔ کیا یہ ذلت اور ایسی خراب صحبت اور ایسی غلط تعلیم، یہ کل اسباب جیو نے خود مہیا کیے ہیں؟ ایسا تو نہیں ہے۔ ایشور ہی نے اس کو اس گھر میں پیدا کیا، اسی نے یہ صحبت و تربیت بہم پہنچائی تو ضرور ہے کہ کسی عمل کی پاداش میں اس کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہوگا۔

دوسرا جیو جس نے راجہ کے گھر میں جنم لیا ہے، اس گھر میں پیدا ہونا اس کے لیے غایت درجہ کی عزت ہے اور اس کو اچھی صحبت اور اچھی تربیت اس جون میں خود بخود میسر ہے، اس کے ساتھ یہ سلوک بھی آریہ اصول کی بناء پر ضرور کسی نہ کسی نیک عمل کی جزا میں ہے اور جس قدر سلطان عیش اور اختیار اس گھر میں اس کو حاصل ہوتے وہ

سب کسی نہ کسی نیکی کا بدلہ ہیں۔

تیسرا بچہ جو کسی وید کے عالم عامل رشی کے گھر میں پیدا ہوا، اس کو وید کی تعلیم حاصل کرنے، اس پر عمل کرنے کے لیے پہلے دونوں بچوں سے زیادہ سہولت حاصل ہے۔ اس کو وید کی تعلیم ایسی عمدہ بہم پہنچانا یہ بھی ضرور کسی عمل کا بدلہ ہے۔ جب ان تینوں بچوں کی حالتیں اس قدر مختلف و متفاوت ہیں تو ان کے سابقہ اعمال کا یکساں ہونا وید ماننے والوں کے اصول پر ایک ناممکن بات ہے۔

بالجملہ ہر ایک اپنے کردار کے موافق اسباب پا رہا ہے، وہ جیو جس کی سزا یہی تھی کہ رنڈی کے گھر پیدا ہو، رنڈی کی صحبت میں رہے، رنڈی کی تربیت پائے اور پھر رنڈی بن کر دنیا میں ذلت کے ساتھ دیکھا جائے، رسوائی و بے عزتی کا عذاب اختیار کرے۔ کیا پھر اس جرم میں پکڑا جائے گا کہ اس نے بدکاری کیوں کی، بری صحبت میں کیوں رہا؟ یا نہ پکڑا جائے گا؟ اگر نہ پکڑا جائے گا تو کیا ایسے عمل کرنے والوں کو آئندہ کے لیے کسی عمدہ جون پانے اور راحتیں حاصل کرنے کا امیدوار رہنا چاہیے اور اگر پکڑا جائے گا تو کیا جو مصیبت کہ اس پر سزا ڈالی گئی تھی پھر موجب سزا ہو جائے گی؟ جس شخص کو کسی جرم کی پاداش میں جرمانہ کی کوئی سزا دی گئی ہو، کیا پھر اس جرمانہ کو اس کی خطا قرار دے کر اس کو دوبارہ سزا دی جا سکتی ہے؟ یا جس اہلکار کو کسی قصور پر ایک ماہ کے لیے معطل کر دیا گیا ہو، اس کو اسی ایک ماہ کام نہ کرنے کے بدلہ میں پھر سزا دی جا سکتی ہے؟

جب ایک جیو کو ایشور نے کسی گناہ ہی کی سزا میں رنڈی بنایا ہے تو اب اس کے افعال کس طرح قابل مواخذہ ہو سکتے ہیں۔ دیکھئے! تناسخ کا اعتقاد کرنے سے کیسے برے نتائج پیش آتے ہیں۔ رنڈی بن کر بدکاری کرنا قابل سزا اور لائق گرفت نہ رہا۔ یہ تو ایک طرف دوسری جون میں ایشور رنج دے گا یا راحت، اس کا فیصلہ آپ کو متعذر ہے

کیونکہ اس جون سے پہلے کے جس قدر عمل تھے وہ تو سب سزائیں تھیں، نئی جون کے لیے کون سے عمل ہیں جن پر سے نجات و راحت دی جائے گی۔

اسی طرح ایک چھوت جس نے بھنگی کے گھر میں جنم لیا اور ہوش سنبھالتے ہی ضرورتِ معاش نے اس کو اپنے کسب موروثی کی پابندیوں پر مجبور کیا۔ بچپن ہی کی عمر میں بغل میں ٹوکری اور ہاتھ میں جھاڑو لیے ہوئے سڑکیں صاف کرتا اور نجاستیں دور کرتا پھرتا ہے، شام کو تھک کر پڑا رہتا ہے۔ یہ نادانی اور طلب علم کی عمر اس ذلت و خواری اور تکلیف کے ساتھ کاٹتا ہے اور پھر عمر بھر کے لیے یہی گندی خدمت اس کا طریق زندگانی اور طرز معاش ہوتی ہے اور وہ اپنی عمر کے طویل عرصہ میں علم حاصل کرنے کے لیے فراغ نہیں پاتا۔ کس طرح ممکن نہیں ہے کہ وید کے مطابق عمل کر سکے۔ اب ویدک دھرم کے خلاف ہونے کی وجہ سے اگلی جون میں اس کو کوئی سزا دی جائے گی اگر ایشور سزا نہ دے تو آریہ دھرم کی بنیاد پر وہ ظالم ٹھہرتا ہے کہ خطاکار کو سزا نہ دینا اور عفو کرنا بھی اس مذہب میں ظلم ہے۔ نیز اس تقریر پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ انسان کی نجات کے لیے وید پر عمل کوئی ضروری چیز نہیں ہے، بلکہ بری سے بری پر جرائم زندگانی بسر کرنے پر بھی نجات مل سکتی ہے اور اس سے تناسخ کے تار مکڑی کے جالوں کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں کہ بغیر عملوں کے بلکہ باوجود برے عملوں کے نجات مل گئی تو عمل پر جزا کا مدار نہ رہا اور اگر ایشور اس بھنگی پر عذاب کرے اور اس کو کسی بری جون میں گرفتار کر کے سختی و مصیبت میں مبتلا کرے تو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر پنڈت کے گھر میں پیدا کیا ہوتا اور وید کی تعلیم میرے کان میں پڑی ہوتی اور پھر میں نے اطاعت نہ کی ہوتی تو میں مجرم ہو سکتا تھا جب مجھے ایسی جگہ پیدا کیا جہاں وید کی صدا سے کان آشنا ہو ہی نہیں سکتے تھے اور ایسی صحبتیں تھیں جہاں ان باتوں کا کبھی تذکرہ بھی نہ تھا تو پھر وید پر عمل کرنا میرے امکان میں کہاں تھا اور کسی ناممکن بات کے نہ کرنے پر کوئی شخص کیسے مجرم قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس اعتراض کا ایشور کے پاس کیا جواب ہے؟ ظاہر ہے کہ کچھ جواب نہیں پھر بھی اگر اس کو سزا دے تو یہ سزا بے سابقہ جرم کی بنا پر ظلم ہو گی۔

اسی طرح ان ممالک کے رہنے والے جہاں زبان تو کیا وید کے نام اور وید کے ماننے والوں سے بھی لوگ واقف و آشنا نہیں ہیں اور ان کو خبر نہیں ہے کہ وید کوئی چیز بھی ہے یا نہیں، کیا انہیں بھی وید پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے گرفتار کیا جائے گا یا نہیں؟ اور سزا دی جائے گی یا نہیں، اگر دی جائے گی تو سزا بے جرم ہے، نہ دی جائے گی تو عمل بد بے سزا نہیں۔

کہئے! تناسخ کتنا عاقلانہ اعتقاد ہے؟ اس کا اسی زمانہ میں چلن ہو سکتا تھا اور یہ سکہ جبھی رواج پا سکتا تھا جب انسان وحوش کی طرح زندگانی بسر کرتے تھے اور علم و خرد سے ان کو سروکار نہ تھا۔ آج جب دنیا کے ہاتھ میں علم کی نورانی مشعلیں ہیں تو ان کو تاریک گڑھے میں گرا لینے کی توقع عبث ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حیوانات کی جونیں دارالعمل اور دارالجزاء دونوں تو ہو ہی نہیں سکتیں، اس کا بطلان تو ظاہر ہو چکا، اب صرف تین صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔

ایک یہ کہ تمام جونیں دارالعمل ہوں تو پوچھا جائے گا کہ جزا کہاں دی جائے گی؟ اور زندگی میں جو تکلیفیں یا راحتیں پہنچیں وہ کیوں پہنچیں؟ کیونکہ آریہ کے نزدیک رنج و راحت جزا یا سزا میں منحصر نہیں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ آریہ اصول کی بناء پر یہ جونیں تنہا دارالعمل بھی نہیں ہو سکتیں۔

تو دوسری صورت یہ ہے کہ تمام جونیں دارالجزاء ہوں۔ اس صورت میں دارالعمل کا پتا دینا ہوگا کہ وہ کونسی ولایت ہے جہاں کے عملوں کی پاداش میں دی جاتی ہے، یہ بتانا بھی آریوں کو محال سے کم نہیں۔

اب تیسری صورت صرف یہ باقی رہتی ہے کہ بعض جونیں دارالجزاء قرار دی جائیں، ان میں جیو صرف پچھلے کرم یعنی اعمال سابقہ کا پھل بھوگیں اور بدلہ پائیں گے اور ان پر تکلیفی احکام، فرائض اور منہیات کچھ نہ ہوں گے۔ اگر ایسا ہے تو اس جون کے بعد پھر دوسری جون انسانی خواہ حیوانی کوئی بھی ہو، انہیں کس استحقاق میں ملے گی؟ اگر بے استحقاق ملی تو راحت و رنج اور داد و دہش کے لیے تقدم عمل ضروری نہیں رہتا اور تناسخ کی بنیاد برباد ہو جاتی ہے اور اگر اس جون میں کچھ ان پر تکلیفی احکام بھی ہوں جن پر

عمل کرنے سے وہ آئندہ اچھا جنم اور سکھ پانے کے مستحق اور خلاف کرنے پر سزا اور عذاب کے مستوجب ٹھہریں تو یہ جون تنہا دارالجزاء نہ رہی اور باوجود اس کے یہ سوال ہوتا ہے کہ ان احکام کی تعمیل کے لیے انسانوں کی طرح دوسرے جانداروں کے پاس بھی کوئی دستور العمل، کوئی وید کی تعلیم دینے والا پنڈت پہنچتا ہے جو ایشور کی مرضی اور نامرضی یعنی نیک و بد افعال کے امتیاز بتائے اور وید کی وہ تعلیم ان تک پہنچائے جو آریہ اعتقاد میں نجات کے لیے ضروری ہے، اگر ان کے لیے کوئی وید و پنڈت ہے تو کہاں؟ کس صورت میں؟ کس طرح تعلیم دیتا ہے؟ ثبوت دیجیے اور نہیں تو انسان کو ہر جنم میں باوصف کمال ادراک ایک دستور العمل اور وید دیا جائے اور اس کی رہنمائی کی جائے اور کمزور حیوانات کو جو عقل و جزو میں انسان سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتے، ان احکام کی خبر تک نہ دی جائے جن پر عمل کرنا ان کی نجات کے لیے ضروری اور لازمی ہے، پھر انہیں ماخوذ کرنا اور سزا دینا عقلاً کب درست ہے؟ خود پنڈت دیانند صاحب نے اسی سورۂ فاتحہ پر زبان کھولتے ہوئے لکھا ہے:

"جس کتاب میں طرف داری کی باتیں پائی جائیں وہ کتاب خدا کی بنائی ہوئی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً عربی میں نازل کرنے سے عرب والوں کو اس کا پڑھنا سہل اور دوسری زبان والوں کو مشکل ہو جاتا ہے، اس سے خدا طرف دار ٹھہرتا ہے اور جس طرح خدا نے کل زبان کے رہنے والے آدمیوں پر نظر انصاف سے سب ملکوں کی زبان سے نرالی سنسکرت زبان میں جو سب ملک والوں کے لیے یکساں محنت سے حاصل ہوتی ہے، ویدوں کو نازل کیا ہے، ایسی ہی زبان میں اگر قرآن پاک کو نازل کرتا تو یہ نقص عائد نہ ہوتا۔" (ستیارتھ ص ۷۶۱)

خود اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ماننا پڑے گا کہ انسانوں کو وید دیتے اور حیوانوں کو محروم رکھنے سے ایشور پر طرف داری اور ظلم کا الزام آتا ہے جبکہ وہ بھی انسانوں کی طرح مکلف ہیں اور انہیں بھی نیک و بد اعمال کی سزا ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتانا ہو گا کہ وہ جانور جن کی غذا گوشت پر منحصر ہے اور ان کی زندگانی کا دارومدار شکار پر ہے جو کبھی گھاس اور دانہ کی طرف التفات نہیں کرتے اور یہ ان کی نوع کا خاصہ

ہے جو ان کے تمام افراد میں پایا جاتا ہے اور کوئی فرد اس سے مستثنیٰ نہیں ملتا۔ آیا ان کی یہ خوراک گناہ یا جرم ہے؟ ایسا تو ہو نہیں سکتا کیونکہ شکار اور گوشت خوری ان کا طبعی مقتضاء رہے' ان کے بنانے والے نے' ان کے پیدا کرنے والے نے' ان کی فطرت میں یہ اقتضاء رکھا ہے' اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کا کوئی فرد تو ترک گوشت کرتا یا سب نے مل کر اتفاق کر لیا ہے کہ ایشور کے قانون کو توڑنا چاہیے' وہ بھی نان کو آپریٹر (NON-COOPERATOR) ہو گئے ہیں؟ یہ بھی بداھتہ باطل' تو لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ گوشت ان کی جائز غذا اور مباح خوراک ہے اور گوشتوں میں بھی یہاں تک وسعت کہ ہندوؤں کی گؤماتا تک سے انہیں ورگز نہیں۔ آیا گوشت کی اباحت اور شکار کا جواز انہیں وید کا عطا کردہ انعام ہے؟ اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ جو وید ان کے لیے گوشت کو جائز کرتا ہے' دوسرے حیوانات کے لیے ناجائز کرتا ہے؟ دیکھا آپ نے تناسخ کا ثمرہ اور آواگون کا تماشا۔

پنڈت دیانند صاحب سے پوچھو' کیا ہوئیں ان کی تعلیاں' اسی منہ سے قرآن پاک پر اعتراض کرتے تھے۔ مگس فضلہ خوار را شہبازے آہنگ ہمسری۔

مگر یہ دعویٰ جانچنے کے قابل ہے کہ وید تمام بنی نوع انسان سے نسبت برابر رکھتا ہے۔ اول تو ایسی زبان میں ہونا جو کسی ملک میں نہ بولی جاتی ہو' کسی قوم کی زبان نہ ہو' اک مستزکی انسانوں کی تعلیم کے لیے جو کتاب ہوگی ضرور ہے کہ انسانوں کی زبان میں ہوگی۔ اس سے پھر قطع نظر کیجیے تو میں پوچھتا ہوں کہ رشی جن کو آریہ کے خیال میں وید کا الہام ہوا' وید کی زبان کو سمجھتے تھے یا نہیں؟ اگر سمجھتے تھے تو کس طرح؟ آیا وہ ان کی مادری زبان تھی؟ یہ تسلیم کیجیے تو وہ زبان تمام انسانوں کے لیے یکساں دشوار نہیں رہی اگر سنسکرت رشیوں کی مادری زبان تھی اور ان کے لیے بھی اتنی ہی مشکل تھی جتنی آج یورپ و امریکہ والوں کے لیے ہے تو سوال یہ کہ انہوں نے وید کو کیسے سمجھا؟ اور جو ذریعہ وید کی تفہیم کا ایشور نے انہیں دیا تھا اور اسبابوں سے وید کا سمجھنا انہیں آسان کیا تھا وہی اسباب دوسروں کو کیوں نہ دیئے؟ اس سے تو ایشیا طرف دار ٹھہرتا ہے اور اس کا انصاف پنڈت جی کے قانون سے رفو چکر ہوا جاتا ہے۔

اب پنڈت جی بتائیں کہ رشیوں کے لیے ذریعہ علم کیا ہے؟ اور جو ان کے لیے ہے دوسروں کے لیے کیوں نہیں؟ اس طرفداری کا پنڈت جی کے پاس جواب کیا ہے؟ یا یہی الزام وہ وید کو بھی لگاتے ہیں اور قرین انصاف تو یہ ہے کہ جو اعتراض انہوں نے دوسری کتابوں کی نسبت کیا جب وہ خود ان کی کتاب پر عائد ہوتا ہو تو وہ اس کو تسلیم کر لیں۔ وہ تسلیم کریں خواہ نہ کریں مگر عقلاً جانتے ہیں کہ پنڈت صاحب اپنے اعتراض کی زد میں خود ہی آگئے' اور ان کے لیے اس سے بچنے کی کوئی صورت نہ رہی۔

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ، شمع را
چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

○ ○ ○

جوابات اعتراضات متعلق سورۂ بقرہ

اعتراض: (۱) کیا اپنے ہی منہ سے اپنی کتاب کی تعریف کرنا خدا کی خودنمائی کی بات نہیں۔

جواب: پنڈت دیانند صاحب نے قرآن پاک کی ایک ایک سورہ' بلکہ ایک ایک آیت پر اعتراض کیا ہے۔ قرآن پاک تو کب اعتراض کے قابل ہے مگر عناد اور دشمنی کا علاج کیا۔

سورۂ بقرہ شریف میں ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ارشاد فرمایا گیا۔ اس کا ترجمہ پنڈت صاحب نے الفاظ میں کیا ہے: "یہ وہ کتاب ہے کہ جس میں شک نہیں۔"

اس آیت سے بلکہ خود اس ترجمہ سے بھی جو پنڈت صاحب نے کیا ہے' معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک وہ کتاب ہے جس کے علوم یقینی ہیں کہ شک و تردد کو اس میں اصلاً گنجائش نہیں۔ جیسا کہ فلسفہ' سائنس وغیرہ علوم اوہام و ظنیات کا مجموعہ ہیں اور ان کے بہت سے مسائل عندا لتحقیق غلط اور باطل ثابت ہو جاتے ہیں۔ ان علوم کو مذہب

یعنی انسان کی نجات کا مداوا اور اس کی سعادت اور تکمیل نفس کا کفیل نہیں کہا جا سکتا کیونکہ جو علم یقینی نہ ہو اور جس کے مسائل پر جزم نہ ہو سکے وہ کب اس قابل ہے کہ انسان اس پر بھروسہ کرکے اپنی معاش و معاد کا دارومدار اس کو قرار دے اور اگر ایسا کرے گا تو یقیناً گمراہ ہوگا۔

ان علوم کے مسائل کی غلطیاں اکثر ثابت ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی آسمان متحرک مانا جاتا ہے، زمین ساکن تسلیم کی جاتی ہے، صدہا سال تک یہی اعتقاد رہتا ہے پھر زمانہ بدلتا ہے تو زمین متحرک ثابت ہوتی ہے۔ پرانا فلسفہ لغو اور غلط قرار پاتا ہے۔ کبھی آسمان کو ایک جسم بسیط کروی بتایا جاتا ہے، مدتوں اس پر عقیدہ رہتا ہے۔ ایک زمانہ کے بعد آسمان کے جسم ہونے کا انکار کر دیا جاتا ہے اور وہ فقط حد نظر رہ جاتا ہے۔ ان متناقض باتوں میں سے ایک تو یقیناً غلط ہے۔

غرضیکہ انسان کے وہم و تخیل کی بنائی ہوئی عمارتیں اور افکار خطا کار کے پیدا کیے ہوئے علوم غلطی سے کس طرح محفوظ ہو سکتے ہیں اور غلطی پر عمل کرنے والا کہاں تک فلاح و بہبود کا امیدوار ہونے میں حق بجانب ہے، نہ تنہا غلطی کرنے والا بلکہ مجموعہ اغلاط کو اپنا دستور العمل اور مدار کار بنانے والا۔ سورۂ بقرہ شریف کی اس پہلی آیت نے یہ ہدایت فرمائی کہ نجات کے لیے وہی علم درکار ہے جو یقینی ہو وہ کتاب چاہیے جو اوہام و تخیل تو کیا شک و تردد سے پاک ہو۔

اس کے علاوہ ایک یہ بھی اشارہ ہے کہ انسان کو خطاء و نسیان لازم ہے اور اس کا کوئی کام بے سبب نہیں ہو سکتا، نہ اس کے علوم یقینی تو جو کتاب کسی انسان کی تصنیف ہوگی وہ اگر کتاب الہیہ سے مقتبس نہیں ہے تو بشری لغزشوں اور انسانی کمزوریوں سے اس کا خالی ہونا بعید از عقل ہے، اس کے مسائل ہرگز یقینی نہیں ہو سکتے۔

غرض! دو نتیجے حاصل ہوئے:

(۱) جس کتاب میں یقینی علوم نہ ہوں وہ مدار نجات اور انسان کی فلاح کی ضامن نہیں ہو سکتی۔

(۲) جس کتاب کے تمام علوم یقینی نہ ہوں وہ کتاب الٰہی نہیں ہو سکتی۔

یہ دو ایسے زبردست اصول بتائے تھے جن کو سمجھ لینے کے بعد قانونِ الٰہی کا تلاش کرنے والا مطمئن ہوجاتا ہے اور اس کو کتاب الٰہی اور علم نجات کے لیے ایک عمدہ معیار ملتا ہے۔

بہت سے مذہب ہیں اور سب اپنی حقانیت کے مدعی، بہت سی کتابیں ہیں جن کو کتاب آسمانی کہا جاتا ہے۔ طالب حق اسی معیار سے کتاب الٰہی کا پتا چلالے گا اور کسی دوسری چیز کو کتاب الٰہی سمجھ کر دھوکے سے نہ اٹھائے گا۔

جس بازار میں کھری جنس آتی ہے وہاں اس کی جانچ بھی کی جاتی ہے۔ چشمہ فروش چشمہ کی جانچ کے سب آلات اپنے ساتھ رکھتے ہیں بشرطیکہ وہ سچا مال فروخت کرتے ہوں، لیکن جھوٹے اور کچے چشمے بیچنے والا جوان کو پکا بتا کر فروخت کرتا ہے، امتحان کے آلات اپنے ساتھ نہیں رکھتا کیونکہ اس کو ان آلات سے ضرر کے سوا کسی نفع کی امید نہیں ہے۔ اگر یہ آلات کام میں لائے جائیں گے تو اس کے دعوے کا کذب ظاہر ہو جائے گا اور اس کو شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔

اگر احیاناً کسی صاحب کے پاس چشمہ جانچنے کے آلات موجود ہوں تو جھوٹا چشمہ بیچنے والا ان آلات کو نامعتبر اور اس طریقہ امتحان کو غلط بتانے پر مجبور ہوگا۔

کتاب الٰہی معیار صداقت پہلے پیش فرماتی ہے تاکہ طالب حق مطمئن ہو جائے لیکن جھوٹی کتاب کا حامی اس معیار سے اتنا ہی چڑ جاتا ہے جتنا کھوٹی جنس والا آزمائش سے۔

یہی وجہ تھی کہ پنڈت صاحب نے اس نفیس معیار پر اعتراض کی زبان کھولی اور اس کے اجمال حق نما سے آنکھ بند کرلی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر اس معیار پر آزمائش کی گئی تو وید کی کتاب الٰہی ہونے کی حقیقت کھل جائے گی اور پھر وہ کسی مرہم پٹی سے اس زخم کا علاج نہ کرسکیں گے جو وید کے الہامی ہونے کی رگ جان پر پہنچا ہے، اس لیے پیش بندی کے طور پر پنڈت جی نے اس معیار ہی کو خودنمائی بتایا اور وہ اس کے لیے مجبور تھے انھیں اندیشہ تھا کہ قرآن پاک اپنے ہاتھ میں ایک میزان رکھتا ہے اس کی شاہراہ پر مہر نیمروز کو شرما دینے والی روشنی ہے۔

چونکہ ہمیشہ اجالے سے گھبراتا ہے اور اندھیرے میں چھپا کرتا ہے ممکن نہ تھا کہ وید اس اس روشنی میں آسکے۔ اگر سوال کیا جاتا کہ وید جس کی نسبت آپ کو الہامی ہونے کا دعویٰ ہے' آیا وہ یقینی علوم کا ذخیرہ ہے اور اس بات کو کہیں وید نے بیان بھی کیا۔

وید جس کو آپ انسانی سعادت کا معلم قرار دیتے ہیں' وہ تخیلات و ہمیات سے پاک ہے یا نہیں اور وید نے کہیں اس کا علاج بھی کیا ہے۔ اس کا جواب دینا آپ کے لیے موت سے بڑھ جانے والی خجالت کے سوا اور کچھ نہ تھا' اس لیے پنڈت صاحب نے یہ چالاکی کی کہ پہلے سے اس معیار کا انکار کر دیا اور اس کو خود نمائی بتایا۔ میں نہیں جان سکتا کہ پنڈت صاحب خود نمائی کا مفہوم بھی سمجھتے تھے یا نہیں اور انہیں یہ بھی معلوم تھا یا نہیں کہ کونسی خود نمائی مذموم ہے اور کس لیے مذموم ہے؟ کیا ایک شخص کو وکالت کے امتحان میں شامل ہونے کے لیے بی اے کی سند پیش کرنا خود نمائی ہے؟ یوں تو بیرسٹر اور وکیل' ڈاکٹر اور پنڈت اور سوداگروں کے سائن بورڈ خود نمائی ہو جائیں گے اور پنڈت جی کے اصول سے یہ سب جرم ہے۔ چور مجرم اپنے حالات مستور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ غبن کرنے والا خزانچی نہیں چاہتا کہ محاسبہ کیا جائے۔ آپ کے نزدیک وہ نہایت پرہیز گار ہے کیونکہ خود نمائی نہیں کرتا مگر در حقیقت اس میں ایسا قصور ایسا نقص موجود ہے جو اسے منظر عام پر آنے کی اجازت نہیں دیتا اور اس میں وہ اپنی ہستی کے لیے خطرہ محسوس کرتا ہے۔ شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے بہت خوب فرمایا ہے:

ع آنرا کہ حساب پاک ست از محاسبہ چہ باک

"جس کا حساب پاک ہے محاسبہ سے نہیں ڈرتا"

اگر آپ کے نزدیک آپ کی کتاب میں علوم یقینی ہوتے تو آپ کو قرآن پاک کے ان کلمات سے اس قدر وحشت اور سراسیمگی نہ ہوتی۔

مدرسہ میں ممتحن کی صورت اس طالب علم کو نہایت بھیانک اور ناگوار معلوم ہوتی ہے جس نے سال کے تمام اوقات لہو و لعب میں ضائع کیے ہیں مگر جس طالب علم نے عرقریزی کر کے کچھ کمال پیدا کیا ہے وہ امتحان کے دن کی گھڑیاں گنتا ہے اور انعام پانے کے شوق میں ممتحن کا نہایت پیاری چیز کی طرح انتظار کرتا ہے۔

قرآن پاک کی یہ ضرب خاص زخم پر لگی جس سے وید والے بلبلا اٹھے اور اس سے پہلے ہی لفظ نے تمام باطل دعاوی کا راز فاش کر دیا۔ کسی سنگین جرم کا مرتکب گھر میں چھپ کر بیٹھے اور اس کو عزلت گزینی اور زاویہ نشینی سے تعبیر کرے اور مجمع میں آنے والوں پر خود نمائی کا الزام لگائے یہ کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے اس کو اس کا چال چلن روپوشی کے لیے مجبور کر رہا ہے۔ وہ اپنا منہ دکھانے کے قابل نہیں پاتا، اس لیے اندھیری میں چھپنے کی کوشش کرتا ہے مگر کسی بے گناہ سے بھی ایسی توقع کرنا کہ وہ تحقیقات کے وقت جرائم پیشہ ملزم کی طرح چھپ رہے گا، نہایت بھول پن ہے۔ وہ حکیم یا ڈاکٹر جو کسی ایسے مقام پر علاج کے لیے بھیجا گیا ہو جہاں وبائے عام پھیلی ہوئی ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی طبابت یا ڈاکٹری کی صفت سے لوگوں کو مطلع کرے، تاکہ مریض علاج اس سے رجوع کر کے نفع حاصل کر سکیں، اگر اس نے اس کو خود نمائی سمجھا اور اپنے اس کمال کا جس کے اجراء کے لیے وہ بھیجا گیا تھا، اظہار نہ کیا تو دنیا اس سے نفع حاصل نہ کر سکے گی اور وہ اپنا فرض انجام دینے سے قاصر رہے گا اگر ایسے موقع پر کوئی ڈاکٹر یا حکیم خود نمائی کے وہمی بھوت سے جھجک کر اپنے اوصاف کو چھپانے کی اجازت چاہے تو یقین ہے کہ اس کو پنڈت جی جیسے ذی عقل کے سوا اور کوئی اجازت نہ دے سکے گا۔ قرآن پاک ایسے وقت میں خلق خدا کی ہدایت کے لیے نازل ہوا جبکہ مخلوق پرستی کی وباء عام تھی، ایسے وقت میں اس کا فرض تھا کہ وہ اپنی معرفت کرائے، اس پر زبان کھولنا اور خود نمائی کا الزام لگانا پنڈت جی کی عقل و خرد پر روشنی ڈالتا ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ پنڈت جی وید کی اس کمی کو دیکھ کر پریشان ہیں اور ان کو مجبوراً ایسی باتیں منہ سے نکالنا پڑتی ہیں، کاش انصاف ہوتا اور وہ اس نیر ہدایت (قرآن پاک) کے علوم حقہ و حقیقیہ سے فائدہ اٹھاتے اور سنگال و خوف کو لالی آبدار سے ہم سنگ ثابت کرنے کی ناکام کوشش نہ کرتے۔

○ ○ ○

اعتراض ۵: جو پرہیزگار ہیں وے (وہ) تو خود راہ راست پر ہیں اور جو جھوٹی راہ پر ہیں ان کو یہ قرآن راہ ہی نہیں دکھلا سکتا' تو پھر کس کام کا رہا؟

جواب: پنڈت صاحب کو اعتراض کا تو بہت ہی شوق ہے' قبل اس کے کہ کلام کا مطلب سمجھیں اور متکلم کی مراد تک پہنچیں۔ اعتراض کے لیے منہ پھیلا دیتے ہیں اور کورانہ الزام لگا کر آپ ہی خوش ہو لیا کرتے ہیں۔ سخن شناسی سے مملو ہے اس کے مضامین عالیہ سے آپ کے دماغ کو کیا مناسبت ہے سمجھے جو اعتراض کیا جائے اس سے معترض کی نافہمی کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔" اس پر گزشتہ زمانہ کے کفار نے بھی اعتراض کیا تھا کہ "هُدًى لِّلضَّالِّيْنَ" ہونا چاہیے تھا جس کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن پاک گمراہوں کے لیے ہدایت ہے کیونکہ ہدایت گمراہ ہی کو کی جاتی ہے اور جو متقی ہے ایمان و اسلام کی دولت اسے حاصل ہے۔ زہد و ورع میں عمر گزار چکا ہے اس کے لیے ہدایت کے کیا معنی۔

یہ اعتراض بے بصیرتی اور نابینائی سے کیا گیا تھا۔ پنڈت صاحب نے بھی کفار کی تقلید کی اور اپنے بھدے اور بھونڈے الفاظ میں اس اعتراض کو بھی نقل کیا۔ ان بیچارے کو کیا خبر کہ جب قرآنی نکات بیان کیے جائیں گے تو معترضین کا نام سفاہت و جہالت کے لیے ضرب المثل ہو جائے گا۔

یہ قرآن پاک کی غایت بلاغت ہے کہ وہ یہاں ضالین کے لفظ سے تعبیر نہیں فرماتا بلکہ متقین ارشاد کرتا ہے۔ رہنمائی جس کو کی جاتی ہے اور منزل مقصود پر جس کو پہنچایا جاتا ہے اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں: ایک ہدایت سے قبل کی اور ایک اس کے بعد کی۔ ہدایت سے پہلے راہ یابی ہرگز نہیں ہوتی اور بے راہی ہوتی ہے۔ ہدایت کے بعد ہی آدمی راہ یاب ہوتا ہے۔ راہ یابی بعد کی حالت ہے اور بے راہی قبل کی۔ ایک شخص جو اول بے راہ تھا اور انجام کار راہ یاب ہوا' اس کی بہترین حالت کے ساتھ تعبیر کرنا مناسب ہے' بالخصوص ایسے موقع پر کہ جہاں کتاب کے اوصاف کی معرفت اور اس کی تاثیرات کا دکھانا بھی مقصود ہو۔

کتاب میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا کہ یہ یقینی علوم کا ذخیرہ ہے اس کے بعد اس کا اثر دکھایا گیا کہ مہدی متقی راہ یاب و نکوکار زاہد و متورع جو لوگ پائے جاتے ہیں وہ اس کتاب مقدس کی تعلیم کا نتیجہ اور اس کی ہدایت کا اثر ہیں۔ رہ متقی بھی جب ہوئے جب یہ کتاب ان کے لیے ہدایت ہوتی، متقی وہی ہے جو اس کتاب پر عامل ہو اور اس کو اس نے اپنا دستور العمل بنایا ہو تو اس متقی کے لیے ہدایت و رہنمائی کا سبب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے، رات دن کے محاورات پر نظر کرنے سے یہ عقدہ حل ہو سکتا تھا۔ ایک فاضل و ماہر جب اس کے استاد کی تعریف کا وقت آئے تو فصحاء اور خوش زبان لوگ یہی کہیں گے کہ اس عالم کو زید نے پڑھایا ہے اور وہی اس کے کمال کا باعث ہوا۔ اس نے اس کی رہنمائی کی۔ پنڈت جی شاید اس عالم کی نسبت یہ کہنا فصاحت سمجھیں کہ اس جاہل کو زید نے پڑھایا ہے اور اس کی یہ دلیل پیش کریں کہ عالم کو پڑھانے کی کیا ضرورت، ضرورت تو جاہل کو پڑھانے کی ہوتی ہے مگر کوئی شائستہ شخص پنڈت صاحب کی اس فصاحت کو پسند نہ کرے گا۔

کیا یہ کہنا بھی قابل اعتراض ہے کہ پنڈت جی نے یہ کتاب لکھی۔ پنڈت جی تو اس پر اعتراض کر سکتے ہیں کہ کتاب تو جب ہوئی جب لکھی جا چکی، کتاب تو لکھی ہوئی کو کہتے ہیں اس کو کوئی کیونکر لکھے گا لیکن دنیا پنڈت جی کے اس شاستر کو تسلیم نہ کرے گی۔ یہ رات دن کے محاورات ہیں۔ کہتے ہیں کہ قلعہ شاہجہان نے بنایا۔ پنڈت صاحب کو اعتراض ہو جائے گا کہ قلعہ تو بنے ہوئے کا نام ہے اس کا بنانا کیا۔

کچہری میں مقدمہ پیش ہوتا ہے مدعا علیہ جرم کا اقبالی ہے کہتا ہے کہ اس مقتول کو میں نے قتل کیا۔ سو اتفاق ہے اگر پنڈت جی ایسے دماغ کا کوئی شخص جج ہو تو فوراً مقدمہ چھوڑ دے کہ مقتول تو قتل کیے ہوئے کو کہتے ہیں، اس کا قتل کرنے کا کیا معنی۔

اتنا اور بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اگرچہ ہدایت یہاں رہنمائی یا منزل مقصود تک پہنچانے کے معنی میں ہے مگر ھدی قرآن پاک کا نام بھی ہے اور بلاغت کلام ان تمام باتوں کا لحاظ چاہتی ہے۔ جو شخص کہ اس کی تعلیم سے راہ یاب ہو جائے ہم ان کو اس کے اعلیٰ وصف کے ساتھ تعبیر کرنا حسن کلام ہے۔ ہم اسی کو خوبی سمجھتے ہیں کہ یوں کہیں کہ

قرآن پاک متقیوں اور پرہیزگاروں کے لیے ہے۔ (یعنی جو اس سے منتفع ہوتا ہے متقی اور پرہیزگار ہوتا ہے)

پنڈت جی اگر اس محاورے سے ناخوش ہیں تو کیا وہ یہ کہنا گوارا کریں گے کہ صید بد معاشوں کے لیے ہے۔ اب تو پنڈت جی کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ قرآن پاک نے تہذیب و شائستگی اور بلاغت و خوش بیانی کا جو اعلیٰ نمونہ پیش کیا تھا اس کو پنڈت صاحب نے اپنی سادہ لوحی سے قابل اعتراض سمجھا اور غلطی کی دلدل میں پھنس گئے۔

اس کے علاوہ مفسرین نے متقی کی تفسیر میں یہ بھی لکھا ہیں کہ متقی اس پاک سیرت شخص کو کہتے ہیں جو قبول حق کی اہلیت رکھتا ہو اور ظاہر ہے کہ رہنمائی ایسے ہی شخص کو مفید ہو سکتی ہے۔ معاند ہٹ دھرم کبھی رہنمائی سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ اس لیے ھدی للمتقین بھی فرمانا حق ہے۔ ہدایت کے معنی رہنمائی کے بھی آتے ہیں اور منزل مقصود پر پہنچانے کے بھی دوسرے معنی کے لحاظ سے ہدایت متقیوں کے لیے خاص ہے اور ان کے ماسوا اور کسی کے لیے متصور نہیں اور پہلے معنی کے لحاظ سے ہدایت عام ہے خواہ کوئی منتفع ہو یا نہ ہو۔ یہ اس کا نصیب، لیکن رہنمائی تو سبھی کے لیے ہو سکتی ہے۔ ایسے خواص پر نظر رکھنے والا کلام، کلام حق ہی ہو سکتا ہے۔

معنے اول کے لحاظ سے اسی قرآن پاک کی شان میں ھُدًى لِّلنَّاسِ ارشاد فرمایا اور معنی ثانی کے اعتبار سے ھُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔

بعض دقیقہ رس مفسرین اس سے زیادہ باریک بات تک پہنچے ہیں کہ نظم کلام میں ایک جگہ لِلنَّاسِ اور ایک جگہ لِلْمُتَّقِينَ فرماتے ہیں، ضرور ہدایت کے دونوں معنی کا لحاظ فرمایا گیا اور ان کے مناسب کلمات نظم پاک میں لائے گئے لیکن بحر معنے کی غواصی کرنے سے پتا ملتا ہے کہ دونوں تعبیریں ایک ہی حقیقت کی ہیں۔ ایک جگہ ھُدًى لِّلْمُتَّقِينَ فرما کر دوسری جگہ لِلنَّاسِ فرماتے ہیں۔ ایما ہے کہ ناس یعنی انسان کہلانے کے حق دار صرف متقی ہی نہیں جن کو کمالات انسانیہ حاصل ہیں لیکن وہ پیکر اور وہ پتلے جن کا رنگ روپ قد و قامت چہرہ مہرا اعضاء کی ظاہری صورت تو انسانوں سے ملتی جلتی ہے مگر انسانی اوصاف سے ان کی ہستی معرا ہے، وہ انسان کہلانے کے مستحق

نہیں۔ ان کی شان میں ارشاد فرمایا: "اولئک کالانعام بل ھم اضل "... وہ چوپایوں کی مثل ہیں بلکہ اور زیادہ گمراہ تو شرف انسانیت متقین ہی کو حاصل ہے اور وہ اس رتبہ پر قرآن پاک کی ہدایت سے پہنچے ہیں تو نتیجہ نکلا کہ انسان کو کمالات انسانیت حاصل کرنے اور آدمی بننے کے لیے قرآن پاک کی حاجت ہے تو اس کتاب مقدس نے بتلایا کہ وہ یقینی علوم پیش کرتی ہے اور یقینی علوم بھی ایسے جس میں انسان کے شرف و کمال کا اظہار ہے کہ بغیر اس کے حصول سعادت ممکن ہی نہیں اور بے شک کتاب الٰہی کی یہی شان ہونا چاہیے اور یہ اس کے من عند اللہ ہونے کی ایک برہان ہے۔

عاقل بصیر کو ایمان لانے اور قربان ہونے کے لیے قرآن پاک کی ایک یہی ادا کافی ہے۔ مگر پنڈت جی جب وید کے اسٹاک ٹٹولتے ہیں اور وہاں یہ سامان ان کو نظر نہیں آتا تو وہ جھنجلا کر قرآنی کمالات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ کوشش ان کے جہل و دعوایت کی دلیل بن جاتی ہے۔ پنڈت صاحب کے اعتراض کا تو شیرازہ بکھر گیا۔

اس کے بعد پنڈت صاحب نے بھی عمل سابق کی خبر کے عطا فرمانے پر اعتراض کیا ہے۔ بحث تناسخ میں اس پر کافی رد ہو چکا اس لیے یہ سوال اس موقع پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔

○ ○ ○

اعتراض: اگر بائبل، انجیل وغیرہ پر اعتقاد لانا لازم ہے تو مسلمان انجیل وغیرہ پر ایمان مثل قرآن کیوں نہیں لاتے اور اگر لاتے ہیں تو قرآن کا نازل ہونا کس واسطے ہے؟ اگر کہیں کہ قرآن میں زیادہ باتیں ہیں تو کیا پہلی کتاب میں خدا لکھنا بھول گیا تھا اور اگر نہیں بھولا تو قرآن کا بنانا لاحاصل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بائبل اور قرآن کی چند باتیں آپس میں نہیں ملتیں اور بہت سی ملتی ہیں۔ ایک ہی مکمل کتاب جیسی کہ وید ہے کیوں نہ نازل کی؟

جواب: اس طولانی اعتراض کو دیکھیے، کلام کی رکاکت اور بے ربطی پر نظر

ڈالیے، خوبیٔ تشقیق کی تعریف کیجیے، کیا اعتراض ہے۔ جیسا دماغ ویسی نکتہ آفرینی۔

توریت، انجیل، زبور، قرآن یہ تمام کتب الہیہ ہیں۔ مسلمان ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور ان کے کلام الٰہی اور حق ہونے کی تصدیق کرتے ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ ایک چیز کی تصدیق کرنے سے دوسری چیز کا نزول ہی بے کار ہو جائے، نہ معلوم پنڈت صاحب نے کون سے مدرسہ میں تعلیم پائی ہے؟

ایک شخص جو یہ تسلیم کرتا ہے کہ گیہوں خدا کا پیدا کیا ہوا ہے، پھر یہ بھی مانتا ہے کہ چاول بھی خدا کا پیدا کیا ہوا ہے۔ پنڈت صاحب کو یہ نئی کروحشت پیدا ہوگی کہ جب چاول خدا کا پیدا کیا ہوا تسلیم کر لیا گیا تو گیہوں کا پیدا کرنا بے کار ہوا، اگر کہیں کہ گیہوں میں کچھ اور بات ہے تو کیا ایشور چاول پیدا کرتے وقت اس بات کو بھول گیا تھا۔ ایک ہی چیز ایسی مکمل کیوں نہ بنائی جس میں تمام ذائقے اور جملہ خاصیتیں موجود ہوتیں۔

پنڈت جی کو کائنات کی حکمت میں کبھی غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جب وہ پیدا ہوئے تھے، ان کے منہ میں دانت اور چہرے پر بال نہ تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد دانت نکلے اور اس سے اور زیادہ عرصہ کے بعد چہرے اور سینہ پر بال نمودار ہو گئے تو کیا ایشور پہلے دانت بال پیدا کرنے بھول گیا تھا یا اب اس سے غلطی ہوئی۔ جس وقت کی حکمت کا جو تقاضا ہوتا ہے حکیم وہی کرتا ہے، جن امتوں کے لیے جو احکام مناسب تھے انہیں دیئے گئے۔ اس تفاوت پر اعتراض حکمت الہیہ پر لب کشائی اور جہل ہے۔ خدا کی بے شمار مخلوق میں قدرت کے پیدا کیے ہوئے ایسے تفاوت نظر آ رہے ہیں جن کو دیکھ کر عاقل و فہیم مطمئن ہو جاتا ہے اور ان کے مصالح کو اسی کی حکمت پر محمول کرتا ہے۔ یہ اعتراض تو خود پنڈت جی کی گردن پر سوار ہے، وہ اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں کہ چار وید کیوں ہیں؟ ایک ہی مکمل کیوں نہ ہوا اور مکمل کتاب کی نظیر میں وید کا ذکر نہایت ظلم ہے۔ یوں تو بزور زبان پنڈت جی وید کو تمام علوم کا سرچشمہ کہہ رہے ہیں اور مکمل کتاب بتا رہے ہیں لیکن وید پر یہ بالکل جھوٹا اتہام ہے۔ وہ پرانے زمانہ کی شاعری اور قرونِ ماضیہ کے شاعروں کے خیالات کا ذخیرہ ہے، اس حکمت نظریہ اور عملیہ سے واسطہ اور مطلب، علم التنفس علم اخلاق کا تو کیا ذکر ہے، فحش اور شرمناک تعلیمات سے وہ مملو

ہے۔ کسی کتاب حق کے مقابل اس کا نام لے دینا اور اس کو انسانوں کا رہنما بتانا اس سے بہت زیادہ مبالغہ ہے کہ کسی بڑے کو چھوٹے، لال کو سیاہ فام، بھیانک صورت والی کو سندر کہا جائے۔ پنڈت مہی دھر کے ترجمہ سے وید کی تعلیمات کے جو نمونے ملتے ہیں وہ میں اہل نظر کی رائے زنی کے لیے خود پنڈت دیانند کی رگوید آدی بھاشیہ بھومیکا سے نقل کرتا ہوں:

یجروید ادھیائے ۲۳ منترا۱۹ ترجمہ مہی دھر مشی (زن کی جان) روبروئے جملہ مہتمان یکہ نزد اسپ افتادہ میگوید، اے اسپ من در رحم خود نطفہ تو کرو حمل قراری باید میگرم تو ہم آں نطفہ را در رحم من بینداز۔

(منترا۲۱) اسپ عضو خو اور جسم زن می ا فگند دور شا اسپ را میگویند زن عضو اسپ را بدست خود کشیدہ در جسم خود داخل می کند۔

(منتر۲۲) ادھوریو یعنی کار پردازان یکہ زنان و دوشیزگان بانگشت ہائے خود شکل اندام نہانی ساختہ بطریق تمسخر میگوید کہ بوقت زور دگای زناں آواز ہلہلہ می خیزد و فتیلہ عضو مرد مثل گنجشک در اندام زن می رود و زن آنرا در جسم خود فرو میخورد و انزال میکند د راں وقت آواز کلکہ می خیزد دوشیزگان بانگشت ہائے خود صورت عضو مرد می نمایند و آو کھوریو را میگویند کہ رودن حشفہ باروئے تو مشابہت دارد۔

اس کو ملاحظہ فرما کر آپ فیصلہ کیجئے کہ جس کتاب کے ماننے والوں نے خود اس کے یہ ترجمہ کیے ہوں اور اس کا مذاق سخن اور طرز گفتگو اس قدر شرمناک ہو کہ اس کے سامنے جرکین کا دیوان اور کوک شاستر بھی ہیچ ہو کر رہ جائے، اس کتاب کو مکمل کتاب کہتے ہیں یا انہیں مضامین کو پنڈت صاحب انسانی تکمیل کے لیے ایسا ضروری تصور کرتے ہیں کہ جس کتاب میں یہ نہ ہوں، وہ ان کے نزدیک نامکمل ہو جاتی ہے۔

پنڈت صاحب نے مہی دھر کے ترجمہ کی تغلیط کی ہے اور بات یوں بنائی ہے کہ یہ افکار یعنی تشبیہ و استعارہ میں گفتگو ہے۔ کوئلے کی سیاہی کہاں تک دھوئی جا سکتی ہے لیکن ہم پنڈت صاحب کی خاطر سے فرض کر لیں کہ یہ استعارے ہیں تو کیسے شائستہ اور مہذب استعارے ہیں۔ ایسی تعبیریں کیا علم و فضل اور شرم و حیا والے انسان کے قلم

سے نکل سکتی ہیں، جس مذہب نے ایسی کتاب کو مذہبی کتاب مانا ہو اور اس کو انسانی سعادت و نجات کا کفیل و ضامن بنایا ہو اور جن دماغوں نے اس کو قبول کیا ہو ان کو آفرین کہنا چاہیے۔

جو طبائع اس ذوق تعلیم کی ابتداہی سے خوگر ہو چکی ہیں ان کو اگر قرآنی تعلیموں سے گھبراہٹ اور برداشتگی ہو تو چنداں تعجب نہیں۔ وید جیسی کتاب ہاتھ میں رکھتے ہوئے قرآن پاک پر اعتراض کرنا بہت غیرت کی بات ہے۔

کیا پنڈت جی بتا سکتے ہیں کہ ان کے ایشور نے وید کے الہام کے لیے چار رشی کیوں پیدا کیے؟ ایک ہی شخص ایسا کامل کیوں نہ بنایا جو تمام وید کی تبلیغ و اشاعت کر سکتا۔ بقول پنڈت جی کے ایشور بھول تو نہیں گیا تھا۔

○ ○ ○

اعتراض (۱) کیا قیامت پر ہی یقین رکھنا چاہیے اور کسی چیز پر نہیں؟

(۲) کیا عیسائی اور مسلمان بھی خدا کی ہدایت پر چلنے والے ہیں اور ان میں کوئی گناہ گار نہیں ہے؟

(۳) کیا وہ عیسائی و مسلمان جو بدکار ہیں، وہ نجات پائیں گے؟ کیا یہ سخت بے انصافی اور اندھیر کی بات نہیں ہے؟

(۴) کیا جو لوگ مسلمانی مذہب کو نہیں مانتے انہیں کو کافر کہنا یکطرفہ ڈگری نہیں ہے؟

(۵) اگر خدا ہی نے ان کے دلوں اور کانوں پہ مہر لگائی ہے اور اسی وجہ سے وہ گناہ کرتے ہیں تو ان کا کچھ بھی قصور نہیں ہے۔ یہ قصور خدا ہی کا ہے۔ ایسی صورت میں ان کو سکھ دکھ یا گناہ و ثواب نہیں ہو سکتا۔ پھر خدا ان کو سزا و جزا کیوں دیتا ہے؟ کیونکہ انہوں نے گناہ یا ثواب خود مختاری سے نہیں کیا۔

جواب: پنڈت جی نے اپنے خیال میں بڑا ہی کمال کیا کہ آیت مبارکہ کے

ایک ایک جز پر اعتراض کر دیا۔ میں پنڈت صاحب کے ہر اعتراض کا جواب دوں گا لیکن اس سے پہلے ایک حکایت عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جو پنڈت صاحب کے حال سے مطابق ہے۔

ایک بھنگڑ (بھنگ پینے والا) یا کسی افیونی کو کسی صاحب نے بھنگ پیتے ہوئے دیکھا اور انہیں ان جناب کے اس سیاہ مستی کی خبر نہ تھی' بدحواسی دیکھ کر سمجھے کہ اس غریب کو غشی کا دورہ ہو گیا۔ دوڑ کر کہیں سے گلاب کا ایک پھول لائے اور ان کی ناک پر رکھ کر سنگھانے لگے۔ دماغ میں خوشبو پہنچتے ہی بھنگڑ صاحب اچھل پڑے اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے' کچھ دیر اسی طرح بیٹھے رہے۔ کچھ دیر کے بعد جب اس صدمہ کا اثر دور ہوا تو کہنے لگے یہ کون میرا جان کا خواہاں اور دشمن سنگدل تھا جس نے میرا دماغ ہی معطل کر دیا۔ معلوم نہیں کیا بلا مجھے سنگھا دی جس سے دماغ میں زخم ہو گیا ابھی تک تیر سا چبھ رہا ہے۔ بہت غم و غصہ کا اظہار کیا۔ یہ حالت دیکھ کر عمخوار صاحب اپنے دل میں کچھ نادم بھی ہوئے اور ساتھ ہی انہیں یہ خیال بھی آیا کہ حالت غشی میں اس کو گلاب کی خوشبو کا اور اگ انہیں ہوا' یہ کچھ اور سمجھ گیا اور میری طرف سے بدگمان ہو گیا اس کا خیال صحیح کرنے کی غرض سے انہوں نے پھول لا کر سامنے رکھ دیا کہ جناب کوئی مضر اور مہلک چیز میں نے آپ کو نہ سنگھائی تھی۔ یہ گلاب کا پھول تھا جو آپ کے دماغ صحیح کرنے کے لیے سنگھایا گیا تھا۔

پھول کے دیکھتے ہی وہ گھوڑے کی طرح بدک کر بھاگے اور دور جا کر کہنے لگے کہ واہ حضرت آپ نے مجھ سے کب کی عداوت نکالی ہے۔ میں اس سم قاتل کو برداشت کر سکتا تھا؟ آپ ایک لحہ اور سنگھا دیتے تو میرا خاتمہ ہو جاتا اور اس کی سمیت تو اس کے خونی رنگ ہی سے ظاہر ہے' اسے جلدی پھینکیے' ورنہ اس کی رنگت ہی سے میری روح کے تحلیل ہو جانے کا اندیشہ ہے مگر خیر ہم لوگ دشمن کے ساتھ بھی نیکی ہی کرتے ہیں۔ آپ نے تو میرا خون کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ لیکن کیا یاد کرو گے' یہ لے جاؤ تھوڑا سا چنڈو ہے' اس کا مزہ لیجیے' تب آپ کا دماغ درست ہو اور آپ خوشبو اور بدبو پہچاننے کے قابل ہوں۔

یہ حکایت بر سبیل تمثیل ذکر کی گئی۔ قرآن پاک کی آیتوں سے پنڈت صاحب کو

چوٹ لگتی ہے۔

(۱) "وبالآخرۃ ھم یوقنون"۔۔۔ اس پر پنڈت صاحب یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قیامت پر ہی یقین کرنا چاہیے اور کسی چیز پر نہیں۔

اس سمجھ کی تو تعریف کیجیے کہ آیت میں قیامت کا ذکر بھی نہیں جس پر آپ اعتراض کر رہے ہیں جو اس کیے ہوئے اعتراض کرنے کے لیے اتنی ہی قابلیت درکار ہے کہ آخرت قیامت کو سمجھ گئے جس شخص کو ترجمہ کرنے کی بھی تمیز نہیں، وہ اعتراض کے لیے زبان کھولے۔ سبحان اللہ اور اسی پر یقین رکھنا چاہیے، یہ کون سے لفظ کا ترجمہ ہے جس سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا کہ اور کسی چیز پر نہیں۔ یہ اعتراض ہے یا افترا وبہتان اور ایسا بہتان کہ ادنیٰ درجہ کی شرم و حیا والا انسان بھی اس کی جرأت نہ کر سکے۔ قرآن پاک میں کہیں اور نہیں خود انہیں ان آیتوں میں "الذی یؤمنون بالغیب" اور "والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک" مذکور ہے۔ خود پنڈت جی اس کا ترجمہ بھی کہہ چکے ہیں مگر یہاں شوق اعتراض میں اس سے آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی۔ جب قرآن پاک مومنین کی شان بتاتا ہے کہ وہ غیب پر یقین رکھتے ہیں۔ قرآن پاک کی آیات پر یقین رکھتے ہیں، اس سے پہلی تمام کتب الٰہیہ کے حروف پر یقین رکھتے ہیں، یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے یہ کہہ دینا کہ قیامت ہی پر یقین رکھنا چاہیے اور کسی پر نہیں، کس درجہ کی غیرت رکھنے والے انسان کا کام ہو سکتا ہے؟

(۲) کس نے کہا ہے کہ فقط عیسائی اور مسلمان ہی خدا کی راہ پر ہیں اور کس نے کہا ہے کہ ان میں کوئی گناہ گار نہیں۔ یہ کیا طریقہ ہے کہ جھوٹ بولنے پر کمر باندھی ہے۔ ان آیات مبارکہ میں جن پر پنڈت جی اعتراض کر رہے ہیں عیسائی یا نصرانی کا لفظ تک نہیں، اپنے دل سے افترا تراشنا اور خود اس پر اعتراض کرنا پنڈت جی اور وید ک دھرم کی راستی کا نمونہ ہے۔

(۳) قرآن پاک میں یہ کہاں ہے کہ جو بدکار ہیں، وہ نجات پائیں گے۔ پنڈت صاحب اعتراض کیا کر رہے ہیں، سراسر جھوٹ بول رہے ہیں اور اسی سے صاحب نظر قرآن پاک کی حقانیت اور ان کی بے عیبی کا پتا چلا سکتا ہے کہ دشمن معاند غایت کوشش

کر کے تھک جاتا ہے اور اس بے عیب کتاب میں کوئی قابل گرفت بات اس کو ہاتھ نہیں آتی۔ مجبوراً اپنے دل کا غیظ نکالنے کے لیے جھوٹے افتراؤں اور بہتانوں پر اتر پڑتا ہے اور خلق خدا کے سامنے اپنے اعتراض ہی سے روسیاہ ہو جاتا ہے۔

بے شک قرآن پاک پر ایمان لانے والے نجات پائیں گے۔ قرآن پاک وہ کتاب ہے جو بدکاری کی اصل و بنیاد کو از بیخ برکندہ کرتی ہے اور نکوکاری اور راست بازی کے اصول و آئین بتاتی ہے۔ اس پر ایمان لانے والے کا کمال یہ ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کا متقی و پرہیزگار ہو نہ کہ بدکار زشت کار۔ مومن گناہ گار بھی اپنے اعمال کی سزا پا کر بالآخر نجات پائے گا کیونکہ کوئی بدی جو شرک یا کفر کی حد تک نہ پہنچی ہو، نیکیوں کو ضائع اور پامال نہیں کر سکتی۔ جب بدی کی سزا جھیل چکا تو ایمان و طاعت کی جزا سے محروم کرنا مقتضائے حکمت سے نہیں ہے لیکن اس بحر حکمت پر بے چارے پنڈت کا دماغ کب پہنچتا ہے؟

(۴) پنڈت جی کا یہ کہنا کہ جو لوگ مسلمانی مذہب کو نہیں مانتے انھیں کو کافر کہنا یکطرفہ ڈگری ہے۔ نہایت بعید از عقل اور قابل مضحکہ بات ہے۔ اس کی مثال یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی جھوٹا کہے کہ جو لوگ سچ نہیں بولتے ہیں انھیں تو جھوٹا کہنا یکطرفہ ڈگری ہے۔ جیسا اس قول کا قائل خارج از عقل سمجھا جائے گا وہی مرتبہ پنڈت جی کے قول کا بھی ہے۔

جب اسلام ذات و صفات الٰہی کے علوم راست بازی، نیکو کاری، دین و دیانت، صدق و امانت کے اصول اور آئین پیش کرتا ہے تو اس کے انکار کرنے والے کو راستی کا منکر نہ کہا جائے گا تو کیا کہا جائے گا؟ اگر شپر (چمگادڑ) کی یہ شکایت بجا ہو کہ اس کو دن کا اندھا کیوں کہا جاتا ہے تو پنڈت جی کی شکایت بھی کچھ سننے کے قابل ہو سکتی ہے، لیکن وہ اس سے زیادہ تاریکی میں ہیں۔ اگر کافر کا لفظ ان کو ناگوار ہے تو وہ عقائد افعال کفریہ سے کیوں نہ اجتناب کریں؟ کیوں نہ اسلام کے سامنے سرنیاز جھکائیں پھر ہم انھیں کافر نہیں مسلم کہیں گے۔

(۵) پنڈت صاحب لکھتے ہیں: اگر خدا ہی نے ان کے دل اور کانوں پر مہر لگائی ہے اور اسی وجہ سے وہ گناہ کرتے ہیں تو ان کا کچھ قصور نہیں ہے۔ یہ قصور خدا کا بھی ہے۔

ایسی صورت میں ان کو سکھ دکھ یا گناہ و ثواب نہیں ہو سکتا۔

پنڈت صاحب کی ورزیدہ علامتی اور بد زبانی ملاحظہ فرمایئے۔ پروردگار عالم کی شان میں کیا لفظ لکھے ہیں اور کیسی مسلمانوں کی دل آزاری کی ہے' ان کا دل عناد و عداوت سے کس قدر لبریز ہے اور جوش غضب میں وہ کتنے آپے سے باہر ہیں۔ اسی سے ان کے اعتراض کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔ پنڈت صاحب میں اتنی بھی تو استعداد نہیں کہ وہ معمولی انسانوں کا کلام سمجھ لیں۔ ذوق اور غالب کے اشعار جو بیشتر سرمایہ تخیل ہیں' پنڈت صاحب کی فہم رسا سے بالاتر ہیں۔ پھر وہ پنڈت صاحب قرآن پاک کے دقائق حکمیہ اور علوم الہیہ کو کس کے دماغ سے سمجھیں؟ نافہمی جو کچھ کہلائے وہ نہ کہیں تو کیا کہیں۔

لطف یہ ہے کہ پنڈت صاحب خود اس آیت کریمہ کے پورے مصداق ہیں جس پر انہوں نے زبان اعتراض کھولی ہے۔ اب اعتراض کی لغویت ملاحظہ ہو:

پنڈت صاحب کی بے ایمانی قرآن پاک نے تو یہ بیان فرمائی: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ○ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ یعنی جن لوگوں نے کفر کیا اور جو کافر ہو گئے ان کے حق میں انذار و عدم انذار برابر ہے۔ وہ ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ ان کی حالت کا بیان ہے کہ وہ کفر جیسے قبیح و شنیع جرم میں اس قدر راسخ و پختہ ہوں گے کہ اب ان کے حق میں وعظ و پند' تذکیر و تعلیم' انذار و تخویف تک موثر نہیں اور ان کا ایمان لانا اور کفر سے باز آنا بالکل غیر متوقع بلکہ عدم ایمان یقینی ہے۔ جب ان کا بغاوت و تمرد اس مرتبہ تک پہنچا تو ان کی سزا یہ ہے کہ "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ۔" (الآیہ) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر فرما دی۔

پنڈت صاحب کی بے ایمانی یہ ہے کہ انہوں نے اعتراض کرنے کے لیے قرآن پاک کے بیان کو الٹا سمجھا اور یہ لکھا کہ خدا ہی نے ان کے دل اور کانوں پر مہر لگائی ہے اور اسی وجہ سے وہ گناہ کرتے ہیں' تو ان کا کچھ بھی قصور نہیں۔ باوجودیکہ قرآن پاک میں اس کے بالکل برعکس ہے' مہر کرنا ان کے کفر و بغاوت کی سزا ہے نہ کہ اشاعت

کفر۔

یہ تھی پنڈت صاحب کے اعتراض کی حقیقت۔ کتنی سیاہ باطنی ہے کہ ایک الزام دینے کے لیے مضمون کو بالکل برعکس کر دیا جائے۔ سزائے جرم کو علت جرم بنایا جائے جس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ زید کا ہاتھ سڑ گیا تھا اور کسی کام کا نہ رہا تھا اس لیے ڈاکٹر نے کاٹ ڈالا اس پر پنڈت صاحب اعتراض کریں کہ اس میں ہاتھ کا کیا قصور ہے۔ قصور تو ڈاکٹر صاحب کا ہے کہ جب انہوں نے کاٹ ڈالا وہ کام کیا کرتا۔ ایسے پنڈت صاحب کا یہی جواب ہے کہ انہیں دماغ درست ہونے کے لیے کسی ڈاکٹر کے سپرد کر دیا جائے۔

ردی کاغذ ہمیشہ چاک کیے جاتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چاک ہو جانے سے وہ ردی ہو گئے' بلکہ نکمے ہونے ہی کی وجہ سے ان کو چاک کیا گیا۔

قرآن پاک نے اس آیت کریمہ میں خلق افعال کا نہایت نازک اور باریک مسئلہ بیان فرمایا جس کی بحث بہت بسط چاہتی ہے اور پنڈت صاحب اور ان کے امثال کے مدارک سے بالاتر اور بہت بالاتر ہے' اس لیے اس کا بیان ضروری نہیں معلوم ہوتا مگر اس میں کوئی خفا اور حجاب نہیں ہے کہ بندہ مباشرت اسباب کرتا ہے۔ قدرت اس پر نتائج مرتب فرماتی ہے' نتیجہ نہ بندہ کا مقدور ہے نہ اس کے اختیار کو یہاں تک رسائی۔ عالم اکوان پر نظر ڈالیے تو موجودات خارجیہ کی کمترین ہستیاں بھی اپنے تغیرات احوال کے لغات میں حضرت قادر مطلق کی قدرت کاملہ کی شہادت دے رہی ہیں۔

ایک بیمار بد پرہیزی کرتا ہے اور لذائذ و مرغوبات سے دست کش نہیں ہوتا' مرض کے خطرہ کو خیال میں نہیں لاتا۔ لیکن جرم کا مرتکب ہوتا ہے' قدرتِ الٰہیہ ہلاکت ومایوسی کا نتیجہ اس پر مرتب فرمادیتی ہے۔

ایک ہندو فقیر ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا لیتا ہے اور عرصہ دراز تک حرکت اور کام موقوف کرکے قسمت خدا کی ناشکری کرتا ہے تو قدرت اس ہاتھ پر ناکارہ ہونے کی مہر لگا دیتی ہے اور باقی زندگی کے لیے حس و حرکت کے قویٰ اس سے سلب کر دیتی ہے۔ اب یہ ہاتھ ایک درخت کی سوکھی شاخ کی طرح تر و تازہ بدن میں ایک بدنما کانٹا بن جاتا ہے۔

ناشکری و ناسپاسی نعمت خدا کی بے قدری تو سادھو کا فعل تھا' لیکن اس ہاتھ کو خشک اور نکما کر دینا اور کام کی قابلیت بھی سلب فرما دینا قدرت کی طرف سے اس گناہ کی سزا ہے۔ اگر عقل ہو تو آدمی خیال کر سکتا ہے کہ جو قدرت ہاتھ کو اس کے فرائض و خدمات سے روکنے پر اس کے افعال و قویٰ کے بطلان سے سزا دیتی ہے اس قدرت کا یہ مقتضی اور بھی قابلِ استعجاب و استبعاد نہیں کہ قلب کو اس کی خدمات سے روکنے اور معطل کر دینے کے جرم میں اس پر مہر لگا دی۔

ㅇ ㅇ ㅇ
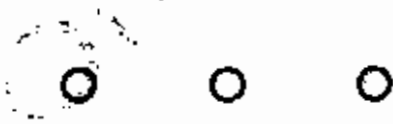
اعتراض: ان کے دلوں میں بیماری ہے' اللہ نے ان کی بیماری بڑھا دی بھلا بلا قصور خدا نے ان کی بیماری بڑھا دی' رحم نہ آیا۔ ان بیماروں کو بڑی تکلیف ہوئی ہو گی' کیا یہ شیطان سے بڑھ کر شیطانیت کا کام نہیں ہے؟ کسی کے دل پر مہر لگانا' کسی کی بیماری بڑھانا خدا کا کام نہیں ہو سکتا کیونکہ بیماری کا بڑھانا اپنے گناہوں کا نتیجہ ہے۔

جواب: بدزبانی اور دل آزاری تو پنڈت صاحب کی طبیعت ثانیہ ہے اور ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی ذخیرہ نہیں مگر آپ کی فہم و فراست قابلِ داد ہے۔ رُوحانی اور قلبی امراض کو آپ جسمانی اور بدنی بیماری سمجھے' اس سمجھ پر پتھر پڑیں:

جو اتنا بھی نہ سمجھا وہ تو اس بُت کو خدا سمجھے

قرآن پاک نے فرمایا تھا: "فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ" ان کے دلوں میں مرض ہے' دل کا مرض کفر و نفاق' ناخدا شناسی ہے۔ پنڈت جی اپنی کمال ذہانت سے سوزاک و آتشک جانے کس چیز کو دل کا مرض سمجھتے ہیں۔

جو سیدھی بات کہتا ہوں تو وہ الٹی سمجھتا ہے
حماقت ہو گئی ہے ایسی طبع شوخ بدظن میں

قلبی امراض کو بدنی امراض سمجھ جانا ایسا بھونڈا پن اور کوڑ مغزی ہے جس کی نظیر سوائے پنڈت صاحب کے اور کسی میں تلاش کرنا سعی بے حاصل ہو گا جو دماغ اتنا سمجھنے

کی بھی قابلیت نہ رکھے وہ اعتراض کے لیے منہ کھولے تو بجز اس کے کیا کہا جائے:

ہیکلے بہر شکارے اسدے آمدہ ہست

مرض کی حقیقت خاص انسانی اعتدال سے خروج ہے، اگر بدنی اعضاء کے افعال خارج از اعتدال ہو جائیں تو بدنی مرض ہے۔ اسی طرح اگر قلبی یا رُوحانی اعتدال سے خروج ہو تو رُوح قلب کی بیماری ہے۔

خدا کو نہ پہچاننا اس کی عظمت و کبریائی وحدانیت و یکتائی اور اس کے رسولوں اور کتابوں کا انکار سب سے بڑا قلبی و رُوحانی مرض ہے جس کا قرآن پاک میں ذکر ہے۔ اوپر کی آیت میں ارشاد فرمایا: "وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ۔" یعنی اگرچہ منافقین براہ فریب کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روز جزا پر ایمان لے آئے۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ وہ مومنین نہیں ہیں، ان کے دلوں میں بیماری ہے، اوپر سے ان کی بے ایمانی اور نفاق کا تذکرہ ہے۔ بے وقوف آدمی بھی ہوتا تو اس قرینہ واضح سے سمجھ جاتا۔ مرض قلبی سے روحانی بیماری کفر و نفاق مراد ہے جو انسان کی ہستی کو ناکارہ اور فاسد کر دیتی ہے مگر پنڈت صاحب سے عقل و فہم اتنی ہی دور ہے جتنا زمین سے آسمان، بلکہ اس سے بھی زیادہ، مگر بات یہ ہے کہ پنڈت صاحب معذور ہیں، اس لیے کہ اس مرض کے وہ خود بھی مریض اور ان کا روح و قلب کفری تاریکیوں سے سیاہ ہو رہا ہے۔ انہیں کہاں اتنا ادراک باقی تھا کہ وہ بات کو سمجھ لیتے۔

بہر حال! پنڈت صاحب کا اعتراض ان کے اختلال حواس کی تصویر ہے۔ بس اس پر سمند رناز کو ایک اور تازیانہ یہ ہوا کہ بنائے فاسد پر تعمیر فاسد اعتراض کرنے بیٹھے تو یہ جھوٹ بولا کہ بلا قصور خدا نے ان کی بیماری بڑھا دی باوجودیکہ اسی آیت میں موجود ہے "وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ" کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے، اس سبب سے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار و اس کی تکذیب کرتے تھے۔ انکار و تکذیب بھی قصور نہ ہو تو پھر کیا چیز قصور ہو سکتی ہے۔

اب آیت شریفہ کا مطلب سمجھئے:

جن لوگوں نے اپنے مالک و خالق جل و علا تبارک و تعالیٰ کی ذات و صفات و وحدت

و یکتائی کا علم حاصل نہ کیا اور جن کے قلوب اپنے مال کار کے ادراک سے قاصر رہے اور جنہوں نے کتب الہیہ اور مرسلین کی تکذیب کی جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے مبعوث تھے، وہ بیمار ہیں ان کے قلب مریض ہیں۔

جب کوئی عضو مریض ہوتا ہے تو اپنے افعال کو مجرائے طبعی پر جاری نہیں رکھ سکتا۔ آنکھ بیمار ہوتی ہے تو روشنی کا دیکھنا جو اس کا طبعی فعل اور فرض خاص ہے اس کو دشوار اور تکلیف دہ ہو جاتا ہے تو جب ہم دیکھیں کہ آنکھ اپنا کام نہیں کرتی تو ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ مریض ہے۔

کان کا کام سننا ہے اگر کان اصوات کا کام چھوڑ دے تو ہم یقین کریں گے کہ وہ بیمار ہے۔ زبان کا فرض چکھنا ہے اگر وہ ذائقہ نہ دریافت کر سکے تو ہم حکم کریں گے کہ وہ مریض ہے۔ اسی طرح قلب کا کام اور فرض خاص معرفت حق ہے اگر وہ اس کو انجام نہ دے تو جزم کیا جائے گا کہ اس میں بیماری ہے۔ اسی وجہ سے جن لوگوں نے معارف الہیہ اور اسرار ربانیہ کی تکذیب کی اور سرگرم انکار ہوئے، معلوم ہوا کہ ان کا قلب بیمار ہے۔ جب تو وہ اس چیز کو جو قلب کی زندگی ہے بجائے محبوب رکھنے کے مبغوض رکھتے ہیں اور بجائے سرنیاز جھکانے کے زبان انکار کھولتے ہیں۔ اس حکمت کو وہی جان سکتا ہے جو حقیقی رہنما ہے۔ اس لیے قرآن پاک نے بیان فرمایا: "فی قلوبھم مرض" کہ ان کے دلوں میں بیماری ہے جو انہیں حق تک پہنچنے سے مانع ہے اور جو قرآن پاک جیسے الٰہی فرمان کے انکار پر ان کو برانگیختہ کر رہی ہے لیکن قرآن پاک تو رحمت ہے۔

مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند

اگر چاند کی سی دل ربا روشنی سے کتے بھونکیں تو چاند کو پرواہ نہ کرنا چاہیے، وہ اپنے دلدادگانِ جمال کی آنکھیں روشن کرے۔ اگر چند بیمار قلب قرآن پاک کی تکذیب کریں تو کیا قرآن پاک کا نزول پھر مانع ہو جانا چاہیے۔ وہ اپنے شیدایانِ حسن کی دل نوازی نہ فرمائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا رہا جتنا قرآن پاک کا انکار کیا گیا اتنا ہی وہ دلوں پر اثر انداز ہوتا رہا۔

○ ○ ○

اعتراض ۱۷: جس نے تمہارے واسطے زمین کو بچھونا اور آسمان کی چھت بنائی۔

(منزل اول سورہ البقرہ آیت ۲۲)

محقق (نادان) بھلا آسمان چھت کسی کی ہو سکتی ہے۔ یہ جہالت کی بات ہے' آسمان کو چھت کی مانند تمسخر کی بات ہے' اگر کسی اور کرۂ زمین کو آسمان مانتے ہوں تو ان کے گھر کی بات ہے۔

جواب: یہ اعتراض ہے یا اپنے حمق کا اظہار جو چیز محیط ہو سر پر نظر آئے' اسی کو چھت کہتے ہیں یا چھت کا اور کوئی مفہوم ہے۔ محض انکار کیا وقعت رکھتا ہے؟ آسمان کی چھت ہونے پر کون استحالہ ہے کون محال لازم آتا ہے جو پنڈت جی اس قدر رد کرے' جہالت کی تو یہ بات ہے کہ ایسی نفیس تعبیر پر نافہمی کے ساتھ زبان طعن کھولی جائے' مسخرہ تو وہ معترض ہے جو بے دلیل عناداً و تعصباً انکار کرتا ہے' آپ کو ابھی زبان دانی اور رندانہ سخن سے شناسائی نہیں ہے اور آپ کا دماغ فصحاء ایسی تعبیروں سے اپنے کلام کو زینت دیتے ہیں اور آشنایاں علم و ہنر اس سے لطف حاصل کرتے ہیں۔ اردو کا ایک شعر ہے جو شاعر کی خوش بیانی اور شیریں کلامی کا ثبوت ہے' گو پنڈت صاحب کو اس کے لطف سخن کا ذوق نہ ہو مگر اہل نظر تو نتیجہ نکالیں گے اس امید پر میں وہ شعر پیش کرتا ہوں۔

خدا دراز کرے عمر چرخ نیلی کی
کہ بے کسوں کے مزاروں کا شامیانہ ہوا

محاورہ اور زبان کے جاننے والے فصاحت و خوش بیانی کے ماہر تو اس شعر سے لذت حاصل کریں گے' مگر پنڈت جی جنہوں نے وید کی گپ چپوں کے سوا اور کچھ دیکھا ہی نہیں۔ یہ شعر سن کر نہایت پریشان ہو جائیں گے کہ آسمان شامیانہ کیونکر بن گیا لیکن کسی شے کا کمال پنڈت جی کی بد فہمی سے میلا اور عیب دار نہیں ہو سکتا۔

یہ اعتراض تو خود ہی پنڈت جی کی ہوشمندی اور لیاقت کا ثبوت ہے مگر اس کا اخیر جملہ اور عجیب تر ہے' فرماتے ہیں: "اگر کسی اور کرۂ زمین کو آسمان مانتے ہوں تو اور بات ہے۔" اب کہئے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا مسخرگی ہو سکتی ہے' زمین کے کتنے کرے پنڈت جی کو ثابت ہو گئے یا کوئی خواب دیکھا یا طبقات الارض کو اپنے محاورے میں کرۂ

زمین سے تعبیر کیا؟ اگر ایسا ہے تو اس کا چھت ہونا کیونکر متصور۔ غرض بات وہ ہے جو کسی پہلو پر درست نہیں بیٹھتی اور اس کا کوئی محمل صحیح نہیں نکلتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پنڈت جی کو سنسکرت میں تو کوئی علمی بات نظر نہ آئی۔ یورپ کے فلاسفہ کے اوہام دیکھ کر آپ کی آنکھیں چندھیا گئیں اور چونچے کے مینڈک کی طرح تالے کو سمندر سمجھ گئے۔ اور جھٹ پٹ ان خشک فلسفیوں کی کج دماغیوں اور پریشان خیالوں پر ایمان لا کر اس کو حقیقت واقعیہ اعتقاد کرنے لگے۔ فلسفی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ حقائق اشیاء کا جیسا کہ وہ نفس الامر میں ہیں، عارف ہو بلکہ فلاسفہ حقائق اشیاء میں غور کرتے ہیں اور جس کے ادراک میں عقل بھی عاجز ہے، وہاں وہم سے کام لیتے ہیں تو لامحالہ ان کو بیشتر اور اکثر کواذب اور اباطیل کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں باہم اختلافات ہیں۔ حقیقت تک رسائی ان کے قبضہ و اختیار میں نہیں۔ عالم میں کسی ایک شے کی حقیقت فلاسفہ کو یقینی اور قطعی طور پر مکشوف نہیں ہوئے "انہم الا یظنون" خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں۔

فلسفہ کی حقیقت اسی قسم کے چند انسانوں کے اوہام و خیالات ہیں۔ اس پر ایمان لے آنا اور اس کو یقینی اور نفس الامری حقیقت خیال کرنا بالکل غلط ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فلسفی کسی چیز کی نسبت ایک رائے قائم کرتا ہے، دلائل لاتا ہے، مدتوں اس پر اڑا رہتا ہے، زمانہ سے اس پر جنگ و جدل کیا کرتا ہے، اپنے خیال میں اپنے آپ کو سچا اور اپنے مقابل کو بے علم و جاہل جانتا ہے لیکن زمانہ دراز گزرنے کے بعد اس کو کچھ ایسے وجوہ مل جاتے ہیں جن کی بناء پر وہ اپنی پچھلی رائے سے ہٹ جاتا ہے اور اب اس کا شدت سے مخالف ہو جاتا ہے۔ اتنی حقیقت رکھنے والے فلسفہ پر مغرور ہونا اسی شخص کا کام ہے جس کی آنکھیں علوم الٰہیہ کے انوار سے بالکل محروم ہوں، دور سے مسافر کو ایک سوار نظر آتا ہے، اس پر وہ اپنے رفقاء سے استفسار کرتا ہے کہ یہ کیا شے ہے؟ نظر گو اتنی دور پہنچتی ہے مگر امتیاز سے قاصر ہے۔ لامحالہ اس وقت وہم سے مدد لی جاتی ہے اور جو صورت وہ سامنے لا کر حاضر کرتا ہے وہ ہی رائے قرار دے دی جاتی ہے۔ لیکن قریب پہنچ کر پتا چلتا ہے کہ وہم کے مخترعات جھوٹے اور باطل تھے، آسمان تک نظر تو

پہنچتی ہے اور اتنا بتاتی ہے کہ وہ کوئی شے موجود اور محسوس و مبصر ہے لیکن اس کی کیا حقیقت ہے' یہ بتانا نظر کا کام نہیں ہے۔ کوئی باخبر ملے تو اس سے دریافت ہو سکتا ہے اور جنہیں ایسا موقع ملا کہ انھوں نے خبرداروں سے دریافت کیا' وہ جانتے ہیں لیکن جنہیں بدقسمتی سے ایسا موقع میسر نہیں ہے وہ' بجز اس کے کہ اٹکل اور تخمینہ سے کام لیں' وہم کے گھوڑے دوڑائیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ آپ فلاسفہ کو دیکھئے تو اس مسئلہ میں نہایت مضطرب اور باہم مختلف ہیں۔ ایک کہتے ہیں کہ فلک جسم ہے اور متحرک ہے اور حرکت اس کی مستدیر ہے اور دائمہ ہے اور اس میں خرق و التیام ممکن نہیں ہے۔ دوسرے کہتے ہیں کہ وہ کوئی جسم نہیں آنکھوں ہی کا قصور ہے' نظر ہی کی خطا ہے' یہ دونوں اندھوں والے ہاتھی کی طرح باہم لڑ جھگڑ رہے ہیں۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

کسی کو بھی یہ خبر نہیں کہ واقعہ کیا ہے' آسمان جسم ہے یا نہیں اور ہے تو کیسا ہے؟ اپنی اٹکلیں لڑا رہے ہیں اور باہم لڑ رہے ہیں۔ پنڈت صاحب کے کان میں کبھی یہ افسانہ پڑ گیا ہو گا کہ بعض فلسفی کہتے ہیں کہ آسمان کوئی جسم نہیں کوئی چیز نہیں' نظر اپنے منتہا پر جا کر رک جاتی ہے تو ساون کے اندھے کی طرح اسے ہرا ہرا یا نیلا ہی نیلا سوجھا کرتا ہے۔ یہ عجیب و غریب سی بات اگرچہ شہادت حس کے خلاف اور عقل سے بعید تھی لیکن پنڈت صاحب نے عجیب سمجھ کر فوراً ہی تو اس کا اعتقاد کر لیا اور جھٹ قرآن پاک پر اعتراض کر ڈالا کہ ہیں آسمان چھت کیسے ہو سکتا ہے یعنی وہ تو کوئی شے ہی نہیں۔ اول تو یہ اعتقاد ہی سراسر جہل ہے اور جاننے والے کو نہ جاننے والے کا الزام دینا اس سے بڑھ کر حمق' اور فرض کرو تو چھت کے ساتھ تعبیر کرنے پر کیا اعتراض۔ پنڈت صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ محاورات کی بناء عرف پر ہوتی ہے نہ حقیقت پر۔

پنڈت جی سے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے گنا کھا لیا تو وہ مبہوت ہو جائیں گے کہ کھوئی اس سے کیونکر نچی ہو گی اور حلق سے کیونکر اتری ہو گی۔ اس لیے کہ گنا کھانا تو حقیقت میں جب ہی ہو سکتا ہے کہ جب یہ سب چیزیں کھائی جائیں۔ عرف کا تو ان کی نظر میں کوئی اعتبار ہی نہیں۔ غرض پنڈت جی کا اعتراض کسی توجیہ و تاویل سے

کسی معنی اور مطلب سے درست نہیں ہوتا۔

پنڈت جی آسمان کے جسم ہونے کا انکار کس منہ سے کریں گے وہ تو ایشور کے لیے ہی جسم مانتے ہیں۔ اپنے خدا کو بھی مجسم ٹھہراتے ہیں' اسی ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۱۱ میں لکھتے ہیں:

"آپ (پرمیشور) ہم لوگوں کو محفوظ کر کے راحت بخش کاموں میں ہمیشہ لگائے رکھئے کیونکہ آپ ہی سرور و عافیت مجسم ہیں۔"

پنڈت جی کے نزدیک سرور بھی مجسم ہوتا ہے اور مجسم ہو کر خدا ہو جاتا ہے۔ اس عقل کا آدمی آسمان کا جسم نہ مانے تو کیا بعید ہے۔

اسی ستیارتھ کے صفحے میں ایشور کی اس طرح تعریف کرتے ہیں کہ آفتاب وغیرہ روشن چیزوں کا بطور رحم جائے کے پیدائش و قیام ہے۔

صفحہ ۱۲ میں فرماتے ہیں: "جس طرح گولر کے پھل میں کیڑے پیدا ہو کر اسی میں رہتے اور فنا ہو جاتے ہیں اسی طرح پرمیشور کے اندر تمام جہان کی حالت ہے۔"

کیوں پنڈت جی پرمیشور جسم ہوا کہ نہیں اور رحم سے تشبیہ دینا یہ تو آپ کا غایت ہی درجہ کا ادب ہے یا جس کو دنیا آسمان کہتی ہے اس کو آپ پرمیشور سمجھ بیٹھے ہیں لیکن پھر بھی اعتراض کیونکر ٹھیک ہو۔ گولر کے پھل والے کیڑے کے لیے آپ گولر کی اندرونی سطح جو اس کے بہر کی جانب ہے' ضرور چھت ہے۔ جب آپ نے اس کائنات کے لیے ایک ایسی محیط چیز تسلیم کر لی تو چھت ماننے سے کیا انکار۔ فرق اتنا ہے کہ ہم اسے آسمان کہتے ہیں' خدا کی مخلوق مانتے ہیں' آپ اسی کو ایشور سمجھتے ہیں۔

ستیارتھ صفحہ ۱۳ میں ہے: "جو تمام دنیا کو ہر جگہ نمودار کر رہا ہے' وہ آکاش ہے چونکہ پرماتما تمام اطراف سے دنیا کو نمودار کرنے والا ہے' اس لیے اس پرماتما کا نام آکاش ہے۔"

کہئے اب تو آپ نے آکاش ہی کو پرماتما اور ایشور مان لیا۔ شاید آپ کے گھبرانے کی یہی وجہ ہو کہ آسمان کو چھت کہہ دیا' یہ کیا غضب ہوا کہ پرمیشور چھت بنا جاتا ہے۔

○ ○ ○

اعتراض: ۶ اگر تم اس کلام سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے پیغمبر کے اوپر اتارا تو اس کی سی ایک سورت بنا لاؤ اور شاہدوں اپنے کو پکارو سوائے اللہ کے اگر ہو تم سچے پھر اگر نہ کرو اور البتہ نہ کر سکو گے۲۴ اس آگ سے ڈرو کہ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر اور جو تیار کیے گئے ہیں واسطے کافروں کے۔ (منزل اول سپارہ اول سورۃ البقرہ آیت ۲۴-۲۵)

محقق نادان بھلا یہ کوئی بات ہے کہ اس کی مانند کوئی سورہ نہ بنے۔ کیا اکبر بادشاہ کے زمانہ میں مولوی فیضی نے بے نقط قرآن نہیں بنا لیا تھا۔ وہ کونسی دوزخ کی آگ ہے؟ کیا اس دنیا کی آگ سے نہ ڈرنا چاہیے۔ اس آگ میں جو کچھ پڑے وہ اس کا ایندھن ہے جیسے قرآن میں لکھا ہے کہ کافروں کے واسطے دوزخ کی آگ تیار کی گئی ہے۔ ویسے پرانوں میں لکھا ہے کہ ملیچھوں کے لیے گھور نرک بنا ہے۔ اب کہئے کس کی بات سچی ہے؟

اپنے اپنے قول سے تو دونوں بہشت میں جانے والے اور ایک دوسرے کے مذہب کی رو سے دونوں دوزخی ہوتے ہیں۔ پس ان سب کا جھگڑا جھوٹا ہے۔ ہاں! جو دھارک ہیں وہ سکھ اور جو پاپی ہیں وہ سب مذہبوں میں دکھ پائیں گے۔ (ستیارتھ صفحہ ۴۴۳)

جواب: اب تو پنڈت جی رو دیئے کہ بھلا یہ کوئی بات ہے اس کی مانند کوئی سورہ نہ بنے، جی ہاں! پنڈت جی بات تو یہی ہے کہ جس نے ساری بے دینوں کی بات کھوئی یہ قرآن پاک کا وہ اعلان ہے جس نے عدنان و قحطان کے فصحاء و بلغاء کی زبانیں بند کر دیں، عربی زبان میں اوروں کی ہمتیں توڑ دیں۔

سرزمین عرب کے مدعیانِ فصاحت و مغرورانِ زبان دانی شرمندہ و سرنگوں ہو گئے۔

قرآن پاک نے کن بلند آہنگیوں کے ساتھ دعوے کیے، کتنی غیرتیں دلائیں مگر کوئی ہاتھ نہ تھا جو قلم اٹھا سکتا، کوئی زبان نہ تھی جو حرکت کر سکتی۔ اس ایک اعلان کے سامنے تمام عالم میں سناٹا ہو گیا۔ جس کمال کو قرآن پاک کی صدق و حقانیت کی دلیل بنائی گئی تھی، اس کے انکار میں کوئی زبان نہ کھلی، اس کے مقابلہ کے لیے کوئی تیار نہ ہوا۔

آج تیرہ سو برس سے زیادہ گزر چکے ہیں، عرب کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں

نہیں عالم کے برو بحر میں سطوح ارض اور فضائے ہوا میں ہر معمورہ اور آبادی میں ہر قریہ اور بستی میں دنیا کے ذرہ ذرہ کے کان میں یہ آواز پہنچ چکی ہے کہ قرآن جیسا کوئی نہیں بنا سکتا اور سورۂ قرآنیہ کی مثل ایک چھوٹی سی سورہ بھی نہیں لا سکتا۔ آج ترقی کا دور ہے' مشرق میں بیٹھا ہوا آدمی مغرب والوں سے تار کے کھٹکے پر بات کرتا ہے۔ بجلیوں سے گاڑیاں چلاتا ہے' مہینوں کے راستے گھنٹوں میں طے کرتا ہے' ہوا میں اڑا پھرتا ہے۔ روز مرہ اپنی صنعت و حرفت اور اپنے کمالات کو عالم انسانی نہایت آب و تاب کے ساتھ پیش کرتا رہتا ہے۔ ہوا میں پیدا ہو کر مٹ جانے والی صوتی کائنات ریکارڈوں میں محفوظ کر دی جاتی ہیں۔ لب و لہجہ اور آوازوں کے اتار چڑھاؤ اور حروف کے مخارج وصفات کلموں کے اوزان اور موسیقی خصائص ایک رکابی میں حاصل کر لیے جاتے ہیں۔ آج پچھلے صناعوں کی صنعت کو شرمایا جاتا ہے اور ہر صاحب فن کو اس کے فن میں شکست دی جاتی ہے۔ سب کچھ ہوتا ہے اور دنیا سب کچھ کرتی ہے مگر قرآن پاک جیسی ایک صورت نہ بن سکی' نہ سکتی ہے۔ یہاں انسانی قدرت معترف قصور ہے' یہاں تک بشری طاقت کی رسائی نہیں۔

تیرہ سو برس کے زبان داں عاجز رہے ہر قرن اور زمانہ میں مدعیان کمال اور زبان دانی کے صاحب کمالوں نے عرق ریزیاں کیں' محنتیں اٹھائیں مگر نتیجہ یہی ہوا کہ انہوں نے اس کلام پاک کی علو و برتری کے سامنے دعوے اور غرور کے سر عجز و نیاز کی خاک پر رکھے۔ کبر و تعلی کی پیشانیاں اعتراف قصور کی زمینوں پر رگڑیں اور کلام پاک کی بے مثالی کا نقش ان کے قلب میں گھر کر گیا۔ پنڈت جی نے ہر طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ قرآن پاک کے اس دعوے کے خضور کوئی سر بھی اٹھ سکا' کوئی زبان حرکت میں آئی' کسی قلم نے بھی جنبش کی مگر پنڈت صاحب کو ہر طرف عالم خموشاں ہی نظر آیا۔ جہاں سنسان تھا' کسی کے منہ میں زبان تھی' نہ زبان میں حرکت' نہ کسی ہاتھ میں قلم رہا' نہ قلم میں جنبش۔ اب پنڈت جی حیران رہ گئے اور اس سراسیمگی اور بے چارگی کی حالت میں انہوں نے شیخ فیض کی تفسیر کو بے نقط قرآن کہہ کر اپنے بھولے اور مورکھ دوستوں اور معتقدوں کو مغالطہ دینے کی کوشش کی مگر یہ وہی ناکام و بے سود کوشش ہے

جو ہر مجبور و لاچار سے مضطربانہ سرزد ہوا کرتی ہے اور جو بازیچہ اطفال میں بھی مضحکہ انگیز حمق سمجھی جاتی ہے۔ شیخ فیضی "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھنے والا' قرآن پاک کے حرف حرف پر مٹنے اور جان فدا کرنے والا' اس کے کتاب الٰہی ہونے کا معتقد' اس کی بے مثالی کا دلدادہ' اس کے بیان حسن پر زبان کھولتا ہے اور بے نقط عبارت میں اس کی تفسیر کر کے یہ دکھاتا ہے کہ زبان دانی کا ایسا بڑا ماہر قرآن پاک کی فصاحت کے حضور سرا فگندہ ہے۔ یہ تو قرآن پاک کے دعوے کے ثبوت میں ایک اور تائید تھی جس کو پنڈت جی نے براہ چالاکی مغالطہ معتقدین کی غرض سے مقابلہ قرآن پاک قرار دے کر شیخ فیضی پر بہتان کیا۔

شیخ مذکور نے کہا اور کس جگہ اشارہ اور کنایہ میں اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنی عبارت کو قرآن پاک کے مقابلہ کے لیے پیش کر رہا ہے۔ یہ تو بڑی بات ہے یہی ثابت کیجیے کہ اس کے وہم و خیال میں بھی کبھی گزرا کہ اس کی عبارت کو نظم قرآنی سے کوئی ادنیٰ نسبت بھی ہے اور جب یہ ثابت نہ کر سکے تو ہزار تف اس پر جو حق واضح کے انکار کے لیے بہتان اٹھائے۔ فیضی نے جیسی تفسیر لکھی' اس میں یہ دعویٰ اس کو نہیں پہنچتا کہ ویسی عبارت ہر کوئی نہیں لکھ سکتا۔ آج بھی بفضل اللہ القدیر علماء میں بہت سے نفوس ایسے موجود ہیں جو ویسی اور اس سے بہتر عبارت لکھ سکتے ہیں۔ ابھی پنڈت جی کو علمائے اسلام کے کمالات علمیہ کی خبر نہیں۔ بے نقط عبارت سے بڑھ کر مشکل ترین کام انجام دینے والے منقلب اور منقوط عبارتیں لکھنے والے ایک سلسلہ نظم میں نو نو مختلف علوم کی کتابیں لکھنے والے جس کے علم و فضل اہل کمال کو حیرت میں ڈالتے ہیں۔ قرآن پاک کے وفاق کو سمجھنے سے عاجز ہیں۔

پنڈت جی جو عربی کا ایک حرف نہیں جانتے اور علم سے محض کورے اور نابلد ہیں' وہ بے چارے کیا جان سکتے ہیں کہ فیضی کی عبارت اور زبان دانی کس درجہ کی ہے اور اس کو قرآن پاک سے کوئی نسبت بھی ہے یا نہیں۔ مگر اتنا دیکھنا تھا کہ فیضی اور اس کے بعد آج تک یہ وہم بھی کیا کہ فیضی کی یہ عبارت قرآن پاک کے حضور پیش کرنے کے قابل ہو سکتی ہے بلکہ صراحتاً دیکھ رہے ہیں کہ پنڈت جی کو حیران کرنے والی عبارت

لکھ کر بھی فیضی قرآن پاک کو کلام الٰہی اور معجز مانتا ہے اور یقین کامل رکھتا ہے کہ مقدرت انسانی اور حیطۂ قدرت بشری سے خارج ہے کہ ایک سطر بھی اس کے مقابل لکھ سکے، بلکہ جتنا بڑا عالم ہے، اتنی ہی اس پر عظمت قرانی اور منکشف ہے اور وہ قرآن پاک کے اس اعجاز کا بہت زیادہ ماننے والا اور اس عقیدت میں بہت راسخ اور کامل ہے۔

فیضی تو کیا چیز ہے عرب کے شہرۂ آفاق فصحاء جن کی فصاحت و بلاغت کے سکے بیٹھے ہوئے تھے، سرنگوں ہو گئے اور تعلیوں کی گرم بازاریاں سرد پڑ گئیں۔ ان کو عملاً اعتراف کرنا پڑا کہ قرآن پاک جیسی کتاب تو کیا معنی اس کی ایسی ایک چھوٹی سی سورت بھی کوئی نہیں بنا سکتا۔

اب یہ حقیقت ایسی بدیہی ہو گئی ہے جس میں صرف اسی شخص کو تامل ہو سکتا ہے جس کو روز روشن میں نصف النہار کے وقت آفتاب کی روشنی میں شبہ ہو۔ تیرہ سو برس تک کے تمام عربی و عجمی ماہرانِ زبان کا عاجز رہنا ایسا نہیں ہے جیسا وید کو تمام علوم کا سرچشمہ بتا دینا۔ ریل اور تار اور ہوائی جہاز جو نئی چیز نظر آئی، سب وید ہی میں سے نکلی۔ یہ پنڈت جی کا دعویٰ ہے اور پنڈت جی واقف ہیں کہ ان کا دعویٰ وید پر خالص اتہام ہے۔ وہ ہر دعویٰ کو اپنے ہی دعوے پر قیاس کرتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ وہ انکار ہدایت جیسی شرمناک قباحت کے مرتکب ہوئے، ورنہ قرآن پاک کا دعویٰ آج اس قدر جلی، بین، واضح، روشن، ظاہر ہے کہ اس کو کسی دلیل و برہان کی حاجت نہیں اور وہ خود ایک زبردست، محکم قطعی، یقینی برہان ہے۔

پنڈت جی کہتے ہیں وہ کونسی دوزخ کی آگ ہے اس دنیا کی آگ سے نہ ڈرنا چاہیے، اس آگ میں بھی جو کچھ پڑے وہ اس کا ایندھن ہے۔

جواب: قرآن پاک میں ارشاد ہوا تھا:

اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔	اگر تم شک میں ہو اس چیز سے جو ہم نے اپنے بندے (سید کائنات سرور انبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمائی ہے اور تمہیں یہ وہم ہو کہ یہ کتاب اللہ کی

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ۔

کتاب نہیں، بندے کی بنائی ہوئی ہے تو بندے کی بنائی ہوئی جو چیز ہوتی ہے، ضرور دوسرا اس جیسی بنا سکتا ہے، اس لیے تمام منکرین کو عام اعلان دیا جاتا ہے کہ اس کی مثل ایک سورت بنالاؤ اور مدد کے لیے اپنے شہداء کو بھی ساتھ کر لو (یعنی ان تمام معبودوں کو بھی شریک کر لو جنہیں خدا کے سوا پوجتے ہو) اگر تم سچے ہو اور تمہارا یہ وہم باطل کچھ بھی حقیقت یا جان رکھتا ہے) تو اگر تم ایسا نہ کر سکو اور یقیناً تم نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر (بت) ہیں جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

○ قرآن پاک میں اس کتاب مقدس کے کلام الٰہی ہونے کی کیسی دل پذیر اور خاطر نشین اور اطمینان دلانے والی قطعی یقینی برہان پیش فرمائی گئی۔ جب دنگل میں کھڑا ہو کر چیلنج شیرافگن بہادروں کے مجمع اور جمگھٹ میں ایک شخص تمام زور آوروں اور نبرد آزماؤں کو خطاب کر کے للکارتا ہے اور باواز بلند اعلانِ عام کے ساتھ کہتا ہے کہ آج کوئی نہیں ہے جو اس اکھاڑہ میں میرے مقابل آسکے اور اس کے دعویٰ کرتے ہی گردن فراز دلیروں کی نگاہیں جھپ جاتی ہیں اور وہ سرنگوں ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، کسی میں حس و حرکت کا نام و نشان باقی نہیں رہتا اور وہ برابر اپنے دعوے کی تکرار کیے جاتا اور اپنا مقابل مانگے چلا جاتا ہے، لیکن کسی طرف سے کوئی پہلوان جرأت نہیں کرتا۔ مجمع منتظر ہے کہ اس شخص کو جھوٹا کرنے کے لیے کوئی تو اٹھے مگر لاکھوں دلوں کی پگڑی چھوڑ بیٹھے اور حیرت کے پتلے بن گئے۔ یہ منظر دیکھ کر ہر شخص اس یقین پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کے مقابلہ کی تاب ان میں سے کسی میں نہ تھی اور کسی شخص کو اس حقیقت میں شبہ باقی نہیں رہتا بشرطیکہ پنڈت جی کے ایسے ذہن و دماغ والا آدمی وہاں موجود نہ ہو۔

خلاصہ: یہ کہ قرآن پاک ایسی واضح برہان سن کر بھی پنڈت صاحب الجھ گئے اور اپنے دماغ کے قابل اور علم و استعداد کے لائق فرمایا تو کیا فرمایا کہ وہ کونسی دوزخ کی آگ ہے' کیا اس دنیا کی آگ سے نہ ڈرنا چاہیے۔

یہ کتنا عاقلانہ سوال ہے۔ کیا پنڈت جی کو اس آگ کے چھو کر یا ٹٹول کر دیکھنے کی ضرورت تھی۔ وہ ضرورت تو اب انشاء اللہ باقی نہ رہی ہوگی مگر جس وقت انہوں نے فرمایا تھا اس وقت اس بات کا منہ سے نکالنا ان کی تاریکی قلب کا پتا دیتا ہے۔ ایک شخص سے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم فلاں جرم کے مرتکب ہوئے تو تم کو جزیرۂ انڈیمن کو ہاتھ سے چھو کر، ٹٹول کر، آنکھ سے دیکھ کر معلوم کرلے تو اس کی یہ ہوس کس قدر عقل سے دور ہے۔ جزیرۂ انڈیمن کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کے ہاتھ میں تھما دی جائے اور وہ اسے چھو کر دبا کر دیکھ سکے اور اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ جزیرہ انڈیمن کے حالات بیان کیے جائیں تو جہنم کی آگ کے حالات جا بجا قرآن پاک میں موجود ہیں اور خود اس آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ وہ آگ جس کا ایندھن آدمی اور بت ہیں اور جو کافروں اور منکروں کی سزا کے لیے تیار کی گئی ہے۔ یہ سن کر پھر یہ پوچھنا کہ وہ کونسی آگ ہے نہایت گہری جہالت ہے پھر یہ کہنا کیا اس دنیا کی آگ سے نہ ڈرنا چاہیے' سخن فہمی کی منازل سے کس قدر دور ہے۔

ایک شخص کو تنبیہہ کی جاتی ہے اور جرم و خطا سے بچانے کے لیے راہ راست اور صراط مستقیم پر لانے میں پوری پوری کوشش کی جاتی ہے اور اس سے منحرف ہونے کی تقدیر پر اس کو اس جرم کی سزا سے ڈرایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر تو اپنے افعال سے باز نہ آیا تو تجھ کو جیل خانہ کی تنہائیوں اور چکیوں سے ڈرنا چاہیے جو چوروں اور بدمعاشوں کے لیے تیار کی گئی ہیں۔ کیا اس نصیحت سے اس کو فائدہ اٹھا کر اپنے افعال درست کرنا چاہئیں یا پنڈت جی کی طرح یہ کہہ دینا چاہیے کہ کیا یہاں کی تنہائیوں اور چکیوں سے نہ ڈرنا چاہیے۔ اس مجرم کا یہ جواب جس قدر نامعقول اور بے ہودہ ہوگا اس سے بدرجہا بدتر پنڈت جی کا جواب ہے۔

پنڈت جی کو ہنوز دنیا اور آخرت کی آگ میں فرق نہیں معلوم ہوا۔ یہاں کی آگ

ہمارے اسباب آسائش میں سے ایک چیز ہے جس کو ہم اپنے اختیار سے جب تک اور جتنا چاہتے ہیں، استعمال میں لاتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں سرد کر دیتے ہیں، اپنی غذائیں پکانے اور حمام گرم کرنے کی اس سے خدمتیں لیتے ہیں اور دوزخ کی آگ نہ ہمارے قبضہ کی نہ اختیار کی، بلکہ وہ عذاب الہی ہے جو کافروں اور گناہگاروں پر مسلط کیا گیا ہے نہ وہ اس کو بجھا سکتے ہیں نہ اس کی تیزی بند کر سکتے ہیں۔ وہ آگ ان کے کام میں نہیں آتی۔ ان کی کوئی خدمت انجام نہیں دیتی بلکہ آخرت کی آگ کافروں کو عذاب الہی کی ایسی تکلیف پہنچاتی ہے جو بیان میں نہیں آ سکتی۔ وہ تکلیف نہ ان کے ٹالے ٹل سکتی ہے نہ اس سے کہیں بھاگ سکتے ہیں، نہ ان کے جھوٹے معبود ان کو اس سے بچا سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے باطل معبود بھی اسی آگ کا ایندھن بنائے جائیں گے اس آگ سے دنیا کی آگ کا مقابلہ کتنی عقل مندی ہے۔ سبحان اللہ! یہ عقل اور اعتراض۔

پنڈت جی لکھتے ہیں جیسے قرآن میں لکھا ہے کافروں کے واسطے دوزخ کی آگ تیار کی گئی ویسے ہی پرانوں میں لکھا ہے کہ ملیچھوں کے لیے گھور نرک بنا ہے، اب کہئے کس کی بات سچی مانیں، اپنے اپنے قول سے تو دونوں بہشت میں جانے والے اور ایک دوسرے کے مذہب کی رو سے دونوں دوزخی ہوتے ہیں۔ پس ان سب کا جھگڑا جھوٹا ہے۔

پنڈت جی اگر کچھ لکھے پڑھے ہوتے تو ان سے دریافت کیا جاتا کہ قرآن پاک کی تکذیب کے لیے کس قسم کی برہان چاہیے، کیا ایک شخص کے دعویٰ کرنے سے یا نقال کے نقل اتارنے سے دوسرے شخص کا دعویٰ اور اصل جھوٹے ہو جاتے ہیں۔

اگر ایک زمین کی نسبت ایک شخص رجسٹری شدہ دستاویز کی رو سے دعویٰ کرے کہ میں اس کا مالک ہوں، اس کے مقابلہ میں دوسرا شخص بالکل بلاسند مدعی بن جائے تو کیا اس سے دستاویز والے کا دعویٰ جھوٹا ہو جائے گا بلکہ اس سے بڑھ کر یوں فرض کیجئے کہ ایک شخص دعویٰ کر رہا ہے اور ہنوز اس نے اپنے اس دعوے کا کوئی ثبوت بھی پیش نہیں کیا ہے، دوسرا شخص اسی طرح اس کے مقابلہ میں دعویٰ کرنے لگا تو کیا وید کا فلسفہ ان دونوں کو جھوٹا قرار دے گا۔ کاش! پنڈت جی کسی دلیل یا کچہری کے اہلکار کی صحبت

میں کوئی رزتذ رہے ہوتے تو شاید ان کی زبان سے ایسے لغویات نہ نکلتے اور اس ندامت سے بچ سکتے۔

قرآن پاک کا دعویٰ عالم کو عاجز کر دینے والے دلائل و براہین سے ثابت ہے۔ اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے کا بے سند دعویٰ کر بیٹھنا اس کے مدعا کو کیا ضرر پہنچا سکتا ہے۔ پنڈت جی شوق اعتراض میں عقل و خرد سے قطع تعلق کر کے جوش میں آتا ہے، کہہ گزرتے ہیں اور مآل کار کی طرف ان کا وہم بھی نہیں جاتا۔ یہ کند چھری جو آپ نے تیز کر کے رکھی تھی اس سے تو دشمن کا تو بال بھی نہ ٹیڑھا ہوا مگر ان کی اپنی گردن کٹ گئی۔

ایک طرف تو پنڈت جی وید مت کی سچائی کے قائل ہیں، دوسری طرف گرونانک کہانی بتا رہے ہیں تو پنڈت جی کے قاعدہ سے دونوں جھوٹے۔ ایک طرف پنڈت جی سناتن دھرمیوں کو جھوٹا کہہ رہے ہیں اور ان کے رد میں ستیارتھ پرکاش کے ورق کے ورق انہوں نے کالے کر ڈالے، دوسری طرف سناتن دھرمی پنڈت جی کی مخالفت میں سرگرم ہیں۔ پنڈت جی کے قاعدہ سے دونوں جھوٹے ہیں اور لطف یہ کہ پنڈت جی کا جھوٹا ہونا خود ان کے قول اور قرار سے لازم آتا ہے۔ یہ ہے قرآن پاک پر اعتراض کرنے کا نقد نتیجہ۔

ایک نابینا کہہ سکتا ہے کہ زید کہہ رہا ہے کہ آفتاب نکل آیا، بکر انکار کرتا ہے، میں کس کی مانوں۔ اس تحیر میں نابینا ہی رہ سکتا ہے کہ کون سچا ہے، بینا جسے خدا نے آنکھیں دی ہیں، وہ متردد نہ رہے گا اس کی آنکھیں خود فیصلہ کر دیں گی کہ کون سچا ہے۔

جب دونوں طرف مدعی ہوں تو آنکھ والا دلیل کو دیکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے۔ صرف اندھا متردد رہ سکتا ہے اور قرآن پاک کی تو یہ زبردست دلیل ہے کہ اندھا بھی اگر مسلوب العقل یا مغلوب العناد نہ ہو تو اس کی حقانیت کے یقین تک بے تردد پہنچ جاتا ہے لیکن پنڈت جی کی حالت اس اندھے سے بھی بدتر ہے کیونکہ اندھے کو صرف یہی تردد ہے کہ زید سچا ہے یا بکر ایسی حماقت اس نے بھی نہیں کی کہ دونوں کو جھوٹا بتا دے۔ یہ کام پنڈت جی کی لیاقت کا تھا۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند

پنڈت جی لکھتے ہیں کہ "ہاں جو دھارک ہیں، وہ سکھ اور جو پاپی ہیں وہ سب مذہبوں میں دکھ ہی پائیں گے۔"

جواب: پنڈت جی کی عبارت کا صاف مطلب یہ ہے کہ دکھ اور سکھ، رنج و راحت، تکلیف و آسائش یعنی جزا اور سزا کا دارومدار سب نیک چلنی اور بد چلنی یعنی صرف عمل پر ہے۔ ان کے خیال میں اچھے کام کرنے والا خواہ کوئی مذہب رکھتا ہو، سکھ ہی پائے گا۔ اس کو تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ برے کام کرنے والا خواہ کوئی مذہب رکھتا ہو، تکلیف ہی پائے گا اس کو راحت نہیں مل سکتی تو مذہب نہ تکلیف سے بچا سکتا ہے، نہ راحت پہنچا سکتا ہے، نہ اس کے ذریعے سے مصیبت ٹل سکتی ہے، نہ راحت مل سکتی ہے تو وہ ہے کس مرض کی دوا اور کس بیماری کا علاج۔ اب کس منہ سے آپ آریہ مذہب کی تبلیغ کریں گے اور دنیا کو اس کی دعوت دیں گے جب خود آپ کے نزدیک مذہب کوئی مفید چیز نہیں۔ آپ کے نزدیک بدکار آریہ سکھ نہیں پاتا اور دکھ سے نہیں بچ سکتا اور نیک مسلمان سکھ پائے گا اور دکھ سے محفوظ رہے گا تو پھر دنیا کا کوئی شخص کیوں آریہ ہو۔ ویدک دھرم کے قبول کرنے کا ثمرہ کیا۔

پنڈت جی نے اپنے جملوں میں تو مذہب کا خاتمہ کر دیا۔ آریوں کو آنکھیں کھولنا چاہئیں اور سوچنا چاہیے کہ جب ویدک دھرم انہیں نجات نہیں دلا سکتا تو وہ کس غرض کے لیے آریہ ہیں۔ عقل و خرد سے کام لیں اور اس دین حق کے سامنے گردن جھکائیں جو نجات کا وعدہ دیتا اور مغفرت کی بشارت سناتا ہے۔ جس کا یہ ارشاد ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا۔

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، فردوس کی جنتیں ان کی مہمانی ہیں۔ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور ان سے جگہ بدلنا نہ چاہیں گے۔

اس آیت مبارکہ میں ایمانداروں اور نیک کرداروں کو جنات فردوس میں دوام عیش و راحت کی بشارت دی گئی ہے۔

آریو! کیوں اس مذہب کی قید و بند میں گرفتار ہو جو شمہ بھر راحت کا وعدہ نہیں دیتا، جو کسی تکلیف و مصیبت سے خلاصی نہیں دلا سکتا۔ جہاں عفو و مغفرت کرم و احسان کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔

پنڈت جی نے راستہ صاف کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ نیک سب مذہبوں میں آرام اور بد سب مذہبوں میں تکلیف پائیں گے، اگر تم پنڈت جی کو سچا جانتے ہو تو مذہب کی قید سے آزاد ہو جاؤ۔ ویدک دھرم سے ہاتھ اٹھاؤ، اس کے پرچار میں لاکھوں روپیہ مت برباد کرو۔ دوسرے مذہب والوں کے ساتھ خونخوارانہ غیظ و غضب کا برتاؤ کر کے پاپی نہ بنو۔ پنڈت دیانند پر مذہب کی یہ حقیقت کھلی ہے کہ وہ اصلاً فائدہ نہیں پہنچا سکتا تو پھر تم کیوں مذہب کے پھندہ میں پھنس رہے ہو؟ آؤ، آؤ! اسلام کے وسیع خوانِ کرم پر آؤ جہاں خلو و راحت اور دوام و عیش کا مژدہ ہے اور عفو و مغفرت اور رحمت و کرم کے وعدے ہیں۔ نجات کی ذمہ داری اور بخشش کی کفالت ہے۔

پنڈت جی لکھتے ہیں: "اور خوشخبری دے ان لوگوں کو جو کہ ایمان لائے اور کام کیے اچھے یہ کہ واسطے ان کے بہشتیں ہیں، چلتی ہیں ان کے نیچے نہریں جب دیئے جائیں گے اس میں سے میووں کا رزق، کہیں گے یہ چیزیں ہیں جو ہم کو پہلے دی گئی تھیں اور واسطے ان کے بیویاں ہیں ستھری اور ہمیشہ ہے وہاں ان کا رہنا۔"

محقق بھلا اس قرآن کی بہشت میں دنیا سے بڑھ کر کون سی عمدہ شے ہے جو چیزیں دنیا میں ہیں، وہی مسلمانوں کی بہشت میں ہیں اور اتنی زیادتی ہے کہ یہاں جیسے آدمی مرتے اور پیدا ہوتے اور آتے جاتے ہیں اس طرح بہشت میں نہیں مگر یہاں عورتیں ہمیشہ نہیں رہتیں اور وہاں بیبیاں ہمیشہ رہتی ہیں۔ جب تک قیامت کی رات نہ آئے گی تب تک ان بے چاریوں کے دن کس طرح گزرتے ہوں گے؟ ہاں! اگر خدا کی ان پر مہربانی ہوتی ہوگی اور خدا ہی کے سہارے وقت گزارتی ہوں گی۔ یہی ٹھیک ہو سکتا ہے مسلمانوں کا بہشت گوکلئے گسائیون کے گولوک اور مندر کی طرح معلوم ہوتا ہے جہاں کہ عورتوں کی عزت بہت ہے، مردوں کی نہیں۔ اسی طرح خدا کے گھر میں عورتوں کی قدر بہت ہے اور ان سے خدا کی محبت بھی مردوں کی نسبت زیادہ تر ہے کیونکہ خدا کی

مرضی بہشت میں کیونکر ٹھہر سکتی ہے۔ اگر یہ بات ایسی ہی ہے تو خدا بھی عورتوں میں غلطاں ہے۔

جواب: پنڈت جی نے اپنا نام محقق رکھا ہے جس قوم کے محقق کی یہ حالت ہو اس کے عوام کا کہنا ہی کیا۔ آپ کی تہذیب و انسانیت کا نمونہ آپ کی مسطورہ بالا عبارت میں موجود ہے۔ کوئی بازاری بدلگام بھی خدا کی شان میں ایسے بے ہودہ کلمات زبان سے نکالنا گوارا نہ کرے گا۔ پنڈت جی کے دھرم نے انہیں یہی تہذیب سکھائی ہے اور وہ اسی شائستگی کا علم لے کر اٹھے ہیں۔ قرآن پاک کی جس آیت پر آپ بہت بگڑ رہے ہیں، اس میں ایمانداروں کو جنت اور نعمائے آخرت کا مژدہ دیا گیا ہے۔

یہ رشک و حسد آپ کو آپے سے باہر کر رہا ہے جب آپ نے دیکھا کہ اسلام نے اپنے حلقہ بگوشوں کو دوام عیش اور خلود و راحت اور بے شمار و بے قیاس نعمتوں کی بشارت دے کر مطمئن کر دیا اور ویدک دھرم کچھ دے نہیں سکتا تو اب آپ کے پاس بجز اس کے اور کیا چارہ تھا کہ منہ چڑانے لگے، کھسیانے آدمی ہمیشہ منہ چڑایا کرتے ہیں مگر اس سے وہ اپنا ہی منہ بگاڑ لیتے ہیں۔

آپ کا یہ اعتراض "بھلا اس قرآن کی بہشت میں دنیا سے بڑھ کر کونسی عمدہ شے ہے؟" جب کچھ کہنے کے قابل ہوتا جب آپ وید بہشت کی دس بیس افضل نعمتیں شمار کراتے اور پھر مقابلہ میں قرآنی بہشت کی نعمتوں کو دریافت کرتے مگر وید کے پاس تو بہشت ہی نہیں، وہاں سے آپ بجز بہشت اور کچھ پا ہی نہیں سکتے۔ وید کی یہ ناداری دیکھ کر آپ کو شرما جانا چاہیے تھا مگر آپ نے زبان درازی شروع کر دی۔

وہاں تو دنیوی نعمتوں کے برابر بھی کچھ ملنے کی امید نہیں وہاں آپ کو متوقع کیا جاتا ہے تو بلی، بندر، کتا، سور، گائے، بیل، مکھی، مچھر بننے پڑ، اس کے مقابلہ میں قرآنی بہشت کی نعمتیں آپ کو بے قدر معلوم ہو رہی ہیں بھر یہ کہہ دینا کہ "قرآن کی بہشت میں دنیا سے بڑھ کر کونسی عمدہ شے ہے" مکمل جہالت کا پتا دیتا ہے اگر کسی دیہاتی کا بد عقل لڑکا یہ کہے کہ ہم میں اور بادشاہ میں کیا فرق ہے؟ ہم بھی مکان میں رہتے ہیں وہ بھی مکان میں رہتا ہے، ہمارے مکان میں بھی روشنی ہوتی ہے اس کے مکان میں بھی روشنی ہے،

ہمارے مکان میں بھی درخت ہیں اس کے یہاں بھی ہیں، یہی گاؤں کی چیزیں سب وہاں ہیں اور کونسی نئی چیز ہے اور وہ لڑکا محض گھر اور مکان کا لفظ کہے جانے سے اپنے جھونپڑہ میں اور ایوان شاہی میں فرق نہ کرے تو جس قدر خبطی اور بدعقل کہا جائے گا وہ بدرجہا اس سے کم ہے جو پنڈت جی کی حالت ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ پنڈت جی نے اپنے احوال پر نظر نہ کی ان کے مذہب میں ان کا ایشور کسی بڑے سے بڑے اپنے پرستار کو کیا جزا دے سکتا ہے یہی کہ ایک جون سے نکال کر دوسری جون میں پہنچا دے۔ وہاں ان دنیوی نعمتوں کے سوا اور کونسی نعمت ہوتی ہے بلکہ اگر کہیں حسن عمل کے صلہ میں وہ جون ملی جو ہندوؤں کے عقیدہ میں سب سے زیادہ محترم ہے اور جس کے لیے وہ دنیا میں جھگڑا، فساد، قتل، خونخواری کرتے رہتے ہیں اور لاکھوں روپے اس کی رکھشا میں ضائع کرتے ہیں اور ہزارہا آدمی اپنی پوری زندگی کو اسی دھن میں صرف کر ڈالنا بہترین نیکی خیال کرتے ہیں۔ یعنی گائے کی جون تو اتنا اضافہ ہو جائے گا کہ آپ کے گلہ میں رسی ہوگی، کھونٹے سے بندھے ہوں گے، بچہ الگ بندھا ہوگا۔ ظالم ہندو اس کے منہ سے آپ کا تھن چھڑا کر اس کا حق چھین کر ڈکوس جاتے ہوں گے اور اس ظالمانہ فعل سے ناراض ہو کر اگر کبھی لات چلا دی تو وہی گئو رکھشا کرنے والا لٹھ سے خبر لیتا ہوگا اور جب دودھ کی عمر گزر چکتی ہوگی تو وہی رکھشا کے مدعی قصائی کے ہاتھ بیچ آتے ہوں گے، کھال کے جوتے بنائے جاتے ہوں گے اور یہ تمام عزت جس کا نظیر پنڈت جی کے خیال میں دنیا میں نہیں ہے جب ہی مل سکتی ہے جبکہ آپ کو اپنے عمل کی پاداش میں مادہ کی جون ملی ہو اور اگر کہیں قسمت سے نر کی جون میں آئیے تو بدھیا کیے گئے، کندھے پر جوا رکھا گیا، دن بھر ہل میں جتے پھرے آروں سے لہولہان کر دیئے گئے۔ ان نعمتوں کے غرور پر آپ کو جنت کی نعمتیں بے اصل معلوم ہو رہی ہیں اور دین جزا کے مقابل اس بے مثل جزا پر لب کشائی کا یارہ ہے اور اگر آپ فرض موہوم مکتی کو جنتیوں کی نعمتوں کے مقابل ذکر کیجئے تو اس کی حقیقت بھی دیکھ لینی چاہیے کہ وہاں کیا سر و سامان ہے اور وہ کن نعمتوں کے بعد میسر آتی ہے۔ مکتی کن باتوں سے حاصل ہوتی ہے۔

اس کے متعلق پنڈت دیانند پرکاش ص ۳۱۱ میں لکھتے ہیں:

"پرمیشور کا حکم بجا لانے سے ادھرم (بد مذہبی) اودھیا (بے علمی) بد صحبت، بد تاثیرات اور بد عادت کے پرہیز سے راست گوئی، رفاہ دیگران، ودھیا (علم) اور بے رو رعایت پرارتھنا (مناجات) اور اپاسنا (عبادت) یعنی یوگ کی مشق کرنے سے علم کے پڑھانے پڑھنے اور دھرم سے کوشش کر کے دھیان کو ترقی دینے سے سب سے عمدہ دھن (کامیابی کے ذریعے) کو کام میں لانے سے جو کچھ کیا جائے وہ سب بے رو رعایت انصاف اور دھرم کے مطابق ہی کیا جائے۔ ایسی ایسی تدبیروں سے مکتی ہوتی ہے۔"

پنڈت جی کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتی صرف اس شخص کو میسر آ سکتی ہے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو، کبھی پرمیشور کے حکم کے خلاف نہ چلا ہو، ہمیشہ عبادت و علم کے شغل میں مشغول رہا ہو، جو کچھ کیا ہو بے رعایت انصاف سے کیا ہو، دوسروں کی رفاہ، خیر خواہی اور راست گوئی میں کمی نہ کی ہو، بروں کی صحبت میں کبھی نہ بیٹھا ہو تو ان صفات کا آدمی میں نہیں سمجھ سکتا کہ پنڈت جی صدہا سال میں بھی اپنے مذہب میں سے تلاش کر سکتے ہوں۔ خود ان کے جیون چرتر یعنی سوانح زندگی پر نظر ڈالنے سے وہ بھی اس کے اہل نہیں معلوم ہوتے۔ انہوں نے دوسروں کی بہت دل آزاریاں کی ہیں۔ خود اس ستیارتھ پرکاش میں مسلمانوں، عیسائیوں، ہندوؤں کا بہت دل دکھایا ہے۔ بہت سے غلط الزام لگائے ہیں تو یہ مکتی انہیں بھی میسر نہ آ سکی تو کون آریہ اس کا مستحق ہو سکے گا اور کون سا انسان پنڈت جی ایسا تلاش کریں گے جس نے کوئی کام رو رعایت سے بھی نہ کیا ہو۔ برے کی صحبت میں بھی نہ بیٹھا ہو تو یہ دل خوش کن وعدہ کسی کے حق میں بھی پورا ہونے والا نہیں اور آپ کی موہوم مکتی کسی کو بھی میسر نہیں آ سکتی۔

دنیا میں جانداروں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور اس میں بہت نمایاں ترقی ہے، اگر کچھ روحیں مکتی پا جایا کرتیں تو جانداروں کی تعداد گھٹنے لگتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مکتی کوئی نہیں پاتا۔

اس سے بھی قطع نظر کیجئے اس موہوم مکتی میں کیا ہے اور وہ مکتی خانہ کتنا طویل و عریض اور کیسا وسیع و عالیشان ہے اور اس میں کتنے آدمیوں کی آسائش کی جگہ رکھی گئی ہے اور وہاں وہ کیا کیا نعمتیں پاتے ہیں اور کتنا عرصہ ان نعمتوں سے سرفراز ہونے کے

لیے انھیں دیا جاتا ہے۔ تمام زندگی کا لمحہ لمحہ پرمیشور کی اطاعت پر قربان کر کے جس مکتی خانہ میں پہنچتے ہیں وہاں سے بغیر کسی قصور یا خطا کے نکال دیئے جاتے ہیں یا نہیں۔ یہ سب باتیں بھی لحاظ میں دیکھنے کے قابل ہیں۔ مکتی میں جیو کہاں رہتا ہے' اس کے متعلق پنڈت جی فرماتے "برہم میں" ستیارتھ ص ۲۱۱ میں' اس سوال کے جواب میں کہ مکتی کی حالت میں جیو کہاں رہتا ہے؟ پنڈت جی کہتے ہیں: "سکھ کو پاتے ہیں اور برہم میں رہتے ہیں۔" برہم پنڈت جی کی زبان میں ایشور یا خدا کو رکھتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ان کے عقیدہ میں ایشور کوئی صندوقچہ یا کوٹھڑی یا مکان یا ہوٹل یا سرائے ہے جس میں جیو رہتے ہیں اور اس کو ان کے رہنے کی جگہ بتایا ہے۔

چنانچہ اسی ستیارتھ پرکاش کے ص ۲۱۳ میں لکھتے ہیں:

"لائق دیدار پرمیشور میں قیام کر کے مکتی کے سکھ کو بھوگتے ہیں۔"

اور کچھ سطر آگے لکھتے ہیں:

"اور مکت جیو جسم کثیف کو چھوڑ کر جسم ارادی سے آکاش کے اندر پرمیشور میں پھرتے ہیں۔"

ان عبارتوں کو دیکھ کر ایک ناظر کیا سمجھ سکے گا کہ نجات کے بعد روح کی قیام گاہ کہاں ہے؟ جب تک کہ اسے یقین نہ دلایا جائے کہ پرمیشور خود ایک سٹیشن یا مسافر خانہ ہے اس کے اندر روحوں کو ٹھہرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس سے ایک تو پرمیشور کی قدر و عافیت معلوم ہوئی جن کے اندر ہمیشہ ہی دھکا پیل رہتی ہے اور روحوں کے دخول و خروج سے ان کے شکم کو کم فرصت ملتی ہے' دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ پرمیشور کے اندر بھی مکت ہو کر روح کو اسی آکاش کے احاطہ میں مقید ہونا پڑتا ہے۔ اس سے آپ کے مکتی خانہ کی وسعت بھی معلوم ہوئی۔

اب ذرا پنڈت صاحب غور فرمائیں کہ مکتی خانہ کونسی نئی جگہ ہوئی' روح جس کو وہ اپنی زبان میں جیو کہتے ہیں' مکتی سے پہلے بھی اسی آکاش کے احاطہ اور ایشور کے پیٹ میں تھا جیسا کہ خود پنڈت جی نے اسی ستیارتھ ص ۲۱۳ میں لکھا ہے: "جس طرح گولر کے پھل میں کیڑے پیدا ہو کر اسی میں رہتے اور فنا ہو جاتے ہیں' اسی طرح پرمیشور کے اندر

تمام جہان کی حالت ہے۔"

اب پنڈت دیانند یا ان کے قابل جانشین اس عقدہ کو حل کریں کہ مکتی خانہ کونسی نئی جگہ ہے جس کا اتنی بے شمار قربانیوں کے بعد جیو کو مژدہ سنایا گیا تھا اور جس کو ستیارتھ کے ص ۳۱۱ اور ص ۳۱۲ میں پنڈت جی نے برہم اور پرمیشور بتایا اور ص ۳۱۰ میں یہ لکھا کہ تمام دنیا پرمیشور کے اندر رہتی ہے تو جیو کو مکتی سے کونسی جگہ ملی اور وہ مکتی خانہ جس کے غرور میں جنت کی نعمتوں پر آوازے کسے جا رہے تھے، کدھر گیا اور یہ تشبیہ تو پرمیشور کی شان کے بہت ہی لائق ہے کہ وہ گولر کے پھل کی طرح سے ہے اور تمام جہاں بالخصوص آریے گولر کے کیڑوں کی طرح" اس سے ایشور کی قدر و منزلت بھی خوب ظاہر ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ناخدا شناسوں کو خدا شناسی کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔

ما قدروا اللّٰہ حق قدرہ۔ انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسی کہ اس کی قدر کا حق ہے۔

وہ کبھی آکاش (آسمان) کو ایشور سمجھتے ہیں، جیسا کہ پنڈت جی نے ستیارتھ ننکا ص ۲۱۰ میں لکھا ہے: "جو تمام دنیا کو ہر جگہ نمودار کر رہا ہے، وہ آکاش ہے چونکہ پرماتما تمام اطراف سے دنیا کو نمودار کرنے والا ہے اس لیے اس پرماتما کا نام آکاش ہے۔"

کبھی پرتھوی (زمین) کو پرمیشور سمجھ جاتے ہیں جیسا کہ ستیارتھ ص ۲۱۳ میں ہے: "جو تمام دنیا کو پھیلا رہا ہے وہ پرتھوی ہے۔"

غرضیکہ حیرت و تردد میں ہیں اور خدا کی ذات و صفات کے متعلق کوئی علم اور خبر نہیں رکھتے۔ "ان ھم الا یظنون۔" انہی بے ادراکی کا یہ نتیجہ ہے کہ خدا کو جائے قیام ہی ٹھہرا دیا۔ بہت اچھا اب آپ کے طور پر مکتی خانہ تو ایشور کا پیٹ رہا اس کی وسعت بھی ملاحظہ کی جائے کس قدر تو آریوں کے اعتقاد میں وہ کچھ ایسا زیادہ وسیع بھی نہیں ہے، بلکہ وہ اتنا ہی سا ہے کہ جو روحیں وہاں پہنچتی ہیں اگر وہ وہاں سے نکال دی جائیں تو وہاں بہت بھیڑ بھاڑ ہو جائے اور گنجائش نہ رہے۔

چنانچہ پنڈت دیانند ستیارتھ کے ص ۲۱۵ میں لکھتے ہیں: "نیز مکتی کے مقام پر بہت بھیڑ بھاڑ ہو جائے گی کیونکہ آریہ زیادہ اور نکاس کچھ بھی نہ ہونے کی وجہ سے وہاں کا

زیادتی کا کچھ وارپار نہیں رہے گا۔"

اب اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتی خانہ ایک قفس تنگ اور چھوٹے پنجرہ کی طرح ہے، اب تو ایشور بھی ناپ گئے، ان کا بھی پیمانہ معلوم ہو گیا کیونکہ وہی جناب تو مکتی خانہ ہیں۔ دنیا میں انسانوں کے عیش کے لیے بڑے بڑے وسیع مکان، کوٹھیاں، باغ، سیرگاہیں، کھیل کے میدان ہیں اور وہ بڑی فراغت کے ساتھ ان میں عیش کرتے ہیں، انہیں کبھی بھی بھیڑ بھاڑ کی تکلیف نہیں ہوتی تو اگر ایشور کے پیٹ کا دور دنیا کی برابر بھی ہوتا تو وہاں پنڈت جی بھیڑ کی شکایت نہ کرتے۔ اس بھیڑ بھاڑ کے اندیشہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایشور میں دنیا کی برابر بھی گنجائش نہیں، لیکن ستیارتھ کے ص ۱۴ میں پنڈت جی نے کہا ہے: "پرمیشور سب کو اپنے اندر رکھتا ہے اور تمام جہان کو مثل کیڑوں کے پرمیشور کے اندر رہتا ہے۔"

یہ بات حیرت میں ڈالتی ہے کہ جب ایشور میں دنیا کے برابر بھی وسعت نہیں تو تمام جہان اس میں کیسے سما گیا اور جب تمام جہاں سما گئے اور کچھ بھیڑ بھاڑ نہ ہوئی تو مکتی کے وقت بھیڑ بھاڑ کیسی۔ یہ آریوں کے فاضل پیشوا کا وہ کلام ہے جو کسی پہلو پر درست نہیں اور جو ہر طرح ایک مضحکہ انگیز تمسخر ہے۔ یہ مکتی خانہ جس کے پانے کے لیے وہ محنتیں وہ قربانیاں درکار، جن کا انسان سے ادا ہی ہونا مشکل اس کا یہ حال ہے کہ وہاں بھیڑ بھاڑ کا اندیشہ ہے۔ اس میں راحت ہی کیا ہوئی اور اس کو جزا کون عقل مند کہے گا؟ وہ تو اچھا خاصا جیل بلکہ بلیک ہول (کال کوٹھری) ہے جس پر آریہ چاہے جتنا ناز کرلیں اور انہوں نے خود بھی اقرار کیا ہے کہ مکتی خانہ ایک بار ہے اور واقعی سزایاب مجرم کے لیے جیل خانہ بار ہوتا ہے، چنانچہ پنڈت دیانند ستیارتھ کے ص ۲۱۷ میں تحریر فرماتے ہیں:

"جس قدر کوئی بوجھ اٹھا سکتا ہے اسی قدر اس پر رکھنا عقل مندوں کا کام ہے جیسے ایک من بوجھ اٹھا سکنے والے کے اوپر دس من رکھنے سے بوجھ رکھنے والے کی برائی ہوا کرتی ہے، ویسی ہی ذرا سے علم اور ذرا سی طاقت رکھنے والے جیو پر لاانتہا سکھ کا بوجھ رکھ دینا ایشور کے لیے ٹھیک نہیں۔"

پنڈت جی کے اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ مکتی خانہ کی لفظی اور فرضی راحتیں

ایک بار گراں ہیں جن کو ہر جاندار بقدر اپنی طاقت ہی کے برداشت کر سکتا ہے اور اگر مکتی خانہ کا انعام کچھ زیادہ کر دیا جائے تو سکھ اور راحت کے بوجھ سے جیو دب مرے۔ راحت کا بوجھ یہ پنڈت جی کا خاص ہی فلسفہ ہے جسے وہ یا ان کے آریہ معتقدین ہی سمجھ سکتے ہوں گے کہ نعمت اور آسائش کی زیادتی بھی ناقابلِ برداشت بار ہو سکتی اور زیادہ آسائش دینا بھی پرمیشور کو ظالم بنا دیتا ہے؛ کچھ بھی ہو اس کو پنڈت جی جانیں اور اس معاملہ کو آریہ سمجھیں، مگر ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ مکتی خانہ جیل ہے اور وہاں کی نعمتیں پنڈت جی کے اقرار سے باہر ہیں تو اسے جیو اٹھا بھی نہیں سکتا تو در حقیقت وہ مکتی خانہ جیو کے لیے ایک مصیبت خانہ ہے' اس کو پنڈت جی نے پھر مکرر بہت صریح اور صاف لفظوں میں تسلیم کر لیا ہے' چنانچہ ستیارتھ ص ۳۱۸ میں لکھتے ہیں:

"یہی قاعدہ صحیح ہے کہ مکتی میں جانا پھر وہاں سے واپس آنا اچھا ہے۔ کیا تھوڑی قید کی نسبت عمر بھر کی قید یا پھانسی کو کوئی سزا پانے والا اچھا سمجھتا ہے۔ اس پر لکشمی بے فٹ نوٹ لکھا ہے۔"

"مکتی جبکہ جیو کی طاقت برداشت سے زیادہ ہو جائے اور اس کا متحمل نہ ہو سکے تو بے شک وہ مکتی اس کے لیے ایک بار گراں بمنزلہ سزائے موت یا حبس دائمی کے ہو جائے گی۔"

پنڈت جی نے اس عبارت میں مکتی کو سزا قرار دیا اور دائمی مکتی کو بہ نسبت میعادی مکتی کے زیادہ شاق بتایا' لیکن میعادی مکتی بھی رہی قید ہی اور جیو نے محنتیں جھیل کر جو آریہ دھرم سے مکتی حاصل کی وہ بھی قسمت سے سزا ہی میں رہی اور پھر برہم میں ملنے کا مزا وہ بھی پنڈت جی سے پوچھئے تو فرماتے ہیں "کہ برہم میں لے (یعنی تحلیل) ہونا تو ایسا ہوا جیسا سمندر میں ڈوب مرنا۔" اب اس مکتی پر پنڈت جی کو ناز ہے اور اس کے مقابل جنت کی نعمتوں کو وہ قابل اعتراض سمجھ رہے ہیں۔ آریو ہوش درست کرو اگر سمندر میں ڈوب مرنا ہو جیل خانہ میں سزا بھگتنا ہو' مکتی خانہ میں بوجھ اٹھانا ہو یا قید محض کی مصیبت برداشت کرنا ہو تو آریہ دھرم قبول کرو اور پنڈت جی کی مکتی حاصل کرو۔ مکتی نہیں یہ تو بہت دکھتی ہے اور پھر وہ مکتی بھی کیا مکتی ہے جہاں سے چند روز کے بعد نکل

پکڑ کر شہر بدر کر دیئے گئے۔

ع پابدست دگرے دست بدست دگرے

ع بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

جہاں اطاعت، عبادت، نفس کشی، ریاضت، مجاہدے کا یہ ثمرہ ہو اور عابدوں کو ایک لمبی قید کی مصیبت میں مبتلا کیا جائے اس مکتی کو پنڈت جی ہی پسند کر سکتے ہیں اور آریوں کا ایشور ہی ایسا عجیب و غریب انصاف کر سکتا ہے کہ طاعت و ریاضت کا صلہ مکتی کا جیل خانہ تجویز کرے، جہاں کا عیش دوام اور راحت دائمی تو نہ ہو بلکہ بقول پنڈت عمر قید اور کالے پانی کی طرح ہولناک سزا ہو۔

یہ تو مکتی کی حقیقت تھی، آریہ اس کا عیش سمجھیں یہ ان کی عقل مگر ایک بات اور بھی قابل دید ہے، وہ یہ کہ مکتی کا جیل خانہ میسر کن مصیبتوں کے بعد آتا ہے اس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اور ستیارتھ پرکاش کے حوالہ سے بتایا جا چکا ہے کہ پرمیشور کی تعمیل حکم اور تمام بدیوں سے پرہیز اور تمام خوبیوں کے ساتھ متصف ہونے اور مشغول عبادت رہنے سے یہ مکتی حاصل ہوتی ہے۔

چنانچہ ستیارتھ پرکاش ص ۳۴۳ میں لکھا ہے: "جب اس کے جھوکے ہردے (دل سے) اودھیا اور آگیان کی گرہ کٹ جاتی ہے تمام شک رفع ہو جاتے ہیں اور برے کرم چھوٹ جاتے ہیں، تب اس پرماتما میں جو ہماری آتما کے اندر اور باہر موجود ہے، قیام کرتا ہے۔"

رگوید آدی بھاشیہ بھومکا ص ۱۱۱ میں لکھا ہے: "جب انسان کا دل تمام برے کاموں کو چھوڑ کر پاک ہو جاتا ہے، تب وہ امرت یعنی موکش کو حاصل کر کے برہم کے ساتھ آنند میں رہتا ہے۔" (منتر ۱۴) "جب انسان کے دل کی گانٹھ یعنی جہالت وغیرہ تمام بندھن کٹ جاتے ہیں تب وہ مکتی پاتا ہے، اس لیے سب کو یہی ہدایت ہے کہ اس موکش کو حاصل کریں۔"

حاصل یہ ہے کہ مکتی اسی وقت ملتی ہے جب کوئی نفس عیوب سے بالکل مبرا اور

فضائل سے آراستہ ہو جائے لیکن اس کے بعد یہ قانون بہت عجیب ہے کہ ایسا پاک نفس جس کے ذمہ کسی قسم کی بدی اور عیب و گناہ نہیں ہے اور وہ برہم میں آنند کرنے کے قابل سمجھا گیا ہے۔ ایک معین زمانہ کے بعد مکتی خانہ کی حوالات سے نکال باہر کر دیا جائے گا اور پھر اس کو جنم مرن (پیدائش و موت) کے چکر میں ڈالا جائے گا پھر وہ ہزارہا جونوں میں دھکے کھاتا رہے گا مگر بات یہ ہے کہ مکتی کے بعد اس کو پہلی مرتبہ کونسی جون دی جائے گی اس قدر مشکل ہے کہ آریوں کے ایشور کو بھی حیرت ہی رہی اور وہ فیصلہ نہ کر سکے کہ ایک بے گناہ اور بے عیب کو جو اپنی نیکیوں کا بھی بدلہ پا چکا ہو اس کے پاس عمل کا کوئی سرمایہ باقی نہ رہا ہو کس جون میں قید کیا جائے گا؟ اور اس جون میں جو راحت یا تکلیف ہوگی وہ بغیر کسی عمل کے ہوگی تو تناسخ اور آواگون کا سارا اصول باطل ہو گیا۔ یہ ہے ویدک دھرم کی فلسفی۔

پنڈت صاحب کو دوسرے مذاہب پر زبانِ طعن دراز کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال لینا چاہیے تھا۔ آپ کی خیالی نجات اور اس کے ثمرات و نتائج اور اس کی عزت و قدر تو معلوم ہو چکی اب میں بہشت کا تذکرہ کروں جس کا اسلام نے مژدہ دیا ہے اور اپنے فداکاروں کو اس کی بشارت پہنچائی ہے مگر اس سے پہلے پنڈت جی کے ان خلاف تہذیب انسانیت کلمات پر بھی افسوس کر لوں جو انہوں نے خداوند عالم اور جنتی حوروں کے حق میں کہہ کر اپنی شائستگی اور انسانیت کا ثبوت دیا ہے اور اس سے ایک ناظرہ بھی یہ پتا چلا سکتا ہے کہ زبان سے یہ کلمات نکالنے والا شخص کتنا نامہذب، دشمن ادب، حاسد اور پھکڑ ہے اور پھر ان اوصاف سے کیا وہ اپنے عقیدہ اور خیال کی بناء پر بھی مکتی پا سکتا ہے، جبکہ اس نے مکتی پانے کے لیے رفاہ خلق اور ترک آزار شرط کیا ہو، اتنی بڑی ایذا رسانی اور مسلم آزاری کے بعد پنڈت صاحب خود اپنے اقرار سے اپنی فرضی نجات کے بھی مستحق نہ رہے جب کسی مذہب کے پیشوا بلکہ بانی کا یہ حال ہو کہ وہ خود بھی نجات نہ پا سکے تو اس مذہب میں پھر کون نجات کا امیدوار ہو سکتا ہے۔

اب پنڈت صاحب کی تہذیب دیکھیے جو انہیں اپنے دھرم سے ملی ہے، حورانِ بہشت کی نسبت لکھتے ہیں: "جب تک قیامت کی رات نہ آئے گی تب تک ان بے

چاریوں کے دن کس طرح گزرتے ہوں گے۔" (ستیارتھ پرکاش ص ۴۹۴)
علم و ادب کے مدعی آریہ اپنے پیشوا کی تہذیب دیکھیں قیامت کو رات کہنا تعصب کی تاریکی اور باطن کی بیماری کا نتیجہ ہے۔
جس مذہب نے قیامت کی خبر دی ہے اس نے قیامت کو کہیں رات نہ بتایا، جابجا روز قیامت (یَوْمِ الْقِیٰمَةِ) فرمایا ہے اور ہر جگہ دن ہی بتایا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:
سورۂ فاتحہ: "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" روز جزا کا مالک۔ خود پنڈت جی اپنی اسی ستیارتھ کے ص ۲۹۰ میں اس کا ترجمہ لکھتے ہیں: "نیاو دن انصاف کا۔"
سورۂ بقرہ: "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔" اور بعض لوگ کہتے ہیں ہم اللہ اور روز آخر پر ایمان لائے۔
سورۂ قیمہ: "لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔" اس آیت میں پروردگار عالم نے روز قیامت کی قسم فرمائی۔
ہر جگہ قرآن شریف میں قیامت کا روز ہی بتایا گیا ہے اور خود پنڈت جی نے انصاف کا دن ترجمہ کیا۔ مگر یہاں قیامت کی رات فرما رہے ہیں، یہ کیوں کیا۔ وہ ایسے نادان ہیں کہ انہیں دن اور رات میں بھی تمیز نہیں، اگر ایسا ہے تو ان کے فرمانبرداروں کو مبارک ہو جہاں ایسے عاقل پیشوا کی اطاعت کی جائے گی وہ متبعین جو ثمرہ پائیں گے، ظاہر ہے اور اگر پنڈت جی کو دن اور رات کا شعور کچھ باقی ہے تو پھر انہوں نے روز قیامت کو رات کیوں کہا؟ تعصب و نفسانیت کے نشہ میں اس قدر مخمور اور سرشار ہو کر دن کو رات بتائے اس کی اطاعت کرنا، اس کو پیشوا بنانا کیسی بدنصیبی اور محرومی ہے اور ایسے لوگ کس طرح صداقت و حقانیت کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھئے کہ پنڈت صاحب ایسے گھپ اندھیرے اور ایسی بھیانک تاریکی میں ہیں جہاں وہ دن کو بھی رات سمجھتے ہیں۔
ایسے شخص کا فیصلہ اور اس کی تعلیم کیا مفید ہو سکتی ہے جو دن کو رات کہتا ہو اور ایسے شخص کے پیرو کیونکر منزل مقصود کو پہنچ سکتے ہیں۔ ان انسان صورت سادہ لوحوں پر افسوس جنہوں نے ایسے نادان یا متعصب شخص پر اپنی گراں مایہ زندگی قربان کر دی۔

پھر پنڈت جی کا یہ کہنا کہ "ان بے چاریوں کے دن کس طرح گزرتے ہوں گے؟"

کیسی شرمناک گالی ہے، بازاری لچے اور شہدے بھی تو ایسی بدلگامی کی جرأت نہیں کر سکتے۔ کیا ویدک دھرم کی یہی تعلیم ہے اور پنڈت صاحب اسی تہذیب اور اسی شائستگی کا علم لے کر اٹھے ہیں اور آریہ صاحبان ان سے یہی ہنر سیکھتے ہیں۔ رشی اور سوامی ایسے بدزبانی کے جوہر رکھتے ہیں۔

میں تو یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ اس کے جواب میں آپ کی تفہیم کے لیے بھی یہ کہوں کہ ان کے دن اسی طرح گزرتے سمجھ لیجیے جس طرح اپنی صاحبزادیوں کے دن شوہروں کے پاس جانے سے پہلے، باوجودیکہ یہ گالی نہیں اس میں صرف یہ سمجھانا مقصود ہے کہ عورت نفسانی خواہشات اور جذبات مرد سے زیادہ رکھتی ہے۔ حوروں کی نسبت یہ ثابت نہیں بلکہ قرآن پاک میں بتا دیا گیا ہے: لھم فیھا ازواج مطھرۃ۔ یعنی مومنین کے لیے جنت میں بیبیاں ہیں نہایت پاک، جو ہر بدخلقی، بدسیرتی، نجاست، گندگی، حیض، نفاس، استحاضہ، بول براز، میل کچیل اور گھناؤنی چیز سے پاک ہیں۔ انھیں اپنے یہاں کی عورتوں پر قیاس کرنا تو جہالت اور کوتاہ نظری ہے لیکن اپنی عورتوں میں یہ بات تو آپ خود مشاہدہ کرتے ہیں کہ اگرچہ قوائے شہوانیہ اور جذباتِ نفسانیہ کا ان میں انتہائی غلبہ ہو لیکن قدرت نے مرد کے پہنچنے تک کا زمانہ انھیں ایسا امن و سکون کا عنایت فرمایا ہے کہ بڑی سے بڑی مست شہوت عورت بھی اس زمانہ میں اس خواہش سے محض ناآشنا ہوتی ہے جیسا آپ کو گھر میں اپنی صاحبزادیوں پر ذاتی تجربہ حاصل ہے۔ اس قادر مطلق نے اپنی ایک دوسری مخلوق یعنی حوروں کے لیے جو ان کے شوہروں سے ملنے کا وقت رکھا ہے، اس سے پہلے انھیں ایسے جذبات سے پاک رکھنا کیا بعید از عقل تھا جو پنڈت جی نے کہہ دیا کہ ان کے دن کیسے گزرتے ہوں گے۔ اگر پنڈت جی قرآن پاک نہ جانتے تھے، اگر حدیثیں نہ دیکھی تھیں، اگر اسلامی علوم سے محض بے بہرہ تھے اور انھیں پتا نہ تھا کہ بہشتی پاک حوروں سے یہاں کی عورتوں کو کچھ نسبت ہی نہیں، یہ طرح طرح کی گندگیوں نجاستوں میں گرفتار اور ان کے بدن پر میل بھی نہیں آ سکتا۔

یہ سرمست شہوت مگر وہ ہر بُرے جذبہ سے پاک- مانا کہ پنڈت جی یہ کچھ نہ جانتے تھے لیکن نابالغی کے ایام کا ان جذبات سے خالی ہونا تو ان کی نگاہ کے سامنے تھا، پھر یہ کس طرح انہوں نے ایسی قبیح گندی گالی دینے کی جرأت کی- یہ گالی حوروں کو تو نہیں لگتی، انہیں تو اللہ تعالیٰ نے بہت پاک پیدا کیا ہے، دنیا کی عورتوں پر کسی طرح اس کا قیاس ہی نہیں ہو سکتا بلکہ گالی اس گالی دینے والے کی بدباطنی، سیاہ دلی اور تعصب کی نابینائی کی خبر دیتی ہے-

دن کس طرح گزرتے ہیں یہ تو پنڈت جی کو اس وقت سوچنا چاہیے تھا جب وہ بال پرستھ کی ہدایتیں دے رہے تھے اور جب انہوں نے ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۱۴۰ میں لکھا تھا کہ "برہمچاری رہے یعنی اگرچہ اپنی عورت کے ساتھ ہو تاہم اس کے ساتھ نفسانی حرکت کچھ نہ کرے-" اس وقت سوچنا تھا کہ شوہر برہمچاری ہو گئے تو ان کی دیوی کے دن کس طرح اور کس کے سہارے گزریں گے-

اس کے بعد پنڈت جی کا اس سے بھی بے ہودہ کلمہ اور فحش گالی جو جاہل سے جاہل اور پھکڑ سے پھکڑ بدچلن آدمی بھی منہ سے نہیں نکال سکتا، ان کی قابلیت کی تعریف کرتی ہے، اسی گالی کے بعد لکھتے ہیں: "ہاں! اگر خدا کی ان پر مہربانی ہوتی ہو گی اور خدا ہی کے سہارے وقت گزارتی ہوں گی، یہی ٹھیک ہو سکتا ہے-"

آریو! انصاف سے کہو کیا کوئی بد سے بد اور جاہل سے جاہل آدمی بھی خدا کی شان میں ایسی گالی گلوچ کر سکتا ہے اور اس قسم کی بے حیائی کسی پیشوا کے مذہب کی شان ہو سکتی ہے- کسی غفلت میں ہو اپنے آپ کو ایسے شخص سے بچاؤ جو اس بے دردی کے ساتھ تہذیب و انسانیت کا خون کرتا ہے- میں پنڈت صاحب کی اس بدکلامی کے باوجود انہیں اس قسم کا جواب نہیں دینا چاہتا اور خود ان کی اور ان سے کمتر لوگوں کی نسبت بھی ایسے کلمات لکھنا گوارا نہیں کرتا لیکن نمکین اور چٹپٹے الفاظ میں پوچھا جا سکتا تھا کہ آپ کی کنتیاؤں کے دن آپ کے گھر کس طرح گزرتے ہیں، ملا اپر آپ کی مہربانی ہوتی ہے اور آپ کے ہی سہارے وقت گزارتی ہیں اس کی نسبت کیا سمجھا جائے- اسی طرح آپ کی بیوائیں آپ کے برہمچاریوں کی عورتوں اور خود برہمچاری بن جانے والی عورتیں

اپنے دن کس طرح گزارتی ہیں؟ ان پر کس کی مہربانی ہوتی ہے اور ان کا وقت کس کے سہارے نکلتا ہے؟ لیکن میں ایسا سوال بھی پسند نہیں کرتا اور صرف آریوں کو اس تہذیب کی طرف توجہ دلانے پر اکتفا کرتا ہوں۔ کاش کہ پنڈت جی کی ایسی اخلاقی ذبونی عاقل آریوں کے لیے اس جعلی دھرم سے نفرت کا باعث ہو اور وہ علم و تہذیب اور حقانیت کے سایہ میں آکر اسلام کے جھنڈے کے نیچے پناہ لیں۔

پنڈت جی نے اس سے بھی سخت الفاظ کہے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ خدا کے گھر میں عورتوں کی بہت قدر ہے اور بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ انہوں نے آخر میں یہ لکھ ڈالا کہ خدا بھی عورتوں میں غلطاں ہے۔ العوذ باللہ ثم نعوذ باللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم!

پنڈت جی کی حالت کہاں تک ردی ہو گئی کیا ان کلموں کے بعد بھی آریہ نہ شرمائیں گے، کیسے صریح افترا ہیں؟ کیسے جھوٹے الزام ہیں؟ کیسی گندی گالیاں ہیں؟ کیسا جھوٹ ہے کہ خدا کے گھر میں عورتوں کی قدر زیادہ ہے۔ خداوند عالم تو ارشاد فرماتا ہے: الرجال قوامون علی النساء۔ مرد کو عورت سے دونا۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ خدا کے یہاں عورتوں کی قدر زیادہ ہے کس قدر کمینہ فریب ہے اور یہ گالی کہ خدا بھی عورتوں میں غلطاں رہتا ہے۔ اس کے بکنے کے لائق تو پنڈت جی ہی کا منہ تھا مگر ان پر اپنے مذہب کی تعلیم غالب آ گئی ہے۔ وہاں جو دیکھا ہے اس مذہب نے جو سکھایا ہے ہر جگہ وہی نظر آتا ہے۔ دوسروں پر بھی وہی تھوپتے ہیں۔ عورتوں کی قدر کا مسئلہ یہ ان کے اپنے مذہب کی تعلیم ہے۔

چنانچہ ستیارتھ پرکاش کے ص ۱۳۲ پر لکھا ہے: "عورتوں کی ہمیشہ پوجا کرنی چاہیے۔"

اور ص ۲۹ پر لکھا ہے کہ "جو تک بچہ کا جسم جننے والی عورت کے جسمانی اجزاء سے بنا ہوتا ہے اس وجہ سے عورت بچہ جننے کے وقت کمزور ہو جاتی ہے اس لیے زچہ دودھ نہ پلاوے۔ دودھ روکنے کے لیے پستان کے منہ پر ایسی دوا لگاویں جس سے دودھ نکلنا بند ہو جائے۔ اس طریق پر عمل کرنے سے دوسرے مہینے میں عورت دوبارہ جوان ہو

جاتی ہے۔"

کیسے اسے کہتے ہیں، عورت کی قدر، بچہ کو بھی قدرتی غذا سے محروم کر دیا کہ مستیوں کے لیے جوانی ہی بنی رہے اور بچے چاہے بھوک پیاس میں تلف ہی ہو جائیں۔ اس تعلیم سے پنڈت جی کا دماغ اِتنا ہوا تھا' اس لیے وہ کلمات ان کے قلم سے نکل سکے، ورنہ کمینہ سے کمینہ آدمی ایسے کلمات زبان پر نہیں لا سکتا۔

پنڈت صاحب کی عقل پر ہزار افسوس، محقق ہونے کا دعویٰ اور اتنی بھی سمجھ نہیں کہ خواہشات کا پیدا کرنا قادر مطلق کے اختیار میں ہے۔ جب چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جب چاہتا ہے ان سے آزاد کرتا ہے۔ یہ بات تو ہر کس و ناکس جانتا ہے کہ وہ انسان جو خواہشاتِ نفسانیہ میں بدمست اور اندھے رہتے ہیں، بلوغ سے پہلے سالہا سال کا زمانہ ان پر ایسا گزر چکا ہے کہ وہ ان خواہشات سے آشنا ہی نہ تھے، پر عمر گزرنے کے بعد خواہشات کی مستیوں میں بے خود رہنا اور نفسانی جذبات کے سمندر میں امنگوں کی موجیں اٹھنا موقوف ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور زمانہ آتا ہے کہ چشمہ خشک کے پانی کی طرح اس طغیانی برپا کرنے والے جنون شہوات کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا اس وقت رنگیلے سے رنگیلے زندگی کرنے والے انسان اور شیر خوار بچے ان خواہشوں سے بے رغبتی میں ہمسر ہیں۔

طبی عالم کے جادو نما کرشمے اور ادویہ کی سحر یا تاثیریں ان میں اثر کرنے سے عاجز ہیں۔ کوئی معالجہ ان قویٰ کو زندہ نہیں کر سکتا اور افسردہ طاقتوں میں ہیجان پیدا کرنے پر قادر نہیں، جس قادر مطلق کی یہ شان ہے اور مخلوق کے تمام قویٰ و افعال اس طرح اس کے زیر فرمان ہیں' اس سے یہ پوچھنا کہ جنتی حوریں کس طرح اپنے دن بسر کرتی ہوں گی؟ قدرتِ الٰہیہ سے انکار اور اس کی حکمت سے ناواقفی اور بے بصیرتی پر مبنی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں جب چاہتا ہے خواہش پیدا کرتا ہے' جب چاہے پیدا ہی نہ کرے۔ اس میں کسی کا کیا دخل؟ لیکن اصل یہ ہے کہ پنڈت جی کو ان کے دھرم نے خدا کی ذات و صفات سے باخبر بھی نہیں کیا ہے۔

ہاں! یہ ممکن ہے کہ پنڈت صاحب کو اپنی ملکی عورتوں کی شہوانی بے اختیاری کا

تجربہ ہو اور اسی بناء پر بات ان کی عقل ہی میں نہ آسکی ہو کہ عورت کو صبر و تحمل کس طرح ہو سکتا ہے؟ پنڈت صاحب کا نیوگ کو رائج کر کے ایک عورت کا گیارہ مرد تک سے عیش کرنے کی اجازت دینا بھی ان کے اس تجربہ کا قرینہ ہو سکتا ہے' لیکن انہیں یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ ایک ملک کے اخلاق و عادات' وہاں کے طرز معاشرت اور اثر آب و ہوا اور رسم و رواج و عادات و خصائل کا دوسرے ملک پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اقلیم کے رہنے والے دوسری اقلیم کے باشندوں سے مختلف المزاج ہوتے ہیں' چہ جائیکہ دوسرے عالم اور پاک عالم پر اپنے ملک کے اوضاع و اطوار کا قیاس کرنا دانا کی شان سے بالکل بعید اور حکم عقل کے مخالف ہے۔

صحبتیں اور تربیتیں انسانی نفوس اور ان کی خواہشات میں عظیم الشان تبدیلی پیدا کر دیتی ہیں۔ ایک جاہل' بدچلن' آوارہ جماعت اور ادنیٰ معیشت رکھنے والی قوم اعلیٰ علمی زندگی رکھنے والے شائستہ خاندان کے علم و ادب سے کیا نسبت رکھتے ہیں۔ جس طرح اوباش طبقہ کا ایک شخص اپنی اور اپنے ہم صحبتوں کی حالت دیکھ کر علم و ادب والے مہذب و شائستہ طبقہ کی نسبت حیرت سے کہہ سکتا ہے کہ بغیر گالی گلوچ' چھیڑ چھاڑ' تمسخر کیے وہ لوگ کس طرح زندہ رہتے ہیں اور وہ اپنے حال کے غلبہ سے اس قدر مجبور ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت کا اس جذبہ سے خالی تصور کرنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے' اسی طرح پنڈت صاحب نے جو صحبتیں پائی ہیں اور جن جذبات نے ان کے اور ان کے ہم قوموں کے دماغوں پر استیلا کر لیا ہے' وہ کسی متنفس کو ایسے جذبات سے خالی تصور کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس قوم کی حالت زار پر رحم اور افسوس جس کا پیشوا اپنے اور اپنے گرد و پیش کے حالات سے اس قدر متاثر اور مغلوب ہو گیا ہو۔ جس قوم کے محقق کی یہ شان ہو' اس کے عامی و جاہل کیا کچھ ہوں گے۔

پنڈت صاحب عورتوں اور حوروں کا بہشت میں ہونا قابل اعتراض سمجھتے ہیں' گو یہ اعتراض بہ تکلف و بہ تصنع کیا ہو لیکن اس اعتراض سے پتا چلتا ہے کہ وہ حکمت الٰہی کے اسرار و دقائق سے تو کیا باخبر ہوتے' ابھی تک دماغ شریف موٹی موٹی باتیں سمجھنے پر بھی قادر نہیں ہے کہ انسان کو خدا نے بنایا ہے اور تمام قویٰ اسی نے اس کو مرحمت کیے

ہیں تو اس کی حکمت کا اقتضا ہے کہ جو یہ خواہشیں انسانی کائنات میں اس نے ودیعت فرمائی ہیں، ان سب کی راحت کا سامان بھی وہ مہیا فرمائے۔ دیکھنے کو آنکھ دی تو فرحت انگیز مناظر پیدا کیے۔ سننے کو کان عطا کیے تو ان کے لیے طرب انگیز نغمے اور سرور پیدا کرنے والے الحان موجود فرمائے۔ زبان میں چکھنے والی قوت پیدا کی تو اس کے لیے طرح طرح کے خوش کیف طعم اور ذائقے بنائے، ناک میں سونگھنے کی قوت رکھی تو اس کے لیے روائح طیبہ خلق کیے۔ اس طرح خالق قوی نے جو قوتیں دیں، ان سب کے عمل میں لانے اور ان سے کام لینے کے مواقع بھی اسی نے پیدا کیے اور یہ عین حکمت ہے۔ بھوک لگانا اور غذا نہ بنانا یہ شانِ حکمت کے خلاف ہے۔

اب ہمیں پنڈت صاحب سے یہ دریافت کرلینا ہے کہ کیا آپ کے نزدیک منافی نجات کا یہ حاصل ہے کہ مرد کو مخنث کر دیا جائے، اگر آپ یہ اعلان کرچکے کہ تو تھوڑی عقل والا بھی آپ کی ایسی نجات کو مفت لینے پر بھی راضی نہ ہوگا۔ مفت نہیں، بلکہ اگر دولتیں دینے کا وعدہ کیجئے تو وہ ٹھکرا دے گا اور اس کو راحت و آسائش نہیں بلکہ عذاب و وبال سمجھے گا۔ جب قدرت نے مردوں کو رجولیت دی تو عورتوں کا پیدا کرنا عین اقتضائے حکمت ہے۔ اس دنیا میں بھی تو وہی پیدا کرتا ہے تو خالق عالم کا جو فعل یہاں خلاف حکمت نہیں، کس طرح عالم آخرت میں قابلِ اعتراض ہو سکتا ہے۔ پنڈت صاحب کا یہ عجیب و غریب سوال انتہائی عاقلانہ ہے جتنا ان کا یہ فرمانا کہ اپنی عورت بھی ساتھ ہو تو بھی نفسانی حرکت کچھ نہ کرے، برہمچاری رہے۔ آخر اس میں عیب کیا ہے اور عیب ہے تو اسی عیب دار طریقے سے تو جناب پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت اور آپ کی ہستی خود اسی عیب ناک جرم کا نتیجہ ہے جس سے آپ ناخوش ہیں۔

ہاں! آپ کو یہ عذر کرنے کا موقع ہے کہ یہ فعل آپ کے والدین کا تھا جو میرے مشورہ سے نہیں ہوا۔ مجھے مشورہ دینے کا موقع ہوتا تو میں انہیں ہرگز یہ رائے نہ دیتا تو ہم بھی تسلیم کرلیں گے کہ واقعی وہاں تو آپ کا کوئی اختیار نہ تھا لیکن اب تو اپنے تمام معتقدین کو حکم دیجئے کہ وہ ترک و تجرد کی زندگی اختیار کریں اور خانہ داری کے اصول و آئین کو توڑ ڈالیں اور اس عیب میں مبتلا نہ ہوں لیکن آپ بجائے یہ تعلیم دینے کے

اس کے برعکس نیوگ کا حکم فرما کر ایک کی جگہ گیارہ کی اجازت دیتے ہیں اور وہی بات جس کو برا سمجھتے تھے، اس سے دنیا کو پر کیے دیتے ہیں۔ قدرت نے جن عورتوں کے شوہروں کو اٹھا لیا اور وہ کر انہیں آزادی حاصل ہو گئی۔ انہیں پھر آپ ایسے ہی کام کی دعوت دیتے ہیں، ترغیبیں کرتے ہیں، بزور جبران نفسانی حرکات میں مبتلا فرماتے ہیں۔ سوچیے تو آپ کی کونسی بات ٹھیک اور آپ کا کونسا اصول درست ہے؟

الحاصل! پنڈت صاحب کا یہ اعتراض حکمت اللہ سے ناواقفیت کی بناء پر تھا۔ انہیں نظم عالم میں قانونِ الٰہی پر نظر غائر ڈال کر سمجھنا تھا کہ دنیا بھی اسی خالق کی بنائی ہوئی ہے جس سے ہم نجات کی توقع کرتے ہیں، یہاں اس نے اپنے بندوں کو جو قویٰ اور ان قویٰ کے لیے جو جو سرو سامان عطا فرمائے اور ان کی مذہب کے ذریعہ سے اجازت دی، ان پر اعتراض کرنا حکمت الٰہی کے مقابل گستاخانہ لب کشائی ہے، پھر یہاں کی اور جنت کی نعمتوں میں زمین و آسمان سے زیادہ کا فرق ہے۔ اشتراک اسمی یعنی نام کے ایک ہونے سے افعال و خواص، طبیعت و مزاج، احوال و صفات کا ایک ہونا لازم نہیں آتا۔ نیز اوپر بتایا جا چکا ہے کہ یہاں عورتوں میں گندگی بھی ہے، نجاست و کثافت بھی، بد مزاجی، تند خوئی، بد خلقی بھی مگر جنت میں یہ کوئی چیز نہ ہوگی۔ وہ ہر قسم کے میل کچیل، گندگی کی کثافت سے پاک صاف ہوں گی۔ بہترین خصائل، اعلیٰ شمائل، پاک اوصاف سے متصف ہوں گی۔

اب میں پنڈت صاحب کو جنت کا مختصر تذکرہ بھی سنا دوں تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ جنت میں کیا کیا نعمتیں ہیں اور دنیا کی نعمتیں بھی جو اللہ تعالیٰ کی عطا ہیں، انسان ان کے شکر سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ناشکرا آدمی ناسپاسی کرے اور اس منعم کریم کی نعمتیں پا کر ناشکری ہی کے کلمات زبان پر لائے، مگر وہ دنیا کے شائستہ طبقہ میں ذلیل سمجھا جائے گا اور کمینہ خیال کیا جائے گا۔ بہشت کی نعمتیں دنیوی نعمتوں سے کہیں بالاتر ہیں۔

جنّت کا بیان

حقیقت الامر یہ ہے کہ جنّت کی تعریف الفاظ میں ممکن نہیں ہے، تقریب ذہن کے لیے تمثیلات کے ساتھ اس کا پتہ دیا جاتا ہے، ورنہ جنت کی نعمتیں اتنی برتر اور اعلیٰ ہیں کہ نہ بیان کا احاطہ ان کی گنجائش رکھتا ہے، نہ طائر فکر ہی کو ان تک رسائی ہو سکتی ہے۔ بخاری و مسلم کی صحیح حدیث میں حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جنت کی نعمتوں کے حق میں ارشاد فرمایا:

لا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔	وہ نعمتیں ادنیٰ وہاں کے دل کشا مناظر ایسے ہیں کہ کسی آنکھ کو انھیں دیکھنا ہی نصیب نہ ہوا، نہ کسی کان نے ایسے اوصاف سنے، نہ کسی دل پر خطرہ گزرا۔

یعنی جنتی نعمتوں کا صحیح اندازہ انسان اس وقت کر سکتا ہے جبکہ ان کو یا ان سے ملتی جلتی کسی چیز کو اس کی آنکھ نے دیکھا ہو اور جس کے شبہ و مثال کی رویت سے کوئی آنکھ آشنا ہی نہیں اور جس کے اوصاف و کمالات کماحقہ گوش شنوا نے سنے ہی نہیں اور جس کے محاسن و خوبیاں کبھی قلب میں گزری ہی نہیں۔ اس کی عظمت شان اندازہ سے بالاتر ہے۔ اب نہ دنیا کے سلاطین کا دماغ ان نعمتوں تک رسائی کر سکتا ہے، نہ فلاسفہ کا وہم و خیال۔ پنڈت جی بے چارے تو کس گنتی و شمار میں ہیں، ان کی رسائی ہی کہاں تک ہندوستان میں پیدا ہوئی یہاں کے دریاؤں، پہاڑوں کے مناظر آنکھوں سے دیکھے، وہ کس ہمت پر خداوند عالم کی ایسی جلیل اور نفیس نعمتوں کا اندازہ کر سکیں۔

یہی مضمون جو اس حدیث شریف میں تھا قرآن پاک میں بھی ارشاد ہوا بلکہ یہ حدیث کریم اس آیت کی تفسیر ہے:

لا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین۔	کوئی نفس نہیں جانتا جو آنکھ کی ٹھنڈک ان کے لیے مخفی رکھی گئی ہے۔

تو اب جو کچھ لکھا جائے گا وہ ذہن کی تقریب ہو گی جس سے جنت کی علو شان و رفعت مکان کی طرف اس کو پہنچایا جائے گا اور اس میں سے بھی اقل قلیل ہو گا جو ایک نمونہ کے طور پر یہاں ذکر کیا جائے گا۔ وہ تمام تفصیلات جو قرآن پاک و احادیث کریمہ میں وارد ہیں، اس جگہ جمع نہیں کی جا سکتیں، اس لیے اس مختصر بیان سے اس عالم کی نعمتوں کا جس قدر ہو سکے اندازہ کیجئے۔

بہشت میں اہلِ جنت کا شاندار داخلہ

اہلِ جنت اپنے عملوں کے اعتبار سے اپنے مدارج و مراتب میں متفاوت و متفاضل ہوں گے اور ہر ایک کا داخلہ ان کے رتبہ و شان کے لائق ہو گا۔ سب سے ادنیٰ مرتبہ ان کا ہے جو کفر و شرک سے بچے رہے اور اس کے علاوہ انہوں نے زہد و ریاضت سے کوئی اعلیٰ مرتبہ حاصل نہیں کیا۔ ان کا داخلہ کس طرح ہو گا، یہ جاننے کے بعد اربابِ عقل سمجھ سکیں گے کہ ان سے عالی مرتبت لوگوں کی کیا شان ہو گی۔ اس لیے میں عام مومنین یعنی ادنیٰ اہلِ جنت کے داخلہ کا تذکرہ کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے:

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۗ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ○ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ○ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ

اور جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ان کی سواریاں گروہ گروہ جنت کی طرف چلائے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے اور اس کے داروغہ سے کہیں گے سلام تم پر خوب رہے تو جنت میں جاؤ ہمیشہ رہنے اور وہ کہیں گے سب خوبیاں اللہ کو جس نے اپنا وعدہ ہم سے سچا کیا اس زمین کا وارث کیا کہ ہم جنت میں

حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (الزمر: ۷۵-۷۳)

رہیں جہاں چاہیں۔ تو کیا ہی اچھا ثواب عمل کرنے والوں کا اور تم فرشتوں کو دیکھو گے عرش کے آس پاس حلقہ کیے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے اور لوگوں میں سچا فیصلہ فرما دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ سب خوبیاں اللہ کو جو سارے جہاں کا رب ہے۔

اس آیت مبارکہ میں اہلِ جنت کے شاندار داخلہ بہشت کا تذکرہ ہے کہ وہ مراکب نفیسہ پر سوار کر کے جنت کی طرف لائے جائیں گے۔ یہ ادنیٰ جنتیوں کا بیان ہے' ان سے اعلیٰ طبقہ وہ ہے جن کے لیے قرآن پاک میں ارشاد ہوا: "وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔" کہ پرہیزگاروں کے لیے جنت قریب کی جائے گی۔ عام مؤمنین کے لیے سواریاں ہوں گی جن پر سوار ہو کر عزت و احترام کے ساتھ روانہ ہوں گے اور سواریاں ان کی قبروں پر حاضر ہوں گی' ان کے سامنے نور ہوں گے۔ بہ حسبِ تواقت درجات و صلاحِ احوال کے لیکن جو ان سے بلند درجہ کے لوگ ہیں جنہیں متوسط طبقہ کہنا چاہیے' ان کے لیے جنت استقبال کرے گی جس کا بیان آیہ کریمہ "وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ" میں ہے اور ان سے جو اعلیٰ طبقہ ہے اس کی کرامت و منزلت تو انسان کی زبان سے کیا ادا ہو سکتی ہے۔ قرآن پاک میں ان کی تکریم کا بیان یہ فرمایا گیا ہے:

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا۔

جس دن ہم پرہیزگاروں کو رحمٰن کی طرف لے جائیں گے مہمان بنا کر۔

خلاصہ یہ کہ تمام مومنین نورانی مشعلوں کے ساتھ جو شمس و قمر کی طرح تاباں ہوں گے (جیسا کہ احادیث میں وارد ہوا ہے) مقدس ملائکہ کی خدمت میں اس شوکت و شان کے ساتھ روانہ ہوں گے کہ سلاطین عالم نے اس کا شمہ بھی کبھی عالم خواب میں نہ دیکھا ہو گا۔ اہلِ محشر اولین و آخرین سب کی نگاہیں ان کی طرف اٹھی ہوں گی اور وہ خدا کے ان مورد رحمت بندں کے اعزاز و تشریف اور تکریم و احترام کو دیکھتے ہوں گے کہ وہ

دار الکرامت کی طرف کس فرح و طرب، کس بہجت و سرور، کس خوشی و شادمانی کے ساتھ روانہ ہو رہے ہیں۔

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ اہلِ جنت کی سواریاں ایک درخت کے پاس لائی جائیں گی جس کے نیچے دو چشمے جاری ہیں۔ ایک چشمہ میں یہ غسل کریں گے جس سے ان کا ظاہر پاکیزہ اور نورانی ہو جائے گا اور دوسرے چشمہ سے پئیں گے جس سے ان کا باطن مطہر و منور ہو گا۔ جنت کے دروازوں پر استقبال کے لیے ملائکہ منتظر ہوں گے اور داخلہ کے وقت وہ انہیں عرضِ سلام کے بعد بشارتیں دیں گے اور یہ کہیں گے: "سلام علیکم طبتم فادخلوھا خالدین۔" اس میں میزبانوں کی طرف سے سلام کے ساتھ اکرام ہے، مبارکباد ہے۔ طیب و طہارت کے ساتھ، اشعار ہے کہ جنت ہر گرد و کدورت سے پاک ہے۔ وہ طیبین و طاہرین پاک ستھرے بندوں کا مقام ہے، پاکوں کے سوا کوئی اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ "فادخلوھا" کہہ کر بلایا جاتا ہے۔ آؤ آؤ اور یہ بلانا کسی اور بلانے والے نے بلایا ہو یا کسی میزبان نے کتنے ہی ارمانوں کے ساتھ میزبانی کی ہو آیئے! آیئے! تشریف لایئے! کرم فرمایئے! تو وہ کہہ سکتا تھا مگر بادشاہ ہو تا یا شہنشاہ اس کی مقدرت و امکان میں نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے دعوت دیتا اور وہ دعوت کے آخر ہونے اور لہٰذا ئذ ضیافت کے ختم ہو جانے اور تعظیم و اکرام کے ناپائیدار و بے بقاء ہونے کے خطرہ سے اپنے مکرم سے مکرم مہمان اور پیارے سے پیارے محبوب کو بھی مطمئن کر سکتا۔ نعمتوں کی بے مثالی کے ساتھ ان کا دوام اور خطرہ زوال سے ایمنی کا مژدہ اسی دار السرور اور اسی دار الخلد کے میزبان استقبال کنندے سناتے ہیں۔ "فادخلوھا خالدین۔" اللہ کے پاک بندے ملائکہ اپنی نورانی جماعتوں کے ساتھ تعلیم و احترام کے لیے آگے بڑھ کر پیشوائی کرتے ہیں اور اپنے معزز مہمانوں سے کہتے ہیں: آیئے، آیئے! یہاں زوال نعمت کا خطرہ نہیں۔ یہاں کے نفائس نعم اور کرائم طیبات اور تمہارا عیش و سرور دائمی ہے۔ آؤ، آؤ! ہمیشہ رہنے آؤ، یہ نعمت چھینی نہ جائے گی۔ یہ دولت بے وفائی نہ کرے گی، یہ رب کریم کی طرف سے عطا ہے اور کریم کی دہش کی کیا انتہا۔

اس مبارکباد و تہنیت میں، اس تکریم و تحیت میں بشارت کبریٰ ہے، مژدۂ رُوح افزا ہے۔ ارمانو مچل جاؤ، تمناؤ بکھر جاؤ، تمہاری حسرتیں پوری کیے جانے اور ان سے اور زیادہ کرم و نوال کا وقت آیا۔ تمام نعمتوں سے پیارا، سب دولتوں سے اعلیٰ، محبوب کا مشاہدۂ جمال و لذتِ وصال تمہارے لیے دائمی ہے۔

تفسیر روح البیان میں فرماتے ہیں: قوله: "سلام علیکم طبتم ای انتم فی مشاهده جماله ابدا طیبین بلذه وصاله سالمین عن الحجاب۔

دید محبوب کے درجات مبارک ہوں تمہیں
جلوۂ یار کے لذات مبارک ہوں تمہیں

یہ تحیت تو عوام مومنین کے لیے ہے، خواص کی تعریف اور ہے، اس کا مقام اس سے بہت بالا ہے۔ وہاں وساطت ملائکہ کے حجاب بھی اٹھا دیئے گئے، محبوب کی طرف سے بے واسطہ سلام پہنچ رہا ہے۔ "سلام قولا من رب رحیم۔" تحیت و تکریم کے جواب میں اہلِ جنت حمد و ثنا کے ساتھ زبان کھولیں گے اور عرض کریں گے: "قالوا الحمد لله الذی صدقنا وعده واورثنا الارض نتبوء من الجنه حیث نشاء فنعم اجر العملین○"

جمیع محامد اللہ کے لیے جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہمیں زمین جنت کا مالک کر کے اس میں تصرف عام عطا فرمایا کہ ہم جہاں چاہیں رہیں اور اس کی وسعت میں جس محل کو چاہیں، اپنی منزل و قرار گاہ بنائیں۔ اس میں ضمنی طور پر جنت کی وسعت کا بھی اظہار ہے کہ ایک ملک کا ملک جہاں کا جہاں ان کے ملک میں دیا گیا اور اس وسیع دار النعم پر انہیں قبضہ و اختیار کامل عطا فرمایا گیا تو فرمانبرداروں کا اچھا اجر ہے۔

کیا مزے کا وقت ہے کہ جنت کے دروازوں پر اہلِ جنت کو مبارکبادیں دی جا رہی ہیں، ملائکہ انہیں دخول جنت اور وصال محبوب کے مژدے سنا رہے ہیں، وہ اپنے رب کی حمد و ثنا اور شکر نعمت و احسان میں خطبے عرض کر رہے ہیں۔ یہ تو اہلِ جنت کے داخلہ کا مختصر سا نقشہ تھا جو پنڈت جی کے خواب و خیال میں بھی نہ گزرا ہوگا اور ان کے طائرِ وہم و ادراک کو بھی یہاں تک رسائی میسر نہ آئی ہوگی۔ کس طرح کی میزبانی ہے؟ کیسے اکرام

ہیں؟ پھر ان مہمانوں کے کیا آداب ہیں؟ شکر نعمت اور حمد الٰہی میں معروف و مشغول ہیں۔ آپ بھی اپنی موہوم نجات مکتی کو یاد کیجئے اور وہ مکتی جسے آپ جیل خانہ سمجھتے ہیں وہاں کے داخلہ کا کچھ احوال بتایئے۔ کہئے کچھ خبر ہے اسی پر جنت کے مقابلہ میں مکتی کا نام لیتے تھے۔ ابھی تو داخلہ ہی کا تذکرہ سنایا ہے، آئندہ بہشتی مقامات اور وہاں کی نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا تو کس قدر ہوش پراں اور عقل حیران ہوگی۔ آؤ! آؤ! ہم تمہیں بھی اس جنت سے محروم رکھنا نہیں چاہتے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی گواہی دو، سید عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لاؤ، پھر یہ نعمتیں تمہارے لیے بھی ہیں، خدا نصیب کرے۔ آمین۔

جنت کی وسعت

پنڈت جی اور ان کے معتقدین وید کے مکتی خانہ کی وسعت یاد کرلیں جہاں روحوں کے بکثرت پہنچ جانے سے انہیں بھیڑ بھاڑ کا اندیشہ ہے جیسا کہ ان کی عبارات منقولہ بالا سے ثابت ہے۔ اس کے بعد جنتوں کی وسعت پر نظر ڈالیں، دنیا میں کوئی پیمانہ نہیں جس سے جنت کی وسعت کا حساب کیا جاسکے۔ قرآن پاک نے سامعین کے ذہن نشین کرنے کے لیے اس طرح ارشاد فرمایا: "جنت عرضها السموات والأرض۔" اور جنت جس کے عرض میں سماوات وارض آجائیں، مراد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی پیمانہ ایسا نہیں ہے جس سے جنت کی وسعت کی پیمائش ہوسکے اور انسان نہ جانی ہوئی چیز سے کسی شے کا اندازہ لگا نہیں سکتا۔ اس لیے کوئی دیکھی ہوئی چیز سامنے لائی جائے تاکہ وہ کچھ تو اندازہ کرے، اس لیے بتایا کہ جنت کے طول کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ عرض کا یہ حال ہے کہ اگر آسمانوں اور زمینوں کے طبقات برابر ملا کر پھیلا دیئے جائیں اور ان کو ایک طبق بنا دیا جائے اس کو جنت کی چوڑائی سمجھو۔ ایسا ہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ (مدارک)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس علیہ الصلوۃ والسلام

نے ارشاد فرمایا:

ان فی الجنة لشجرة یسیر الراکب فی ظلها مائة عام لا یقطعها۔ (بخاری و مسلم)	جنت میں ایک درخت ہے' اس کی وسعت کا یہ عالم کہ سوار اس کے نیچے سو برس چلے اور قطع نہ کر سکے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

ان للمومن فی الجنة لخیمة من لولو بہ واحدہ مجوفة عرضھا وفی روایتہ طولھا ستون میلا۔	جنت میں مومن کے لیے ایک موتی کا خیمہ ہوگا جو اندر سے خالی ہوگا اس کا عرض اور ایک روایت میں طول ساٹھ میل ہوگا۔

(بخاری و مسلم)

حضرت عباس بن صامت رضی اللہ عنہ سے ترمذی شریف میں ایک حدیث مروی ہے کہ حضور اقدس علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

فی الجنة مائة درجة ما بین کل درجتین کما بین السماء والارض۔	جنت میں سو درجے ہیں۔ ہر دو درجوں کے درمیان اس قدر فاصلہ ہے جتنا آسمان و زمین میں۔

آریوں سے کہو' یہ ہے دار الجزاء اور یہ ہے اس کی وسعت۔ آپ کے مکتی خانہ کی طرح تنگ نہیں جہاں پنڈت ویانند کو بھیڑ بھاڑ کا اندیشہ لگا ہوا ہے۔

جنت کی فضا

جنت بایں وسعت و فسحت کوئی لق و دق میدان یا خشک بیابان نہیں ہے' بلکہ اس کی عجیب و غریب فضا نہایت طرب انگیز اور دلربا ہے' اس کے فرحت افزا مناظر اپنی نزہت و نضارت سے اللہ تعالیٰ کی شان رحمت و کرم کا اظہار کرتی ہے۔ جنت کے محق

ہی بستان ہیں اور اس کے سرسبز و شاداب چمنستان اور خوش منظر جوئباریں، دل آویز چشمے اور نہریں قدرتِ الٰہی کا اظہار ہیں۔

فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ۔ (سورہ محمد)

ان آیاتِ کریمہ میں ذکر ہے کہ جنت میں ایسے صاف اور لطیف اور پاکیزہ پانی کی نہریں ہیں جو فاسد نہیں ہوتا اور جس کا رنگ و بُو اور مزا اپنے حال سے نہیں بدلتا۔ دنیا کا پانی سڑ جاتا ہے، بدبُودار ہو جاتا ہے، اس کا رنگ خراب ہو جاتا ہے مگر جنتی نہروں کا لطیف پانی ان عیوب سے پاک ہے۔ اس کے علاوہ دودھ کی نہریں ہیں، دنیا کا دودھ دیر تک رکھنے سے خراب ہو جاتا ہے، پھٹ جاتا ہے، بس جاتا ہے، بدمزہ اور بدذائقہ ہو جاتا ہے، اس میں ترشی اور تلخی آجاتی ہے مگر جنتی نہروں کا نفیس دودھ نہ پھٹتا ہے، نہ سڑتا ہے، نہ اس کے مزہ میں فرق آتا ہے۔ دودھ اللہ تعالیٰ کی بہت نفیس نعمت ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد وہ پہلی غذا جس سے انسان تربیت پاتا ہے، دودھ ہے۔ ہندو تو مخصوص طور پر دودھ کے لالچ میں اس پر جانیں قربان کر ڈال دیتے ہیں۔ گؤ شالوں پر لاکھوں روپیہ خود بھی خرچ کرتے ہیں اور گؤ رکھشا کے لیے جابجا سٹیشنوں، سراؤں، کچہریوں میں بھیک مانگتے پھرتے ہیں، پھر بھی دودھ کن مصیبتوں کے ساتھ بہم پہنچتا ہے۔ دودھ کے جانور پالتے ہیں، ان کے لیے مکان بناتے ہیں، ان کی خدمت کے لیے آدمی نوکر رکھتے ہیں۔ وہ مکان جس میں دودھ کے جانور پالے جاتے ہیں، ان جانوروں کے بول و براز سے گندے اور نجس رہتے ہیں، تعفن اور بدبو دور تک آنے جانے والوں کے دماغ پریشان کرتی ہے۔ یہ سب مصیبتیں، کلفتیں، زحمتیں دودھ کی خاطر اٹھائی جاتی ہیں جو کریم کارساز اس عالم میں حیوانات کے تھنوں سے دودھ عطا فرماتا ہے۔ اس نے جنت میں ددھ کی نہریں جاری فرما دی ہیں۔ نہایت پاک صاف ہے بگڑنے اور خراب ہونے کا خطرہ سے ایمن ہے، گندگی و عفونت کا تو اس پاک مکان میں نام و نشان ہی نہیں، پھر افراط یہ کہ دودھ کے چشمے جاری ہیں۔ دودھ کے دریا موجیں مار رہے ہیں، یہ دریا ہمیشہ جاری رہتے ہیں

مگر یہاں کا دودھ باسی نہیں ہوتا، اس کی تازگی اور لذت میں کمی نہیں آتی۔ دنیا کے دودھ کو ذائقہ اور لذت میں اس سے کیا نسبت۔ اسم و صورت کا اشتراک ہے اور حقیقت ولیاقت بیان میں نہیں آسکتی۔

اس کے سوا جنت میں شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذت خالصہ ہے۔ نہ وہ شراب دنیا کی طرح ترش یا تلخ یا کسیلی، نہ اس کے پینے سے عقل میں فتور آئے، نہ سر میں درد ہو، نہ خمار لائے بلکہ وہ خالص لذت ہی لذت ہے اور پاک و طاہر۔ شراب دنیا میں جتنی آفتیں ہیں سب سے بری۔

اس کے ماوراء جنت میں شہد کی نہریں ہیں جو دنیا کے شہد کی طرح مکھیوں سے حاصل نہیں کیا جاتا۔ دنیا کا شہد مکھیوں کی قے ہے، ان میں مکھیاں مرجاتی ہیں، موم ملا ہوتا ہے، موم کی بو اس میں بس جاتی ہے اور کن مصیبتوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ جنت کا شہد، ان تمام نقائص سے خالی، نہایت صاف و شفاف، لطیف و نظیف اور اس قدر وافر کہ نہریں جاری ہیں، جہاں چاہیے اور جس قدر چاہیے بے روک ٹوک موجود۔

امام ترمذی نے حکیم ابن معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: "ان فی الجنۃ بحر الماء' بحر العسل وبحر اللبن وبحر الخمر ثم تشقق الانھار۔" جنت میں پانی کا سمندر، شہد کا سمندر، دودھ کا سمندر، شراب کا سمندر ہے۔ ان سمندروں سے نہریں نکلی ہیں اور جنت میں تمام انواع و اقسام کے پھل ہیں، مشروبات کے بعد پھلوں کے ذکر کرنے میں اشارہ ہے کہ یہ پھل تفکہ و لذت کے لیے ہیں، نہ حاجت اور بھوک کے لیے۔

شہد و شراب اور فواکہ و ثمرات کے ناموں سے تیرہ دماغ نافہم یہ خیال کرتے ہیں کہ پس جنت میں بھی یہی دنیوی نعمتیں ہیں چنانچہ پنڈت دیانند نے بھی کہا ہے، ان کے خیال نے یہاں تک رسائی نہ کی کہ اسمی و صوری مشارکت حقیقت و اوصاف کی مشارکت کو مستلزم نہیں اور دنیا کے شہد و شراب ثمرات فواکہ جنتی نعمتوں سے کوئی بھی نسبت نہیں رکھتے۔

اوپر کے بیان میں ان کے امتیاز و خصوصیتیں ظاہر ہو چکی ہیں، جن میں نظر کرکے

عاقل بہ یقین اس نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے کہ دنیا کی چیزوں کو جنتی نعمتوں سے کیا نسبت ہے۔ جنت کے اشجار و ثمار دائم و سدا بہار ہیں، ان کو انقطاع و فنا نہیں۔

اکلھا دائم	وہاں کے پھل ہمیشہ رہنے والے۔

یہاں تمام دنیا کو بھی یہ بقاء میسر نہیں۔ جنت میں باغ ہیں، چشمے ہیں۔

ان المتقین فی جنت و عیون۔	نیک پرہیزگار باغوں اور چشموں میں ہیں۔
آخذین بما اتھم ربھم۔	اپنے رب کی عطائیں لیتے ہوئے۔

جنتی عمارت میں ایک اینٹ سونے کی ہے ایک چاندی کی اور اینٹوں کو پیوند کرنے والا مصالحہ نہایت خوشبودار مشک اذفر وہاں کے سنگریزے جو وہاں کی زمین میں بچھے ہیں، جواہرات ہیں، موتی یاقوت وغیرہ، وہاں کی گرد زعفران ہے۔ (ترمذی) جنتی درختوں کی شاخیں سونے کی ہیں۔ (ترمذی) جنتیوں کے لیے بہشتی سیرگاہوں میں جابجا منبر رکھے ہوئے ہیں۔ نور کے منبر، موتی کے منبر، یاقوت کے منبر، زبرجد کے منبر سونے کے منبر، چاندی کے منبر، مشک و کافور کے بلند مقام بنے ہوئے ہیں۔ (ترمذی ابن ماجہ) جابجا موتی، زبرجد، یاقوت کے خیمے اور قبے ہیں، حوروں کے اجتماع کا ایک مقام ہے جہاں وہ بلند آوازوں سے پکارتی ہیں، وہ شیریں اور دلکش آوازیں جو کبھی مخلوق نے نہیں سنیں، کہتی ہیں:

نحن الخالدات فلا نبید و نحن الناعمات فلا نباس و نحن الراضیات فلا نسخط طوبی لمن کان لنا و کنا لہ۔	ہم ہمیشہ رہنے والی ہیں، ہمیں ہلاک و فنا نہیں، ہم وہ صاحب نعمت ہیں کہ کبھی محتاج نہ ہوں، ہم راضی رہنے والی ہیں کہ کبھی ناراض نہ ہوں۔ اسے مبارکباد جو ہمارے لیے ہو اور جس کے لیے ہم ہیں۔

یہ جنت کی فضا ہے۔ جہاں یہ مناظر ہوں، یہ ساز و سامان ہوں، وہاں ارواح کے سرور و انبساط کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اہلِ جنّت کے لباس و فروش

دنیا میں الفاظ نہیں ملتے جس سے جنتی لباسوں اور فرشوں کی نفاست و خوبی کا اظہار کیا جاسکے مگر تفہیم و تفہم کا ذریعہ الفاظ اور رائج لغات کے سوا کوئی اور نہیں ہے، اس لیے بہ مجبوری و ناچاری انہیں کو پیامبرِ مقصود بنایا جاتا ہے۔ تقریب الی الفہم کے طور پر الفاظ میں ان نعمتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو آنکھوں نے نہیں دیکھیں، کانوں نے نہیں سنیں، دلوں میں خطور نہیں ہوئیں، وہم و ادراک کے طائران تک رسائی نہ پا سکے۔۔۔ اہلِ جنت کے لیے ریشمی کپڑے ہوں گے، اس ریشم سے دنیا کے ریشم کو وہ نسبت بھی نہیں ہے جو زربفت و کمخواب کے مقابل ٹاٹ و پلاس کو ہوتی ہے، اس کی چمک آفتاب کی روشنی کو شرما دے، اس کی نرمی و ملائمت بدن کو آرام دینے و مزین کرنے میں جو تاثر رکھتی ہے وہ انشاء اللہ دیکھ کر ہی معلوم ہوگی۔ جنتیوں کے عزت و احترام کے لیے تخت لگائے گئے ہیں، جن پر وہ سریر آراء و مسند نشیں ہوں گے۔ یہ تخت دنیا کے تختوں کی طرح لکڑی و پتھر وغیرہ کے نہیں ہیں، جواہرات کے ہیں اور دنیا کے جواہرات بھی ان کے مقابل پتھر سے کمتر، جنتیوں کو زیور پہنائے جائیں گے اور ان کے اعضائے بدن کو جو دنیا میں مصروف محنت رہے تھے، زیوروں سے آراستہ کیا جائے گا۔ نورانی بدنوں پر جنتی زیوروں کی چمک دمک دیکھنے والوں کی نگاہوں میں تازگی پیدا کرے گی اور ان نعمتوں کا بیان قرآن پاک کی بہت سی آیتوں میں ہے۔ فرمایا:

وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ۔	اور ان کے صبر پر انہیں جنت اور ریشمی کپڑے صلہ میں دیئے، جنت میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوں گے۔

وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ۝ عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ۔ اور جب تو اوپر نظر اٹھائے ایک چمن دیکھے اور بڑی سلطنت، ان کے بدن پر کریب کے سبز کپڑے اور مناویز کے اور انہیں

چاندی کے کنگن سن کر اپنی دنیا کی چاندی پر قیاس نہ کیجئے۔ ان کنگنوں کی شان و صفت حدیث کریم سے معلوم کیجئے۔

لو ان رجلاً من اھل الجنۃ اطلع فبدا اساورہ لطمس ضوئہ ضوء الشمس کما تطمس الشمس ضوء النجوم۔	اگر کوئی جنتی اپنا کنگن ظاہر کرے تو اس کی روشنی آفتاب کی روشنی کو اس طرح محو کر دے جس طرح آفتاب کی روشنی ستاروں کی روشنی کو محو کر دیتی ہے۔

اہلِ جنت کے لباس پرانے نہ ہوں گے، نہ ان کا شباب متغیر ہو گا۔

من یدخل الجنۃ ینعم ولا یباس ولا یبلی ثیابہ ولا یفنی شبابہ۔ (مسلم عن ابی ہریرہ)	اہلِ جنت نعمت دائمی پائیں گے، ان کے کپڑے میلے اور پرانے نہ ہوں گے، ان کا شباب زائل نہ ہو گا۔

جنتی زیوروں اور لباسوں کی نسبت بکثرت آیات و احادیث ہیں، یہاں باختصار بقدر قلیل پر اکتفا کیا گیا۔ جنتی نعمتوں کے انواع و اقسام ہی شمار نہیں کیے جا سکتے، چہ جائیکہ ان کی تفاصیل اور جس قدر تفاصیل بھی آیات و احادیث میں مذکور ہیں، ان سب کو ایک جگہ جمع کرنے کے لیے کئی جلدیں تیار کرنا پڑیں گی، یہاں تو صرف چند چیزیں ذکر کر دی جاتی ہیں تاکہ انسان ایک طرح کا اندازہ کر سکے۔

جنتی بی بیاں

قدرت نے انسان کو ایسی طبیعت پر مجبول فرمایا ہے کہ اس کے پاس انواع و اقسام کی نعمتیں اور دولتیں فراواں موجود ہوں تو وہ سب بے لطف ہو جاتی ہیں اگر یار موافق اور مونس صادق کوئی نہ ہو۔

جنت میں جہاں فضل باری نے ایمان دار بندے پر بے اندازہ نعمتوں کی بے اندازہ بارش فرمائی ہے وہاں بہترین رفیق اور نفیس ترین مونس سے بھی اس کو محروم

نہیں چھوڑا ہے۔ نیک خو، خوبرو، عفت مآب، عصمت قباب، دلجو، رضا طلب پاک بیبیاں، نفیس کنیزیں، پیکر حسن حوریں عطا فرمائی ہیں جو ایسے گل نو شگفتہ کی طرح ہیں جس سے گلچیں کی نظر بھی دوچار نہیں ہوئی ہے۔

ابھی وہ کلام خدا ہے غنچہ نسیم چھو بھی نہیں گئی ہے

پھر ایسے خوبرویوں کے ساتھ لطف صحبت حاصل کرنے کے لیے ایسا ہی عیش منزل درکار ہے۔ آیات و احادیث میں جس قدر تفاصیل صراحتاً مذکور ہیں ان کا احصا تو بہت دشوار ہے، چند آیات پیش کی جاتی ہیں: "ولمن خاف مقام ربه جنتان۔" موقف حساب میں جہاں بندے پروردگار کے حضور میں حاضر ہوں گے، وہاں کی حاضری کا خوف جس کے دل میں رہا اور جو اپنے رب کے حضور حاضر ہونے سے خائف رہا اس کے لیے دو جنتیں ہیں: عقیدے اور عمل کے لحاظ سے رُوحانی و جسمانی۔

تفسیر روح البیان میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندہ کو بہشت میں دو باغ عطا فرمائے گا جن کا طول و عرض سو برس کی راہ ہے۔ ان باغوں میں خوش منظر مکان، نفیس ایوان، دلکش حوریں، دلربا سامان ہوں گے۔ (اس نعمت کا ذکر کر کے فرمایا) تو اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ اب ان دونوں جنتوں کی صفت ارشاد فرمائی کہ وہ جنتیں قسم قسم کے اشجار و ثمار رکھتی ہیں۔ باغ کثیر الاغصان ہیں۔ عطا کا قول ہے کہ جنتی بستانوں کے درختوں میں کثیر شاخیں ہوں گی اور ہر ہر شاخ میں انواع و اقسام کے میوے، تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ان جنتوں میں دو چشمے جاری ہیں اور عجب صفت کے ساتھ کہ ان کی روانی جنتی کے تابع فرمان ہے۔ ہر چشمہ بلندی سے پستی کی جانب بہتا ہے، لیکن یہ جنتی چشمے جس طرف اہلِ جنت چاہیں اس طرف رواں ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام تسنیم ہے، دوسرے کا سلسبیل ہے۔ یہ چشمے ایک مشک کے پہاڑ سے نکلتے ہیں۔

ابوبکر وراق نے فرمایا کہ یہ کرامت رحمت کے ان ایمانداروں کے لیے ہیں جن کی آنکھیں دنیا میں خوف الٰہی سے جاری رہیں۔

تفسیر روح البیان میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ جنت بقا میں ایک چشمہ آب

حیات جاری ہے اور یہ بقاء بعد الفنا ہے اور جنت بقا میں وہ چشمہ ہے کہ جس میں آب علم و معرفت و عظمت جاری ہے' تو اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ (اے اصحابِ سکر و غیبت اور اے اصحابِ صحو و حضور) ان میں ہر ایک میوہ دو قسم کا ہے۔ ایک قسم تو معہود ہے جسے دیکھنے والا پہچانے' دوسری نادر جسے کسی نے دیکھا نہ سنا' تو اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ (ان لذیذ نعمتوں میں سے) اب ان خائفین کا حال بیان کیا جاتا ہے جنہیں جنتیں عطا ہوں گی کہ وہ طرح طرح کے شاہانہ شوکت و شاہانہ عظمت کے ساتھ تکیہ لگائے جلوس کریں گے' ان بستروں پر جن کی اندرونی تہہ (استر) استبرق کی ہے۔ یہ ایک ریشمی نہایت چمک دار' رنگا رنگ' عجیب و غریب نفیس کپڑا ہے اور جنتی ریشم سے دنیوی ریشم کو نسبت ہی کیا۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ جس فرش کا استر یہ ہو گا اس کا بالائی رُخ (ابرا) کیسا کچھ ہو گا۔

سعید ابن جبیر سے دریافت کیا گیا جب بطائن (استر) استبرق کے ہوں گے تو ظاہر (ابرے) کیسے ہوں گے۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: "ھی مما قال اللّٰہ تعالٰی فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین۔" جس کی نظیر و شبیہ آنکھوں نے نہ دیکھی ہو اس کی توصیف کس طرح کی جائے۔

حضرت سعید ابن جبیر نے فرمایا کہ ان فرشوں کے ابرے نورِ خالص کے ہوں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ روئے زمین پر کوئی ان کی تعریف نہیں کر سکتا۔ یہ حال تو یہاں کے فرش کا ہے جس پر ان تخت نشینانِ جنت کے سریر نصب ہیں۔ ان جنتوں کے میوے قریب ہیں کہ کھڑے' بیٹھے' لیٹے ہر حالت میں ان تک ہاتھ پہنچ سکتے ہیں۔ دنیا میں اگر میوہ دار درخت کے پاس بھی جائے تو میوہ حاصل کرنے میں دقتیں ہیں۔ لیٹے ہیں یا بیٹھے ہیں تو اٹھنا اور کھڑا ہونا پڑتا ہے' کبھی کسی چیز سے شاخوں کو پکڑ کر جھکانے کی ضرورت پیش آتی ہے' کبھی درخت پر چڑھنے کی صعوبت برداشت کرنا پڑتی ہے' پھر اس پھل کے قریب کہیں خشک لکڑیاں ہیں' کہیں کانٹے ہیں' خراشیں لگتی ہیں' تکلیفیں ہوتی ہیں' تب میوہ ہاتھ آتا ہے۔ جنت کے اربابِ نعمت کو کوئی تکلیف نہیں' وہ کھڑے ہوں تو میوہ قریب' بیٹھیں لیٹیں تو خود شاخ جھکے اور میوہ

تک پہنچائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ اہلِ جنت کے پاس میوے لے کر درخت خود آئیں گے، وہ جس وضع پر ہوں کھڑے، بیٹھے، لیٹے، اسی حال میں باادب خدمت گار کی طرح ان کی خدمت میں میوہ پیش کریں گے۔ "متکئین علی فرش" کے بعد "جنی الجنتین" کا ارشاد فرمانا بتا رہا ہے کہ اہلِ جنت کو جب سریر آرائی کی عزت و کرامت دی گئی اور جنتی تکیوں پر انہوں نے آرام کیا تو شاخ درخت کو ان کے حضور میوہ پیش کرنا اور ادب کے ساتھ منہ تک پہنچانا اس نعمت کی تکمیل ہے کہ میوہ لینے اور کھانے کے لیے بھی اٹھنے اور آسائش کی نشست چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔ الحمد للہ! اور یہ بات تو اس دل کے سمجھنے کی ہے کہ بعد اور دوری کا منشاء تو جسمانی کثافتیں ہیں اور اہلِ جنت کے اجسام لطیفہ روحانیہ ہیں۔

ع بعد منزل نشود در سفر روحانی

تو انہیں مفت تناول سے واسطہ، تو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

الغرض مناظر دل کشا اور نغماتِ طرب افزا میں جہاں سب کچھ ہے، جنتیوں کے انس کے لیے وہ ساز سراپا ناز بھی ہیں جن کا تذکرہ اس طرح فرمایا کہ جنتوں میں بیبیاں ہیں، نظر رکھنے والی جنہیں ان (جنتی شوہروں) سے پہلے کسی جن وانس نے مس نہیں کیا۔ بیبیوں کی صفت میں فرمایا نظر رکھنے والی۔ عربی کے الفاظ کی جامعیت تو اردو کو حاصل نہیں اس لیے قاصرات الطرف کا پورا ترجمہ تو یہ لفظ ادا نہیں کر سکے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ نازنیناں پاکیزہ انداز اپنے چشم سحر ساز و حیا سے نیچی کیے رہتی ہیں۔ محبوبِ مرغوب کی حیا محب و طالب کے جذباتِ طلب و طرب کو بدرجہا بڑھا دیتی ہے۔ جہاں قاصرات الطرف کے یہ معنی ہیں وہاں اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ دیدہ طلب گار کو غیر کی طرف دیکھنے سے روکنے والی ہیں یعنی ان کے جمال کا یہ عالم ہے کہ جب ان کے جنتی شوہر کی نظر ان پر پڑے تو ان کے کمال حسن سے وہ نظر وہیں رک کر رہ جائے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

یہ معنی بھی ہیں کہ وہ پاکباز بیبیاں اپنی نگاہوں کو غیر کے دیکھنے سے روکنے والی ہیں اور یہی معنی راجح ہیں اور لم یطمثھن کے ملانے سے ایک عجب لطف دیتے ہیں کہ جہاں ان پاکباز اچھوتی بیبیوں کو کسی جن و انس نے نہیں چھوا ہے وہاں ان کی نگاہوں نے بھی کسی دوسرے کو نہیں دیکھا ہے، وہ حریم عفت و حجلہ عصمت کی محترمات ہیں کہ اغیار کی نگاہوں کی گرد ان کے دامن حسن تک نہیں پہنچ سکی ہے۔ باحیا انسان گوارا نہیں کرتا کہ ہرجائی سے دل لگائے یا اپنے محبوب کو کسی دوسرے کی نظر کے سامنے لائے۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیثے تو شنیدن ندہم

وہ آوارہ گرد جن پر صدہا للچائی ہوئی نگاہیں روز پڑتی ہیں اور وہ دزدیدہ اور کبھی شوخ نگاہوں سے غیروں کو دیکھا کرتی ہیں، ہرگز اس قابل نہیں کہ غیرت مند انسان ان کو اپنا ہمراز و دمساز بنائے۔ انہیں دوسرا شوہر اس سے بہتر نظر آگیا یہ دل میں سما گیا تو فتنوں کا دروازہ کھل گیا اور شوہر نظر میں خوار ہو گیا۔ اسی لیے اسلام نے مومنات کو پردہ کی عزت و حفاظت عطا فرمائی۔ جنتی بیبیوں نے اپنی نظر سے دوسرے کو دیکھا ہی نہیں، ان کی نظر شوہر پر مقصود منحصر ہے۔ اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہوا کہ جنتی بیبیاں اپنے شوہروں کو دیکھ کر کہیں گی کہ رب کریم کی عزت و جلال کی قسم! جنت جیسے مقام میں ہمیں کوئی چیز آپ سے پیاری نظر نہیں آئی۔ اس کریم بندہ نواز کا شکر جس نے آپ کو میرا شوہر بنایا اور مجھ کو آپ کی بی بی کیا۔

جنت کی تمام بیبیوں کی یہی صفت ہے خواہ وہ حوریں ہیں، جو جنت ہی میں پیدا کی گئی ہیں، انہیں ان کی پیدائش کے دن سے اپنے جنتی شوہر کے پاس پہنچنے تک کسی نے نہیں چھوا۔ (تف ہے اس نابکار پنڈت پر جو قرآن پاک کی تصریح ہوتے ہوئے اپنے خبث باطن سے بے ہودہ باتیں بکے) یا دنیا کی عورتیں ہوں جنہیں جنت میں نئی زندگانی ملی اور جب سے یہ جنتی زندگانی انہوں نے پائی، یہاں کسی نے انہیں نہیں چھوا۔ (گو دنیا میں وہ اپنے شوہروں کے پاس رہی ہوں) ان نعمتوں کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ تم اپنے

رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ پھر ان جنتی بیبیوں کے حسن و جمال کا ذکر بالا جمال یہ ہے کہ وہ ایسی خوبصورت ہیں گویا کہ وہ یاقوت و مرجان ہیں یعنی ان کے رخساروں کی سرخی اور جلد کی چمک سے کچھ یاقوت و مرجان مناسبت رکھتے ہیں۔

حدیث شریف میں ان کی لطافت جسمی کا یہ عالم بیان فرمایا کہ ان کا مغز ساق استخوان جھلکتا نظر آئے گا۔ پاکی صفائی یہ کہ نہ لعاب دہن ہے، نہ لعاب بینی، نہ کسی اور قسم کا میل کچیل، نہ دوسرے ناپسند و مکروہ طبع فضلات، نہ وہ بیمار ہوں، نہ تھکیں۔ ان کے جسموں سے وہ خوشبوئیں مہکیں جن کی ایک ایک مہک پر تمام عالم کے گلستان قربان، تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ اس میں اشارہ ہے کہ یہ عرفانی حوریں، احسانی کنیزیں تجلیات بسط و انشراح کے یاقوت ہیں اور جلوہ ہائے جمال و کمال کے مرجان ان کی لطافت رخسار کا یاقوت احمر حاکی اور طراوت فطرت کا مرجان ابیض واصف۔

نیکو کاری کا بدلہ بہترین جزا ہی ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس آیت شریفہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جس کو میں نے اپنی معرفت و توحید کی نعمت دی، اس کا بدلہ یہی ہے کہ میں اس کو اپنی جنت اور حظیرہ قدس میں مسکن عطا فرماؤں۔ آیت کا حاصل یہ ہے کہ نیکی کا بدلہ نیکی تو طاعات کی جزا درجات اور شکر کا بدلہ مزید کرم توبہ کا قبول، دعا کا اجابت، سوال کا عطاء استغفار کا مغفرت، دنیا میں خوف الٰہی کا امن، آخرت میں فنا فی اللہ کا بقاء باللہ، بندے کی طرف سے انتہائی نیکی یہ کہ وہ عشق الٰہی میں فنا ہو جائے اور مولیٰ کی طرف سے یہ کرم کہ اس کو وجود حقانی عطا کرے، تو اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ اور ان دو جنتوں کے سوا دو جنتیں اور ہیں یعنی وہ دو جنتیں جن کا خائفین مقربین کے لیے وعدہ کیا گیا تھا اور ان کا ذکر ابھی گزرا ہے، ان کے سوا دو جنتیں اور اصحاب یمین کے لیے ہیں۔ خائفین کی دو قسمیں ہیں: مقربین اور اصحاب یمین۔ مقربین کا مرتبہ باعتبار فضائل علمیہ و عملیہ کے اصحاب یمین سے اعلیٰ ہے اور ایک تفسیر یہ ہے کہ ہر جنتی کو جہات اربعہ میں چار جنتیں ملیں گی تاکہ ایک جنت سے دوسری کی طرف نقل

میں مسرور زیادہ ہو، تو اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ اب ان دو جنتوں کی صفت میں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ گہری سبز ہیں اور غایت سبزی سے سیاہی کی جھلک مارتی ہیں۔ ان جنتوں میں سبزہ اور ریاحین وہاں کی زمین پر اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ دور سے ان کی سبزی نظر آتی ہے، تو اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

ان جنتوں میں دو چشمے ہیں، جوش مارتے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ اہلِ جنت پر خیر و برکت کے فوارے چلاتے ہیں اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ مشک و کافور کے اولیاء اللہ پر اور انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ مشک و عنبر سے اہلِ جنت کے گھروں میں چھڑکاؤ کرتے ہیں، تو اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ان جنتوں میں میوے ہیں، کھجوریں، انار ہیں، تو اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ان جنتوں میں پاکیزہ، برگزیدہ خوبرو، نیک خو عورتیں ہیں (حوریں) حدیث شریف میں وارد ہوا اگر ایک جنتی بی بی آسمان و زمین میں اپنی چمک دکھائے تو تمام زمین و آسمان کی فضائیں اس کی طلعت سے عالم نور بن جائیں اور تمام دنیا اس کی خوشبو سے مہک جائے، اس کی چوٹی کا ایک موباف دنیا و مافیہا کی دولتوں سے بہتر ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ اگر ایک حور سمندر میں تھوک دے تو اس کی غذائیت سے تمام سمندر شیریں ہو جائے، تو اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ حوریں ہیں جنتوں میں پردہ نشین کہ بیگانوں کی نظر ان پر نہیں پڑی۔ یہ جنتی بیبیاں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کی خدمت کے لیے پیدا کیا اور ان کو لباس نور عطا فرمایا اور اپنے حجاب قدس میں سریر انس پر سریر آرا کیا اور ان کے لیے یاقوت و مروارید کے خیمے نصب فرمائے، تو اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ بی بی کی خوبی یہی ہے اور محبوب میں کمال یہی ہے کہ ہرجائی نہ ہو، نظر اغیار سے محفوظ ہو۔ ان جنتی پاک بیبیوں کے وصف میں فرمایا کہ ان کے شوہروں سے پہلے انہیں کسی انس و جن نے چھوا ہی نہیں، تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

جنتی بیبیوں کے تذکرہ میں ہم نے چند آیات کا ذکر کیا۔ بہت آیات و احادیث میں

ان کا بیان ہے اور بہت تفاصیل سے ان کے تذکرے ہیں مگر ایک صاحبِ عقل کے لیے جنتی بیبیوں کے مرتبے معلوم کرنے کے لیے اس قدر بہت کافی ہے جتنا لکھا گیا۔

حیاتِ دوام اور موت سے امن

تمام لذتوں کو بے کیف کر دینے والی جو چیز ہے وہ خطرہ موت ہے، تھوڑی نعمت ہو اور اسی کے ساتھ اندیشہ زوال نہ ہو تو وہ کروڑوں درجہ بہتر ہے۔ اس تمام دنیا کی سلطنت سے جس کے ساتھ دغدغہ زوال اور اندیشہ فنا ہو۔ دنیا کی حیات ہر ساعت، ہر آن کاہش میں ہے اور یہاں ہر شخص کا وقت خطرہ میں گزرتا ہے، نہ کسی نعمت کو بقاء، نہ کسی سرور کو دوام، نہ کسی راحت کو پائیداری، نہ کسی حالت کو قیام۔ ان پر افسوس جنہوں نے زندگانی کی دنیا پر جانیں فدا کر دیں اور یہاں کی بے وفا چیزوں کے عشق میں زندگیاں گزار دیں۔ ان سے زیادہ افسوس کے قابل ان کی حالت ہے جو اپنے اعتقاد میں یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں نیکی اور پارسائی کا نتیجہ خدا کے یہاں سے بھی یہی ملنے والا ہے کہ وہ جون بدل کر پھر دنیا ہی میں بھیج دے۔ ان کے خیال میں ملک خدا بس اتنا ہی ہے جو ان کی آنکھوں کے سامنے ہے اور بقاء دوام اور حیاتِ جاوید کی کسی طرح کوئی سبیل ہی نہیں ہے جیسا کہ اس ملک کے ہنود کا خیال ہے، مگر قرآن پاک نے بتایا کہ دین اسلام کے حلقہ بگوشوں کے لیے حیاتِ دائم اور نعمت باقی ہے، خطرہ موت سے عالم جزا میں ان کو امن ہے، زوال نعمت کے اندیشہ سے وہ بے غم ہیں، نہ ان کی نعمت چھنے، نہ عمر آخر ہو، نہ موت آئے، نہ ملک جائے۔ "لا یذوقون فیہ الموت" اور "ھم فیھا خالدون یبشرھم ربھم برحمۃ منہ ورضوان وجنات لھم فیھا نعیم مقیم خالدین فیھا ابدا۔" انہیں یہ بشارتیں سنائی گئیں۔ جنت کی عالی قدر نعمتیں اور پھر دائم و قائم "لہ الحمد ولہ المنہ۔"

جنتی جو چاہیں گے وہ ملے گا

اہلِ جنت کی نعمتوں کی تفاصیل تو آیات و احادیث میں بہت مذکور ہیں یہاں نہایت اختصار کے ساتھ بہت تھوڑا ذکر کیا گیا ہے، لیکن باوجود ان عظیم و کثیر نعمتوں کے ارشاد فرمایا:

لھم فیھا ما یشاء ون۔ اہلِ جنت جو چاہیں گے پائیں گے۔

یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ اس سے مافوق متصور ہی نہیں۔ بندہ کو جس چیز کی طلب ہو ارادہ کے ساتھ ہی وہ حاضر ہو جائے۔ یہ بات آج تک دنیا میں کسی بادشاہ شہنشاہ کو بھی حاصل نہیں ہوئی جو مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقہ میں ان کے ہر ایک غلام کو انشاء اللہ العزیز الحکیم حاصل ہوگی۔

دیدار الٰہی

تمام نعمتوں سے بلند و بالا اور جملہ دولتوں سے افضل و اعلیٰ، مومن کے دل کی تمنا جان کی آرزو، حضرت رب العزت تبارک و تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار اور قرب حق ہے جس سے اہلِ جنت نوازے جائیں گے اور جس کی بشارتیں قرآن پاک و احادیث میں بکثرت دی گئی ہیں۔ وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرہ۔

جنت کا مختصر تذکرہ عرض کیا گیا ہے۔ پوچھئے اب بھی اسے اپنا مکتی کا خانہ یاد ہے جس میں بھیڑ بھاڑ کا اندیشہ لگا رہتا ہے اور زیادہ عرصہ وہاں ٹھہرنے سے طبیعت گھبرا جاتی ہے اور قیدیوں کی طرح انسانوں کو وقت کاٹنا مشکل ہوتا ہے اور کسی طرح کی کوئی نعمت دولت کا نام و نشان وہاں نہیں ہے۔ مکتی خانہ کے گرفتار الجھنوں کی طرح اڑ کر تھکتے ترستے ہیں۔ عقل والے انسانو! اس نعمت دائم قائم کو حاصل کرو، ایمان لاؤ اور پروردگار عالم کی رضا حاصل کرو۔

آیت کریمہ: وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝ قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ۝

پنڈت جی نے پہلی خیانت تو آیات کی نقل میں کی۔ مسطورہ بالا آیتوں میں سے "سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝" پوری کی پوری چھوڑ دی ہم نے اوپر آیات صحیح نقل کر دی ہیں لیکن ستیارتھ پرکاش میں درمیان کی ایک آیت چھوڑ دی ہے۔ اسی طرح ترجمہ میں بھی اس آیت کا ترجمہ ندارد کر دیا۔ اب آپ ایک نظر آیات کے ترجمہ پر ڈال لیجیے، اس کے بعد پنڈت کا اعتراض پڑھیے۔ آیات مبارکہ کا بامحاورہ ترجمہ یہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے اسماء کا علم عطا فرمایا، پھر ان کو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا کہ مجھے ان چیزوں کے ناموں کی خبر دو اگر تم سچے ہو۔ اپنے اس خیال میں کہ بہ نسبت آدم کے ہم خلافت کے زیادہ مستحق ہیں اور ہمارے پہلے پیدا ہونے کی وجہ سے کوئی مخلوق ہم سے علم میں زیادہ نہیں ہو سکتی، اس کے جواب میں مسمیات ان کے سامنے پیش کر کے فرمایا گیا کہ تم ان کے نام تو بتاؤ تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ تمہارا وہ خیال کہاں تک درست ہے۔ اس کے جواب میں ملائکہ نے جو کچھ عرض کیا وہ اگلی آیت میں ہے۔

ملائکہ نے عرض کیا: تو پاک ہے (تجھ پر اعتراض نہیں ہو سکتا اور یہ ہمارا سوال استفسار اً ہے نہ اعتراضاً) ہمیں علم نہیں مگر جو تو نے عطا فرمایا، بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے کہ کوئی شے تیرے احاطہ علمی سے باہر نہیں اور تیرا ہر فعل حکمت ہے (خواہ اس تک مخلوق کی رسائی ہو یا نہ ہو) اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! تم ملائکہ کو ان مسمیات کے نام بتا دو۔ (یہ حکم پا کر حضرت آدم علیہ السلام نے ہر شے کا نام اور اس کی

حکمت جس کے لیے پیدا کی گئی ہے' بیان فرمائی) جب آدم علیہ السلام نے ملائکہ کو ان مسمیات کے نام بتلائے تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کے غیب جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو سب جانتا ہوں۔

آیاتِ کریمہ کا ایک مختصر ترجمہ تھا جو ناظرین کے سمجھنے کے لیے پیش کر دیا گیا۔ اب اس پر جو پنڈت دیانند کا اعتراض ہے اس کو ملاحظہ فرمایئے کس قدر چسپاں ہے؟ کتنا پُرمغز ہے؟ کس علم و عقل کی خبر دیتا ہے یا کس تعصب و نفسانیت کا اظہار کرتا ہے؟ پنڈت کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

پنڈت کا اعتراض: بھلا اس طرح پر فرشتوں کو دھوکہ دے کر اپنی بڑائی کرنا خدا کا کام ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک (دومبھ) نمود کی بات ہے' اس کو کوئی عالم نہیں مان سکتا اور نہ ایسی لاف زنی کر سکتا ہے۔ کیا ایسی باتوں سے ہی خدا اپنی کرامات جمانا چاہتا ہے۔ ہاں! جنگلی لوگوں میں کوئی ایسا پاکھنڈ چلا لیوے چل سکتا ہے' شائستہ آدمیوں میں نہیں۔

(ستیارتھ باب ۱۴ ص ۶۶۴)

لکھے پڑھے آریہ سمجھ کر بتائیں تو اس اعتراض کا حاصل کیا ہوا۔ چند بے ہودہ خلاف تہذیب الفاظ لکھ دیئے۔ بس یہی قابلیت ہے اور اسی کو اعتراض کہتے ہیں۔ خداوند عالم پر دھوکہ دینے کا ناپاک بہتان اٹھانا کور باطنی ہے۔ یہ نہ بتایا کہ وہ دھوکہ کیا ہے اور آیاتِ مذکورہ بالا میں نظر کر کے ہر شخص جس کو تھوڑا سا بھی علم ہے' سمجھ سکتا ہے کہ ملائکہ نے بدیں خیال کہ وہ پہلے پیدا کیے گئے ہیں' بہت سی چیزوں کو دیکھا ہے جن کو ان کے بعد کا پیدا ہونے والا شاید نہ جانتا ہو' اس لیے ان کو علم وسیع ہو گا اور وہ بہ نسبت دوسری مخلوق کے زیادہ مستحق ہوں گے' یہ عرض کیا تھا "نحن نسبح بحمدک و نقدس لک۔" اس سوال سے مقصود ملائکہ کا اس حکمت کا دریافت کرنا تھا جو حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے میں قدرت نے رکھی تھی اور ظاہر طور پر ملائکہ کی نظر اس تک نہ پہنچتی تھی۔

اس کے جواب میں حضرت رب العزت تبارک و تعالیٰ نے حکیمانہ طور پر ان کو

معائنہ کرا دیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا علم تم سے بدرجہا زیادہ وسیع ہے اور مدارِ فضل واستحقاق خلافت ملائکہ علم ہی کو قرار دیتے ہیں تو اب انہیں خلافت آدم میں کوئی تردد نہ رہا اور یہ انہوں نے ذاتی طور پر معائنہ کے ساتھ پہچان لیا کہ علم کی زیادتی کچھ سبقت خلقت پر موقوف نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے وہب وفضل سے متاخر پر کرم کرے تو وہ متقدم سے علم میں بہت زیادہ اوسع ہو جاتا ہے۔ ملائکہ نے اس کو سمجھ لیا اور اپنی شانِ عبدیت کے ساتھ گردنِ نیاز جھکا دی اور اپنے عجز و قصور علم اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے علم و حکمت اور آدم علیہ السلام کو خلافت عطا فرمانے کی حقیقت پر اظہار عقیدت کیا۔ اسی مضمون کی آیت کو پنڈت جی چھوڑ گئے، دھوکہ تو یہ تھا کہ دو آیتیں نقل کیں اور درمیانی آیت قصداً چھوڑ دی مگر حیاداری دیکھئے کہ پروردگار عالم کی طرف دھوکہ کی نسبت کر دی۔ کیا لکھے پڑھے آریہ ایسے جاہلانہ اعتراض اور جھوٹے افتراء دیکھ کر نہ شرمائیں گے۔ آپ کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ خدا اپنی بڑائی کرتا ہے۔ یہ اعتراض معترض کے خدا شناسی سے بے بہرہ ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ بڑا ہے اور اپنی بڑائی کا اظہار کرنا اس کی شان ہے اور بندے راہ یاب جب ہی ہو سکتے ہیں جب اس کی بڑائی پر ایمان لائیں۔ پنڈت جی کیا خدا کو جھوٹا سمجھتے ہیں اور ان کے اعتقاد میں کیا ایشور کو عجز و انکسار کرنا شایان ہے۔ کیا مطلب ہے اپنے معبود کی انہوں نے کیا عزت سمجھی کھل کر کہیں تو؟

پنڈت جی لکھتے ہیں کہ یہ ایک نمود کی بات ہے۔ کس قدر جہالت ہے۔ خداوند عالم اپنی ذات و صفات اور اپنی عظمت و کبریائی سے بندوں کو خبردار کرے تو یہ اس کا کرم اور بندوں کے خدا شناس اور راہ یاب ہونے کا ذریعہ، پنڈت اس کو نمود کی بات سمجھے تو یہ اس کی نادانی۔ اس سے پوچھئے کہ خدا اپنی صفات نہ بتائے، اپنی عظمت و کبریائی کا اظہار نہ کرے تو مخلوق اسے کیونکر جانے، کیسے پہچانے اور اگر اپنی ذات و صفات ہی کا بتانا مقصود نہ ہو تو کتابوں کا نازل کرنا ہادیوں کا بھیجنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کو لاف زنی کہنا حماقت ہے یا نہیں؟

کیا پنڈت جی کے اعتقاد میں وید میں خدا کے اوصاف کا بیان نہیں ہے۔ اگر نہیں

ہے تو ایسی ردی کتاب کس کام کی اور اگر ہے تو کیا یہ نمود یا لاف زنی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وید کے جو علوم پنڈت کے پیش نظر ہیں، وہی اس کو پریشان کر رہے ہیں۔ وہاں انہوں نے دیکھا ہے کہ خدا کا نام وراٹ یعنی سوتھ یکی ہے، تو جہاں خدا کے ایسے نام سمجھے جاتے ہوں وہ دماغ عظمت الٰہی سے کب واقف ہوگا وہ تو یہیں تک سمجھ سکے گا کہ ناس لینے کے قابل ایک چیز وہ بھی ہے، بھومی یعنی زمین بھی اس کا نام ہے، متر یہ معنی سوریا بہ معنی سورج، آتما بہ معنی روح، پرتھوی بہ معنی زمین، جل بہ معنی پانی، آکاش بہ معنی آسمان، آن بہ معنی غلہ، وسو بہ معنی بستی، چندر یہ معنی چاند اور منگل، بدھ، بر، ہسپت، سکر، سنیچر یہ معنی سہ شنبہ، چہار شنبہ، پنج شنبہ، جمعہ، شنبہ۔ بندھو بہ معنی بھائی، پتا بہ معنی باپ، پتامہ بہ معنی دادا، پرپتامہ بہ معنی پردادا، ماتا بہ معنی ماں۔ یہ سب ایشور کے نام ہیں جو پنڈت جی نے خود اپنی کتاب ستیارتھ کے ص ۷۰ تک لکھے ہیں تو جہاں خدا کے نام پاؤں کے نیچے آنے والی زمین یا برابر کا بھائی یا ہفتہ کے ایام کے ساتھ رکھا گیا ہو وہاں عظمت سے کیا سروکار اور جن دماغوں نے یہ تعلیم پائی ہو وہ عظمت و جلال الٰہی کو کیا جانیں مگر جو دین خدا شناسی کی تعلیم دیتا ہے وہ خدا کی عظمت و جلال سے بندوں کو خبردار کرتا ہے، ممکن ہے کہ کسی سراپا وحشت جنگلی کو اس سے کچھ توحش ہو مگر یہ اس کا اپنا جہل ہے، پھر خدا کی نسبت "کرامات جمانا" یہ لفظ لکھنا پنڈت کی لیاقت کا ایک نمونہ ہے۔

ایسے اعتراض دیکھنے کے بعد پھر سمجھ دار آریوں کا پنڈت کی عقیدت میں گرویدہ ہونا نہایت تعجب خیز اور بہت قابل افسوس ہے۔ اگر آریوں میں آج کل کی تعلیم سے کچھ عقل و تدبر پیدا ہوا تو انہیں پنڈت کے یہ اعتراض دیکھ کر ہی اس کی ہمنوائی سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔

○ ○ ○

اعتراض: آیہ مبارکہ "واذ قلنا للملئکہ اسجدوا" الآیہ کا ترجمہ

پنڈت دیانند نے اس طرح لکھا ہے: جب ہم نے فرشتوں سے کہا سجدہ کرو' آدم کو پس سب نے سجدہ کیا پھر شیطان نے نہ مانا اور تکبر کیا کیونکہ وہ بھی ایک کافر تھا۔ اس پر پنڈت نے یہ اعتراض لکھا ہے:

اس سے یہ ثابت ہوا کہ خدا ہمہ دان نہیں یعنی ماضی' حال' استقبال کی باتیں پورے طور پر نہیں جانتا' اگر جانتا تو شیطان کو پیدا ہی کیوں کیا اور خدا میں کچھ جلال ہی نہیں ہے کیونکہ شیطان نے خدا کا حکم ہی نہ مانا اور خدا اس کا کچھ کر ہی نہ سکا اور دیکھیے ایک کافر نے خدا کے بھی چھکے چھڑا دیے۔ پس مسلمانوں کے خیال میں جہاں کروڑوں کافر ہیں' وہاں مسلمانوں کے خدا اور مسلمانوں کی کیا پیش چل سکتی ہے' کبھی کبھی خدا بھی کسی کی بیماری بڑھا دیتا اور کسی کو گمراہ کر دیتا ہے۔ خدا نے یہ باتیں شیطان سے سیکھی ہوں گی اور شیطان نے خدا سے کیونکہ سوائے خدا کے شیطان کا استاد کوئی نہیں ہو سکتا۔

جواب: اس گندہ زبانی اور فحش گوئی کی کوئی نہایت ہے' بھٹیار خانہ کے اوباش کو بھی مات کر دیا۔ وہ بھی ایسے بے ہودہ کلمات شان الٰہی میں زبان پر لانے کی جرأت نہیں کرتے۔ دنیا کی ذلیل اور جاہل سے جاہل قومیں' چمار بھنگی بھی خالق و مالک کا ادب کرتے ہیں مگر آریہ دھرم کا پیشوا ادب اور تہذیب سے محروم ہے اور اس کی زبان ایسی شرمناک' قابلِ نفرت فحش گوئی سے آلودہ رہتی ہے جس کو دنیا کا کوئی سلیم الطبع انسان سننا گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ اعتراض ہے؟ گالیاں دینے کو اعتراض کہتے ہیں' وید کی تربیت کا یہی ثمرہ ہے اور پنڈت جی اسی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ یہی تعلیم دنیا میں فساد انگیزی اور فتنہ پیدا کرتی ہے اور اسی لئے ملک کی امن و عافیت برباد ہوتی ہے۔ اس افترا کو دیکھیے کہ خداوند عالم کے ہمہ داں ہونے کا انکار قرآن پاک کی اس آیت کی طرف نسبت کر دیا' یہ کیسا صریح جھوٹ ہے۔

آیت مبارکہ میں کون سا ایسا لفظ ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ خدا ہر چیز کا جاننے والا نہیں' باوجودیکہ قرآن پاک میں

عالم الغیب والشھادہ۔ چھپے اور کھلے کا جاننے والا' غائب و حاضر کا دانا۔

وھو بکل شی علیم۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

لا یعزب عنہ مثقال ذرۃ فی السموات ولا فی الارض۔ آسمانوں و زمین میں ذرہ بھر چیز اس پر مخفی نہیں۔

ان تصریحات کے موجود ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ہمہ دان ہونے کا انکار قرآن پاک کی طرف منسوب کرنا کیسا قبیح جھوٹ اور نفرت انگیز بہتان ہے اور یہ قیاس فاسد کہ اگر جانتا تو شیطان کو پیدا ہی کیوں کیا؟ بالکل باطل اور لغو ہے کیونکہ کسی شخص کے مفاسد کا معلوم ہونا نہ اس کی خلقت کے حکمت پر مشتمل ہونے کے منافی، نہ عدم تخلیق کو مستلزم۔ ایسے تو دنیا میں جتنی ضرر کرنے والی چیزیں ہیں سب کی نسبت یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر پنڈت جی سے کوئی پوچھے کہ یہ تمام مخلوقات کس نے پیدا کی تو اگر وہ خدا کی پیدا کی ہوئی نہ بتائیں تو خالق سے جاہل اور انتہا درجہ کے گمراہ کہ انہیں عالم کے پیدا کرنے والے کی بھی خبر نہیں اور اگر یہ کہیں کہ ایشور نے پیدا کی تو پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ سنکھیے (زہر) کو اس نے کیوں پیدا کیا؟ کیا اس کے ضرر کو نہیں جانتا تھا؟ ایسا کہیں تو ایشور کے علم کے منکر اور جانتا تھا تو پیدا کیوں کیا؟ یہ انہی کا سوال ہے جو انہی کی گردن پر سوار ہے۔

ایسے ہی پوچھا جائے گا کہ سانپ اور بچھو کو کیوں پیدا کیا اور سانپ کو مہلک زہر اور بچھو کو ایذا دینے والا ڈنک کیوں دیا؟ ان میں سے کسی بات کا جواب پنڈت جی کے پاس کچھ نہیں، بلکہ پنڈت تو خود اس حیرانی میں ہو گا کہ ایشور نے آریوں کے سوا اور دوسری قوموں کو کیوں اس کثرت سے پیدا کیا۔ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ جو بچہ مسلمان یا عیسائی اور کسی قوم کے گھر میں ہو گا وہ جیو ہتیا کرے گا اور گیئو کا ذبح عام ہو جائے گا اور ویدک دھرم نہ پھیل سکے گا۔ خالی آریوں ہی آریوں کو اولاد دیتا اور کسی کو نہ دیتا تو اتنے اودھری کیوں ہوتے۔ کیا پنڈت جی کا ایشور اتنا نہ جانتا تھا (وہ) ان کے طریقہ پر یقیناً نہ جانتا تھا تو پھر وہ ایشور ہی کیا ہوا؟ ہندوستان میں مٹھی بھر تو آریہ اور تمام دنیا میں بے شمار انسان ان کو جاہل اور گمراہ سمجھنے والے اور ان کے رد کرنے والے، تو کیا ایشور کو خبر نہ تھی کہ وہ جن کو پیدا کر رہا ہے وہ اسی کے دھرم کا ناش کریں گے۔

پنڈت جی یہ اعتراض قرآن پاک کی طرف تو متوجہ بھی نہ ہوا، مگر آپ کے گلے میں ہار بن کر اس طرح پڑ گیا ہے کہ اگر آپ کے تمام متبعین اور احباب مل کر بھی کوشش کریں تو اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

پھر مسلمانوں، عیسائیوں اور تمام ان قوموں کی نسبت پنڈت جی کیا کہیں گے جو آریہ دھرم کو نہیں مانتے بلکہ اس کا کھنڈن کرتے ہیں اور آریہ دھرم کی تعلیم کو رات دن دھڑا دھڑ توڑتے رہتے ہیں اور اس کو تہذیب و انسانیت، غیرت و حمیت کے خلاف قرار دیتے ہیں، کیا ان کے محاورہ میں اس سے ایشور کے چھکے چھوٹ گئے اور وہ ٹک ٹک دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ کچھ نہ کر سکا کہ اس کے ملک میں عام طور پر اس کے قانون کی توہین کی جارہی ہے اور وہ دم نہیں مار سکتا۔ جس شخص نے ایک شیطان کی نافرمانی کو خالق کا عجز قرار دیا ہو، وہ تمام عالم کی مخالفت اور ایشوری قانون کی توہین کو بجز اس کے کیا کہہ سکتا ہے کہ ایشور ان سے دب گیا، ڈر گیا اور ان کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکا۔ دوسری قوموں نے حکومت کی مسندوں پر بیٹھ کر ایشور کے بھگتوں کی گردنوں میں اپنی اطاعت کی رسیاں ڈالیں اور اپنے قانون کے سامنے ان کی گردنیں جھکائیں، اپنی حکومتوں کا غلام بنایا مگر آریوں کا مجبور، بے کس، کمزور، ناتواں، عاجز ایشور انہیں رہا نہ کرا سکا۔

یہ پنڈت جی ہی کا اعتراض ہے جو پنڈت صاحب کی طرف عود کر رہا ہے۔

اعتراض کرتے وقت پنڈت صاحب کو یہ خیال نہیں رہتا کہ حملہ جو ہم دشمن پر کر رہے ہیں یہ ہمیں کو گھائل کر دے گا۔ اگر پنڈت جی یہ کہیں کہ دنیا اگر نافرمانی کرے تو وہ مجرم ہوگی، مالک انہیں جب چاہے گا سزا دے گا جتنی چاہتا ہے مہلت دیتا ہے، اس سے اس کی کمزوری نہیں پائی جاتی تو پھر ان سے کہا جائے گا کہ شیطان کی نافرمانی پر آپ نے بھی کیوں نہیں سمجھا کہ وہ مجرم ہے، عدالت الٰہی سے سزا پائے گا جب تک مہلت ہے اس وقت تک چھوٹا ہوا ہے، جب گرفت کی جائے گی تو نہ کہیں بھاگ سکتا ہے، نہ بچ سکتا ہے۔ قادر مطلق کے اختیار میں ہے جب چاہے سزا دے۔ قرآن پاک نے تو مضمون بیان بھی فرما دیا ہے: "انک لمن المنظرین الی یوم الوقت المعلوم۔"

یہ اعتراض ایسا تھا کہ پنڈت جی تو لکھ گئے لیکن دیہاتی مدارس کا سمجھدار لڑکا بھی

ایسا نکما اور زہر اپلی اعتراض زبان پر لاتا گوارا نہ کرتا۔ پنڈت جی نے اپنی نرالی قابلیت سے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ کبھی کبھی خدا بھی کسی کی بیماری بڑھا دیتا ہے اور کسی کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اس پر پنڈت جی نے ایسے ناقص کلمے لکھے ہیں جو انہیں کی تہذیب کے شایان ہوسکتے ہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ دنیا میں بیماری پیدا بھی ہوتی ہے، بڑھتی بھی ہے، بڑھتے بڑھتے ناقابل علاج بھی ہو جاتی ہے۔ اس سے ہلاکت واقع ہوتی ہے، ان کے نزدیک یہ تمام باتیں ایشور تو کر نہیں سکتا ورنہ اسے شیطان کا شاگرد ہونا پڑے، یا اگر شیطان کا وجود وہ نہ مانتے ہوں تو کسی اور مہاشے کی جوتیاں سیدھی کرنی پڑیں، اس لیے بیماری، وباء، مرض کی پیدائش، اس کی زیادتی، آتش زدگی، غرق سیلاب اور تمام آفات ارضی و سماوی جن سے مخلوق کی ہلاکت یا نقصان ہوتا ہے۔

یہ سب پنڈت جی کے عقیدے میں ضرور ایشور کے احاطہ قدرت و اختیار سے باہر ہیں تو اب پنڈت بتائے کہ ایسا کون سا ایشور کا دشمن ہے جو ایشور کی بنائی ہوئی مخلوق کو برباد اور ہلاک کر ڈالتا ہے اور ایشور کی اس سے کچھ پیش نہیں جاتی۔ اب اگر پنڈت جی کوئی اور دوسرا ایشور سے بڑا قادر و متصرف تجویز کریں جب تو آریہ دھرم کا دعویٰ توحید باطل اور پھر مجبور کو قابل پرستش معبود سمجھنا حماقت اور اگر دوسرا نہ مانیں تو دنیا میں یہ تصرفات کون کرتا ہے۔ ایشور کرتا ہے تو اس نے کس مدرسہ میں تعلیم پائی ہے، اپنے ہی قاعدہ سے سوچیں اور بتائیں پنڈت اور اس کے ہم خیال دیکھیں کہ پنڈت کے اعتراض نے خود اس کا کام تمام کر دیا۔

○ ○ ○

اعتراض: اور کہا ہم نے اے آدم تو اور تیری جورو بہشت میں رہ کر کھاؤ، تم بافراغت جہاں چاہو پھرو، مت نزدیک جاؤ اس درخت کے کہ گناہ گار ہو جاؤ گے۔ شیطان نے انہیں گمراہ کر دیا اور ان کو بہشت کے عیش سے کھو دیا۔ تب ہم نے کہا کہ اترو بعض تمہارے میں بعض کے دشمن ہیں اور تمہارا ٹھکانا زمین پر ہے اور ایک وقت تک فائدہ

ہے۔ پس سیکھ لیں آدم نے پروردگار اپنے سے کچھ باتیں، پس وہ زمین پر آ گیا۔

یہ تو پنڈت جی نے آیتوں کا ترجمہ گھڑا، اب اعتراض لکھتے ہیں:

محقق (اپنے منہ میاں مٹھو) دیکھیے خدا کی کم علمی، ابھی تو بہشت میں رہنے کا اعزاز بخشا اور ابھی کہا کہ نکلو اگر آیندہ کی باتوں کو جانتا ہوتا تو بہشت میں رہنے کا عطیہ ہی کیوں دیتا؟ اور معلوم ہوتا ہے کہ بہکانے والے شیطان کو سزا دینے سے بھی قاصر ہے۔ وہ کس لیے پیدا کیا گیا تھا کیا اپنے لیے یا دوسرے کے لیے، اگر دوسروں کے لیے تو کیوں آدم کو روکا۔ اس لیے ایسی باتیں نہ خدا کی اور نہ اس کی بنائی ہوئی کتاب کی ہو سکتی ہیں۔

جواب: قرآن پاک وید کی طرح نہیں جس کا ترجمہ تلاش کرنے سے بھی نہ مل سکے، بلکہ قرآن کریم کے بے شمار ترجمے اور تفسیریں ہر زبان میں ہر مقام پر بکثرت ملتے ہیں اور جو کتاب دنیا کی ہدایت اور رہنمائی اور دین حق کی تبلیغ و دعوت کے لیے ہو اس کی تعلیم کا ایسا عام ہونا ضروری ہے اور جو کتاب ڈھونڈے نہ ملے اور اس کا ترجمہ بہ دقت و دشواری ہاتھ نہ آ سکے، اس کے طلب گار محروم ہی رہا کریں۔ اس کتاب کی نسبت یہ دعویٰ کرنا کہ وہ تمام عالم کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ہے، بالکل غلط ہے۔

ایک سوداگر اپنی تجارت کو وسیع کرنے کے لیے مختلف زبانوں میں اشتہار چھاپ کر دنیا میں اپنے مال کی شہرت پھیلا دیتا ہے اور بچہ بچہ اس سے باخبر ہو جاتا ہے، کبھی چائے اور سگریٹ کے اشتہار دیکھے ہوں گے مگر تعجب ہے کہ جس کتاب کی نسبت یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ خدا شناسی کی راہ بتاتی ہے اور اس پر دنیا کی نجات کا دارومدار ہے، ہر انسان پر اس کی طاعت لازم ہے اور وہ ایشور کی کتاب ہے۔ وہ اس قدر نایاب ہو کہ ڈھونڈے نہ ملے، اس کا ترجمہ ہاتھ نہ آئے باوجودیکہ یہ بھی دعویٰ ہو کہ وہ کتاب ابتدائے دنیا سے ہے اور دو ارب سال کے قریب اس کو ہو گئے، اتنے طول طویل زمانہ میں بھی اس کتاب کا کچھ فروغ اور اشاعت نہ ہوئی ہو۔ نہ ایشور اس کو عام کر سکا، نہ اس کے معتقدین اس کتاب کو پھیلا سکے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ یقیناً خدا کی طرف سے انسانوں کی ہدایت کا ابدی قانون نہیں ہو سکتا، ورنہ ضرور وہ ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں پہنچ کر رہتا۔ نیز جو کتاب انسانوں کی ضرورتوں پر مشتمل اور ان کے لیے مفید ہو، اگر

اس کا مصنف اس کی اشاعت میں سعی و کوشش نہ کرے، تب بھی وہ عام ہو جاتی ہے اور دنیا قدر و شوق کے ساتھ اس کو حاصل کرنے، محفوظ رکھنے اور اپنے رفیقوں کو پہنچانے پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ تحریر اقلیدس کو اس کا مصنف نہیں لیے پھرا، نہ اس نے اپنی کتاب کی اشاعت کے لیے کوئی محنت اٹھائی مگر کتاب کے فوائد اور اس کے علمی کمال نے قدردانوں کے دلوں کو اس کا ایسا گرویدہ کر دیا کہ وہ کتاب دنیا میں پھیل گئی۔ گلستان بوستان وغیرہ بچوں کے پڑھنے کی کتابیں چونکہ درستی اخلاق میں کار آمد ہیں، اس لیے زمانہ میں ان کی اشاعت اس قدر عام ہوئی کہ ہر جگہ وہ کتابیں اور ان کے ترجمے اور ان کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے والے بہ آسانی مل جاتے ہیں۔

وید خدا کی کتاب نہ بھی ہوتی مگر اس میں انسانوں کے حق میں کوئی مفید تعلیم یا کچھ کار آمد باتیں بھی ہوتیں تو وہ یقیناً قدر کے ہاتھوں میں لی جاتی اور آج دنیا میں ہر جگہ وہ کتاب اور اس کے ترجمے اور اس کے جاننے والے با آسانی ملتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی کتاب ہونا درکنار، وید کوئی مفید اور علمی کتاب بھی نہیں ہے۔

اور آج تو آریے آپے سے باہر ہیں، اشدھی کے علم لیے پھرتے ہیں، دنیا کی قوموں کو اپنے مذہب کی دعوت دیتے ہیں۔ اس حالت میں تو ضرور تھا کہ وہ اپنی کتاب کے ترجمے چھاپ چھاپ کر عیسائیوں کی انجیلوں کی طرح تقسیم کرتے، تاکہ آئندہ کے لیے تو یہ داغ کچھ ہلکا ہوتا، کہ دنیا نے اس کتاب کو محض بے کار سمجھا اور اس کے کسی ایک حصہ میں بھی نہ پھیل سکی۔ ہندوؤں میں رامائن کا تو رواج ہو جائے، پوران تک تو ذوق شوق سے دیکھے اور پڑھے جائیں، لیکن وید کو کوئی نہ پوچھے، اس الزام کو دور کرنے کے لیے نہایت ضروری تھا کہ آریہ وید اور اس کے ترجمے بکثرت شائع کراتے اور ہر ہر گھر اور ہر ہر ہاتھ میں اس کی کاپیاں پہنچا دیتے اور ضرور آریہ ایسا کرتے، جب وہ اشدھی کے لیے روپے کو پانی کی طرح بہا رہے ہیں تو وید کی اشاعت پر روپیہ خرچ کرنے میں انہیں کیا دریغ ہوتا، اگر وہ جانتے کہ اس میں شرمناک اور قابل نفرت باتیں نہیں ہیں، عمدہ اور نفیس مال جس کا رائج کرنا منظور ہو، ضرور منظر عام پر لایا جاتا ہے۔ بازاروں اور نمائشوں میں ایسے طریقے سے رکھا جاتا ہے کہ ہر شخص کی اس پر نظر پڑے لیکن کھوٹا

مال اور قابلِ نفرت چیزیں اہلِ نظر کے سامنے پیش کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ وید کس حال میں ہے۔

قرآن حکیم بفضل اللہ الکریم ہر کتب خانہ میں موجود' ہر بازار میں موجود' ہر مسلمان کے گھر میں موجود' ہر مومن کی زبان پر جلوہ افروز۔ اس کے ترجمے تفسیریں' ہر ملک میں ہزاروں ہیں۔ ہر براعظم میں' ہر شہر و ہر قصبہ میں اور گاؤں تک میں بکثرت موجود مگر پنڈت صاحب کی قابلیت افسوس کہ ایسی کتاب پر اعتراض کرنے بیٹھے تو کوئی تفسیر پہلے دیکھ یا پڑھ کر اس کا صحیح مطلب سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ قرآن پاک کے ترجمہ و تفسیر کا میسر آنا تو کچھ دشوار نہ تھا۔ خود نہ پڑھ سکتے تو کسی سے پڑھا کر سن لیتے۔ یہ کیسا اعتراض ہے کہ کلام کا مطلب سمجھنا درکنار صحیح ترجمہ بھی معلوم نہیں مگر اعتراض ہو رہا ہے اور اس پر آپ اپنے آپ کو اپنے منہ محقق بھی کہتے ہیں۔ آپ کی تحقیق کا تو یہ عالم ہے کہ جس کلام پر بڑے افتخار کے ساتھ اعتراض کرتے ہیں اس کے مفہوم و مراد تک تو کیا رسائی ہوتی' لفظی ترجمہ تک سے ناآشنا اور محض بے خبر تو جو بات آپ بغیر تحقیق کے فرماتے ہوں گے' اس کا کیا حال ہو گا۔ یہ ہیں آریہ مذہب کے پیشوا اور اس تحقیق پر آریوں کو ناز ہے۔

آریو! میں خیر خواہی اور ہمدردی سے کہتا ہوں' تعصب کی غلط کاریوں اور دروغ بیانیوں کی بلا سے بچو اور ایسے محقق سے دور بھاگو جس کے اعتراض صداقت و راست بازی کا خون کرتے ہیں۔ سچائی قبول کرو اور سچ کے شیدائی بنو۔ اسلام کے سایہ رحمت میں آؤ اور خدا شناسی و خدا رسی کی نعمتوں سے بہرہ یاب ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں توفیق دے۔

پنڈت دیانند صاحب نے آیہ کریمہ "وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ" الآیہ کا ترجمہ کیا ہے جس کو ہم اوپر مع ان کے اعتراض کے نقل کر چکے ہیں۔ اس میں زوج کا ترجمہ لفظ جورو سے کرنا مترجم کے سلیقہ کو اور تمیز کو ظاہر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ کس طبقہ کا انسان ہے۔ ازل کا ترجمہ گمراہ کیا ہے جو اضل کا ترجمہ ہو تا مگر اتنا علم کہاں سے آتا کسی اسلامی مدرسہ کا طالب علم بھی بتا سکتا ہے کہ گمراہ کیا اَضَلَّ کا ترجمہ ہے' نہ اَزَلَّ کا مگر پنڈت جی

بایں دعوئ محققیت کچھ شعور نہیں۔ اسی آیت کے ترجمہ میں آپ لکھتے ہیں: پس وہ زمین پر آ گیا۔ آیت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا یہ ترجمہ ہو۔ یہ جناب نے اپنی طرف سے بڑھا دیا اور "فتـاب عـلـيـه" کا ترجمہ بالکل ندارد کر دیا، پر ہنر یاد ہیں۔ مضمون کی قطع برید اور اس کو کچھ سے کچھ کر دینا یہ آپ کا ترجمہ ہے، اس ترجمہ پر جو اعتراض ہوگا عاقل کی نظر میں اس کی کیا حقیقت اور کیا وقعت۔ یہ اعتراض آپ کی اپنی عبارت پر ہوا جو کتاب مقدس کے مضمون میں قطع برید کرکے بنائی ہے، کتاب پاک سے اس اعتراض کو کیا علاقہ۔

اب یہ بھی غور کیجیے کہ پنڈت صاحب نے ایسا کیوں کیا۔ اس کے دو ہی باعث ہو سکتے ہیں یا تو جہالت و نادانی یا تعصب و باطل کوشی۔ اگر جہالت سے یہ بات ہوئی تو جاہل کی نافہمی اور اس کا جاہلانہ اعتراض اہلِ خرد کے سامنے خود اس کو رسوا کرتا ہے اور اس کی زبان طعن اس کی سفاہت کا پتا دیتی ہے۔ ایسے جاہلانہ اعتراضوں سے کسی کتاب کی عزت کم نہیں ہو سکتی، کیونکہ جو بے علم کودک ایک کتاب کا مضمون سمجھنے کی لیاقت بھی نہ رکھتا، وہ اعتراض کرے گا تو اپنی ہی فہم ناقص اور تخیل باطل پر کرے گا۔ کتاب تک تو اس ذکھیا کی رسائی ہی نہیں۔ اب اس اعتراض کو جو قوم سرمایہ ناز بنائے، اس کی نادانی و جہالت کس قدر قابلِ افسوس ہے کہ وہ ایک فہم سے معرا، علم و لیاقت سے ناآشنا شخص کے پیچھے آنکھیں بند کر کے ہو لیے اور وہ اپنی بے خردی سے جو کہتا رہا، یہ سب اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ سارا گھرانہ ہی علم و عقل سے کورا ہے۔

اور اگر یہ کہتے کہ پنڈت صاحب بڑے پورے عربی دان اور فاضل مطلب سمجھنے کی لیاقت تو رکھتے تھے مگر اعتراض قائم کرنے کے لیے اصل کتاب کے مضمون میں انہیں گھٹانا بڑھانا پڑا تو یہ بات اور بھی ان کو ساقط الاعتبار کرتی ہے اور اعتراض و معترض دونوں کی وقعت کھوتی ہے اور یہ بھی بتاتی ہے کہ ایسا خائن بد دیانت شخص جو کسی کتاب کی عبارت کا ترجمہ کرنے بیٹھے تو صرف اس لیے کہ اس کو اعتراض کا موقع ملے۔ اس کتاب کے مضمون میں قطع برید کر جائے، اس کے جملوں کا ترجمہ چھوڑ دے اور جو اس میں نہ ہو اپنی طرف سے ملا دے، نہایت سیاہ باطن اور گمراہ شخص ہے۔ اس سے دور رہنا

اور اس کی بات سننے سے احتراز کرنا عاقل کے لیے ضروری ہے۔ جو قوم ایسے شخص کو مذہبی پیشوا بنائے وہ ضرور ضرور گمراہ ہے اور کبھی اس کو راہ راست نصیب نہ ہو سکے گی۔ مذہب کی پیشوائی کا مدعی اور صداقت کا دشمن، اس کے ہاتھ دیانت داری اور امانت کے خوگر نہیں تو وہ دوسروں کو کیا تعلیم دے گا۔ ظاہر ہے کہ جو اس کا اتباع کرے گا اس کا یہی ہنر سیکھے گا۔ اس قوم کی حالت زار پر رحم جو نادانی سے ایسے شخص کو پیشوا بنا بیٹھے اور اپنی زندگی اس پر قربان کر ڈالے۔ اب ذرا یہ ملاحظہ کیجئے کہ پنڈت نے یہ تمام معصیت اٹھا کر اور عبارت کو کچھ کا کچھ کر کے اعتراض گھڑے، وہ اعتراض کتنی حقیقت رکھتے ہیں۔ آپ نے آیت کے ترجمہ میں اس قدر ناجائز تصرفات اور دیانت و شرافت کا خون کر کے تین اعتراض کیے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ خود پنڈت کے بنائے ہوئے ترجمہ پر بھی وہ اعتراض چسپاں ہوتے ہیں یا نہیں۔ اگر باوجود اس معصیت و رسوائی کے جو نادان معترض نے شوق اعتراض میں گوارا کی ہے، پھر بھی اعتراض بے محل ہوا تو یہ معترض کی نفسانیت کا ایک اور ثبوت اور اس کی کور باطنی کی تازہ دلیل ہوگا۔ اب میں پنڈت جی کے وہ تینوں اعتراض نمبروار لکھتا ہوں، ملاحظہ فرمائیے:

(۱) دیکھئے! خدا کی کم علمی ابھی تو بہشت میں رہنے کا اعزاز بخشا اور ابھی کہا کہ نکلو اگر آئندہ کی باتوں کو جانتا تو بہشت میں رہنے کا عطیہ ہی کیوں دیتا؟

(۲) معلوم ہوتا ہے بہکانے والے شیطان کو سزا دینے سے قاصر بھی ہے۔

(۳) وہ درخت کس کے لیے پیدا کیا تھا؟ کیا اپنے لیے یا دوسرے کے لیے؟ اگر دوسروں کے لیے تو کیوں آدم کو روکا۔

اب آپ بالکل ناطرفداری اور انصاف کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے کہ پنڈت صاحب یہ اعتراض قرآن حکیم سے تو کیا علاقہ رکھتے، خود پنڈت جی کے گھٹا بڑھا کر بنائے ہوئے ترجمہ پر بھی چسپاں ہوتے ہیں اگر اس پر بھی چسپاں نہ ہوں تو اس اعتراض کرنے پر کروڑ تف ہے۔

پہلے اعتراض میں ایک تو یہ افترا و بہتان کہ ابھی تو بہشت میں رہنے کا اعزاز بخشا اور ابھی کہا کہ نکلو یعنی اعزاز بخشتے ہی فوراً نکلوا دیا اور جنت میں آدم علیہ السلام کو

ٹھہرنے کا ذرا بھی موقع نہ دیا۔ یہ مضمون نہ قرآن کریم میں ہے‘ نہ پنڈت کے اپنے گھڑے ہوئے ترجمہ میں۔ کس قدر شرمناک بات ہے کہ کسی کتاب پر اعتراض کرنے کے لیے اپنا منہ کالا کر کے اس کے ترجمہ میں قطع برید بھی کی جائے اور پھر بھی اعتراض اس پر وارد نہ ہو سکے تو اس کتاب پر ایک بہتان اٹھایا جائے اور جس مضمون کی اس کتاب میں اور اپنے گھڑے ہوئے ترجمہ تک میں ہوا نہ ہو‘ اس مضمون کو کتاب قرار دے کر منہ چڑایا اور اعتراض کیا جائے۔ رسوائی پر رسوائی اور پھر ذلت پر ذلت اور مزید ذلت یہ کہ اتنے طوفان اٹھا کر بھی اعتراض چسپاں نہیں۔ ابھی اعزاز بخشا اور ابھی چھین لینا کیا قادر و حکیم کی قدرت و حکمت کے خلاف اور اس کے عدم علم کی دلیل ہے۔

یہ پنڈت کو کس نے بتایا‘ کیا اس نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا کہ ابھی بچہ پیدا ہوا اور آنکھ کھولتے ہی مر گیا۔ قادر مطلق نے ابھی اس کو زندگی کا اعزاز بخشا اور ابھی حکم دیا کہ دنیا سے نکلو اور نکال دیا۔ تو کیا یہ پنڈت کے اعتقاد میں ایشور کی کم علمی ہے کہ جسے فوراً موت دینی تھی اس کو زندہ ہی کیوں کیا‘ یا پیدا کرنا اور مارنا ایشور کے سوا کسی اور کا فعل ہے۔ لاکھوں جان دار پیدا ہوتے ہیں مر جاتے ہیں‘ کروڑوں درخت زمین سے برآمد ہوتے ہیں نیست و نابود ہوتے رہتے ہیں‘ تو کیا یہ پنڈت کے نزدیک ایشور کی بے علمی کے دلائل ہیں اور پنڈت کو یہ کہنا گوارا ہوگا کہ اگر ایشور کو معلوم ہوتا کہ انہیں پیدا کرتے ہی فنا کرنا ہوگا تو انہیں پیدا ہی نہیں کرتا۔

بندہ کو افعالِ الٰہیہ کی حکمت کا معلوم ہونا ان افعال کے عبث ہونے کی دلیل نہیں اور جو ایسا سمجھے وہ نہایت گستاخ تو جہل مرکب میں گرفتار ہے‘ بندوں کو کسی منصب پر پہنچانا عزت دینا سلطنت دینا یہ سب کام خدا ہی کے ہیں‘ اسی کی قدرت سے ہوتے ہیں‘ پھر بہت مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کامیابی کے ساتھ ہی ناکامی بھی ہو جاتی ہے۔ کسی منصب پر پہنچتے ہی اس سے محروم ہو جاتے ہیں۔ سلطنت پاتے ہی اتار ڈالے جاتے ہیں‘ اگر ان سب کو دلائل بے علمی بتائیے تو پنڈت کو اس کے مزعوم ایشور کی بے علمی پر بے انتہا دلائل ملیں گے۔ اپنی بے علمی کو قادر علیم کی طرف منسوب کرنا آدمی کے لیے انتہائی کمینہ پن ہے۔

حقیقت اعتراض تو ظاہر ہو گئی اور ثابت ہو گیا کہ یہ جاہلانہ اعتراض معترض کی نافہمی کی دلیل ہے۔ علاوہ بریں قرآن پاک پر اعتراض وارد ہو نہیں ہوتا کیونکہ اس میں کہیں یہ ہے نہیں کہ حضرت آدم کو جنت میں داخل کرتے ہی وہاں سے علیحدہ کیا گیا۔ البتہ یہ اعتراض پنڈت پر وارد ہوتا ہے اور غیر متناہی مرتبہ وارد ہوتا ہے۔

پنڈت کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ (خدا) بھکانے والے شیطان کو سزا دینے سے بھی قاصر ہے۔" پوچھئے پنڈت سے کہ قرآن پاک کے کس لفظ سے معلوم ہوتا ہے؟ کس عبارت کا یہ ترجمہ یا مطلب ہے؟ سارے اعتراض افتراء ہی کی بنیاد پر ہیں جو قرآن پاک میں نہیں ہے اس کو قرآن پاک کی طرف نسبت کر کے اعتراض کرنا بس معترض کی اتنی ہی قابلیت ہے یا اس نے یہ سمجھا کہ ابھی تک شیطان کو کوئی ایسی سزا نہیں دی گئی جو پنڈت کی سمجھ میں آ سکتی تو کس مجرم کو فی الفور سزا دینا حاکم پر لازم نہیں؟ وہ تو بمقتضائے حکمت، مقدمہ کی سماعت اور فیصلہ کے لئے کوئی وقت معین کرتا ہے اور جرم کے صدور سے ایک عرصہ کے بعد سزا دیتا ہے۔

اس کے یہ معنی کوئی نادان سے نادان بھی نہیں سمجھے گا کہ حاکم سزا دینے سے مجبور ہے اور اس کو سزا پر قدرت نہیں۔ کیا پنڈت جی کے نزدیک مسلمان، عیسائی، بت پرست ہندو اور آریوں کے سوا باقی تمام قومیں جو آریہ دھرم کا ناش کرتی ہیں، ایشور کی مجرم اور خطاوار نہیں۔ اگر یہ کہئے تو ثابت ہوتا ہے کہ آریہ دھرم باطل ہے کہ اس کا رد کرنے والا، اس کو باطل سمجھنے والا، اس کے خلاف عمل کرنے والا خطاوار بھی نہیں ہوتا۔ اگر کہے کہ مجرم ہے تو ان مجرموں کو ایشور نے چھوڑ رکھا ہے اور چھوڑ بھی ایسا رکھا ہے کہ آریہ ان کے غلام ہیں اور وہ ان کے حکمران۔ یہ رعیت ہیں اور وہ ان کے بادشاہ تو پنڈت صاحب کیا فرمائیں گے، اس سے ایشور کا قاصر و عاجز ہونا ثابت ہوا یا پنڈت صاحب کا علم و عقل سے بے تعلق ہونا۔

دنیا میں کتنے بد افعال کرنے والے ہیں جو طویل زندگانی جیتے اور دنیا کی طرح طرح کی نعمتیں پاتے ہیں اور زندگی بھر انہیں کوئی سزا نہیں ملتی تو کیا پنڈت جی کے نزدیک ان کا ایشور انہیں عمل کا بدلہ اور سزا دینے سے قاصر و عاجز ہے۔ کس منہ سے پنڈت جی

نے قرآن پاک پر اعتراض کیا تھا جس کی صحت کی کوئی توجیہ کسی طرح ممکن نہیں۔

تیسرا اعتراض پنڈت جی کا یہ ہے کہ "وہ درخت کس کے لیے پیدا کیا تھا' اپنے لیے یا دوسرے کے لیے' اگر دوسرے کے لیے تو کیوں آدم کو روکا؟"

ایسے مہمل و لایعنی اعتراض اس قابل تو نہیں کہ ان کی طرف التفات کیا جائے مگر چونکہ آریوں کو اس پر بہت فخر ہے اور اگر کوئی اعتراض چھوڑ دیا جائے تو اپنی جماعت میں وہ یہ کہہ کر راجہ بننے کی کوشش کریں گے کہ فلاں اعتراض کا جواب نہ ہوا' اس لیے ان کی عقل مندی کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات تو بندہ کی شان سے بہت بعید ہے اور کسی خدا شناس کی زبان سے نکل بھی نہیں سکتی کہ وہ درخت خدا نے اپنے لیے پیدا کیا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی خدا اور اس کی صفات کمال کو جانتے ہی نہ تھے' ورنہ ایسا لفظ زبان پر لانے کی جرأت نہ کرتے۔ دوسری بات یہ کہ جو چیز اپنے لیے نہ ہو اس سے کسی کو کسی وقت میں منع کرنا درست نہیں۔ یہ بات اہل عقل کے نزدیک تو باطل ہے۔ پنڈت صاحب ہی ایسا کہہ سکتے ہیں۔

کیا پنڈت جی کے دھرم میں کوئی چیز ممنوع نہیں ہے' اگر ہے تو وہ ایشور نے اپنے لیے پیدا کی ہے یا اوروں کے لیے کی ہے تو منع کیوں کرتا ہے۔ اپنا یہی اعتراض وہ دیکھ لیں کہ ان کے مذہب کے ہر ہر ممنوع پر وارد ہوتا ہے۔

پنڈت جی کارخانہ عالم کے اس اصول سے بالکل بے خبر ہیں کہ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک مخلوق کے لیے قابل استعمال ہوتی ہیں۔ دوسری کے لیے نہیں تو اس کی نسبت یہ سوال محض بے معنی ہے کہ جب یہ خدا کے لیے نہیں ہے تو اوروں کو اس سے کیوں روکا جاتا ہے؟ یعنی ہر شخص اسے استعمال کرے۔ خدا تو اس سے پاک ہے کہ کسی چیز کی اس کو حاجت ہو تو اب جتنی چیزیں دنیا میں ہیں' اس کے استعمال کرنے والی مخلوق ہی ہے۔

تو پنڈت جی کے قاعدہ سے چاہیے کہ یہاں کی کسی چیز سے بھی کسی کو منع نہ کیا جاتا مگر پنڈت صاحب کا عمل خود بھی اس کے خلاف ہے۔ ایک دانہ زمین سے جمتا ہے' اس سے دانہ اور بھوسہ دونوں پیدا ہوتے ہیں' دانہ تو پنڈت جی خود کھا لیتے ہیں' بھوسہ

کو اپنے لیے کیوں ناجائز سمجھتے ہیں، اس وقت انہیں اپنا یہ اعتراض یاد نہیں آتا، بھوسہ گائے بیل کو دے دیتے ہیں اور دانہ سے اس کو ماتا کہہ کر ہی روکتے ہیں اور اپنا یہ اعتراض بھول جاتے ہیں، لاکھوں مثالیں ہیں جہاں ایک جز کو مخلوق استعمال کرتی ہے، دوسری کو نہیں کرتی اور اس کے لیے استعمال مناسب ہوتا ہے۔ دوسرے کے لیے نامناسب اور تقاضائے حکمت یہی ہے کہ نامناسب بات سے منع کر دیا جائے، بلکہ ایک ہی چیز ایک ہی شخص کے لیے کسی وقت مناسب ہوتی ہے، ممانعت کر دی جاتی ہے۔

پنڈت جی کے عاقلانہ اعتراض کا کوئی عقل و شعور والا انسان لحاظ نہیں کرتا۔ عورت کے سینہ میں دودھ اس کی اولاد ہی کے لیے ہوتا ہے مگر ایک وقت معین تک اس اولاد کو یہ دودھ پینے کی اجازت ہے اور اس کے بعد پھر ممانعت کر دی جاتی ہے مگر پنڈت جی نے اپنے اس نرالے اصول پر عمل کیا تو وہ جوان اولاد کو بھی اس کی اجازت دے سکیں گے، عورت شوہر کے لیے ہوتی ہے لیکن کتنے اوقات میں جب شوہر کو اس کی مقاربت سے ممانعت کر دی جاتی ہے۔ پنڈت جی کے اصول کے یہ بات خلاف ہے، ان کے نزدیک تو کوئی بھی حالت ہو، روک ٹوک جائز نہیں مگر دنیا کا کوئی خرد ور انسان ان کے اس اصول کو گوارا نہیں کر سکتا۔

لطف یہ ہے کہ آپ کو خود اپنی تحریر یاد نہیں رہی جہاں اپنے شوہر کو اپنی زوجہ کے ساتھ مشغول ہونے سے ممانعت کی ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۹ ستیارتھ پرکاش، اس میں آریوں کو حکم دیتے ہیں: "برہمچاری رہے یعنی اگرچہ اپنی عورت ساتھ ہو، تاہم اس کے ساتھ نفسانی حرکت کچھ نہ کرے۔"

اب پنڈت صاحب اپنے اعتراض کی لغویت پر غور کریں، چاہے اپنے اس حکم کی نسبت رائے دیں۔ قرآن پاک پر اعتراض کرنے والے کو اسی قسم کی رسوائیوں کا سامنا ہوتا ہے اور اس کام کے لیے آمادہ ہونے کے ساتھ ہی علم و عقل اس سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

○ ○ ○

اعتراض: آدم صاحب خدا سے کتنی باتیں سیکھ آئے تھے؟ اور جب زمین پر آدم صاحب آئے تب کس طرح آئے؟ کیا وہ بہشت پہاڑ پر ہے یا آسمان پر؟ اس سے کیونکر اتر آئے۔ کیا پرندہ کی مانند اڑ کر یا پتھر کی طرح گر کر؟ (ستیارتھ پرکاش ص ۲۶۵)

جواب: آریہ ان اعتراضوں کو غور سے پڑھیں اور انصاف سے سوچیں کہ ان سے معترض کی کس لیاقت و قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے اور کیا آج دنیا میں علم و عقل کے مدعی اس حیثیت کے شخص کا اتباع کرنے اور اس کو مذہبی پیشوا بنانے میں توہین تصور نہ کریں گے یہ اعتراض کہ آدم صاحب خدا سے کتنی باتیں سیکھ آئے تھے؟ کیا اثر رکھتا ہے اور اس سے اسلام و شریعت پر کیا حرف آتا ہے؟ کون سے مسئلہ کی مخالفت ہوتی ہے؟ اعتراضات کے سلسلہ میں اس بات کا ذکر کیا نتیجہ رکھتا ہے؟ آریہ کسی طرح پنڈت کی بات بنا سکتے ہیں تو بتائیں اور بتائیں کہ اس اعتراض سے اسلام کی فلاں تعلیم قابل اعتراض ٹھہرتی ہے جس شخص کو اتنا ادراک نہ ہو کہ اس بات میں اعتراض کا شائبہ بھی اس کے اعتراض اگر آریوں کے لیے فخر ہو تو ان کے حال پر افسوس۔ پھر یہ سوال اس قدر بے محل کہ ص ۲۶۴ میں خود پنڈت نے یہ آیت نقل کی: "وعلم ادم الاسماء کلها" یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء تعلیم فرمائے۔ اس کے بعد یہ دریافت کرنا کہ آدم صاحب خدا سے کتنی باتیں سیکھ آئے تھے؟ کیسا عاقلانہ سوال ہے معلوم نہیں۔

یہ سوال پنڈت نے کس خمار میں لکھا؟ اس کو صرف دو صفحے پہلے اپنی نقل کی ہوئی آیت اور اس کا مضمون یاد نہ رہا۔ اس علم و ہنر پر شوق اعتراض "لا حول ولا قوہ الا باللہ۔" اس کے بعد آپ فرماتے ہیں اور جب زمین پر آدم صاحب آئے تب کس طرح سے آئے؟ پنڈت بے چارے کی حیرت قابلِ رحم ہے، جس طرح دیہات کے لوگ پہلے ریل کا حال سن کر حیرت زدہ ہو جاتے تھے کہ یہ گاڑی کیسے چلتی ہے، نہ اس میں گھوڑا لگتا ہے، نہ بیل۔ ان کے خیال میں کسی گاڑی کا چلنا گھوڑے بیل وغیرہ جانور کے کھینچنے میں منحصر تھا اور گاؤں کے محصور زندگی کی وجہ سے خیالی وسعت سے وہ محروم

تھے، لاجرم! انھیں ریل اور اس کی تیز رفتاری اور بغیر کسی جانور کے کھینچے اس کے چلنے اور رات دن اندھیرے اجالے میں دوڑے پھرنے کا انکار کرنا پڑتا تھا اور وہ ایسی خبریں سنانے والوں کا مضحکہ اڑاتے اور تمسخر کرتے تھے۔

مگر یہ مضحکہ اور تمسخر درحقیقت ان کی جہالت و بے عقلی اور تنگ نگاہی کا نتیجہ تھا۔ عقلاء کے نزدیک ان کا عذر خواہ صرف ان کا گنوارپن ہو سکتا تھا۔

پنڈت جی بے چارے بھی زیادہ تر جنگلوں اور تنہائیوں میں رہے۔ سنیاسی زندگی نے انہیں علم و ہنر کے مناظر دیکھنے کا موقع نہ دیا، اس لیے یہ سن کر وہ مبہوت ہو گئے کہ حضرت آدم علیہ السلام بہشت بریں سے زمین پر تشریف لائے، انھیں حیرت ہے کہ ایک مجسم انسان بغیر زینہ اور سیڑھی کے کیسے اترا، پر تو تھے نہیں جو پرندوں کی طرح گرتا تو پاش پاش ہو جاتا۔ اسی حیرانی میں وہ دکھیا پوچھتے ہیں، کیوں جی بہشت پہاڑ پر ہے یا آسمان پر ہے؟ بے چارے اس فکر میں غلطاں پیچاں ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ بہشت پہاڑ پر بتا دی جائے تو وہ کچھ تک لگا لیں اور آسمان پر ہونے سے تو ان کی عقل چرخ ہو جاتی ہے۔

فضائی پرواز اور تاخت کے مناظر پنڈت صاحب نے خواب میں نہ دیکھے تھے، کبھی ہوائی جہاز کا تذکرہ سنا دیا گیا ہوتا تو ان کی عقل کے طوطے اڑ جاتے اور یہی پوچھتے پھرتے کہ کیوں جی وہ کوئی پکھیرو ہوتا ہے، جانور ہوتا ہے، فضا میں کس چیز پر ٹنگا رہتا ہے، کسی سیڑھی سے اترتا ہے یا پتھر کی طرح گر پڑتا ہے، لیکن جب انھیں بتایا جاتا کہ ان میں سے کوئی بات نہیں ہوتی، وہ ایک سواری ہے، اس میں بہت آدمی بیٹھتے ہیں، وہ ہوا میں اڑتی چلی جاتی ہے اور جب اتارنا چاہتے ہیں تو آسانی سے اتر آتی ہے۔ نہ زینہ کی حاجت ہوتی ہے، نہ پتھر کی طرح گرتی ہے، تو یہ سن کر پنڈت جی ضرور گھبرا اٹھتے اور کہنے لگتے کہ جھوٹ جھوٹ، جو ایسی باتیں کہے اس کا کبھی اعتبار مت کر، وجہ یہ تھی کہ پنڈت جی کو کبھی اس قسم کے مشاہدے نہ ہوئے تھے، جس شخص کو انسانی مصنوعات تک رسائی نہ ہو اور اس کی عقل و خرد بشری صنعت کا تذکرہ سن کر معطل ہو جائے اور بجز انکار وہ کچھ نہ کہہ سکے، وہ کارساز قدرت کے عجائب حکمت سے ناآشنا ہو تو کیا تعجب ہے مگر خدا پر

ایمان رکھنے والا انسان جو اس کو قادر مطلق جانتا ہے' گو اس نے کیسی ہی کوڑھ زندگی بسر کی ہو اور دنیا کے عجائبات سے اس کی آنکھیں محروم رہی ہوں لیکن جب وہ آثار قدرت الٰہی کو سنتا ہے تو اس کا وہ پختہ اعتقاد جو اسے قادر کریم کی قدرتِ کاملہ کے ساتھ ہے' آوارۂ دشت حیرت و وحشت نہیں ہونے دیتا اور وہ اطمینان کے ساتھ باور کرتا ہے۔ آسمان سے کسی جسم کا اس طرح زمین تک پہنچ جانا کہ اس کی ہیئت و وضع نہ بگڑے اور اس کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ کیا پنڈت صاحب کے نزدیک کارساز عالم کی قدرت سے بالاتر کام ہے اور کیا ان کا دین انہیں ان کے معبود کی اتنی ہی قدرت بتاتا ہے کہ وہ ایک جسم کو بلندی سے پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ وما قدروا اللہ حق قدرہ۔

○ ○ ○

اعتراض: اعتراض سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب آدم خاک سے بنائے گئے تو ان کے بہشت میں بھی خاک ہوگی اور جتنے وہاں فرشتے وغیرہ ہیں' وہ بھی خاک ہی کے ہوں گے کیونکہ خاک کے جسم بغیر اعضاء نہیں بن سکتے اور خاکی جسم ہونے کی وجہ سے مرنا ہی ضرور لازم آئے گا۔ اگر وہاں موت ہوتی ہے تو وہاں سے (بعد موت) کہاں جاتے ہیں؟ اور اگر موت نہیں ہوتی تو ان کی پیدائش بھی نہیں ہونی چاہیے' جب پیدائش ہے تو موت بھی ضروری ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کا یہ لکھنا کہ بیبیاں ہمیشہ بہشت میں رہتی ہیں' جھوٹا ہو جائے گا کیونکہ ان کو بھی مرنا ہوگا۔ یہ حالت ہے تو بہشت میں جانے والوں کی بھی موت ضرور ہوگی۔

جواب: پنڈت صاحب کے دماغ کی رسائی اور فکر کی بلندی نے منطق و فلسفہ کو شرما دیا۔ کیا خوب دلیل ہے کہ جب آدم صاحب خاک سے بنائے گئے تو ان کی بہشت میں بھی خاک ہوگی اور جتنے وہاں فرشتے وغیرہ ہیں وہ بھی خاک ہی کے ہوں گے۔ کسی عالم پر اگر کوئی شے کسی مادہ خاص کی ہو تو اس سے یہ لازم آتا کہ جتنی چیزیں وہاں ہیں' وہ سب ہی اسی مادہ کی ہوں۔ دنیا میں اگر کوئی تجویز نہ کرے تو کم از کم پنڈت صاحب کی

عقل تو تجویز کرتی ہے، اگر پنڈت صاحب کو یہ خبر پہنچے کہ جاپان میں لکڑی کے مکان ہوتے ہیں تو وہ اپنے اس فلسفہ سے حکم لگادیں گے کہ پھر تو وہاں کے آدمی، جانور، دریا، چشمے، زمین، آسمان سب لکڑی کے ہوں گے۔ اس پایہ کا عاقل دنیا میں شاید پنڈت جی سے پہلے کم پیدا ہوا ہوگا۔ اس ملازمہ کو تو غور فرمائیے۔ آدم کے خاکی ہونے سے تمام ملائکہ کے لیے خاکی ہونے کا حکم کیسا عاقلانہ ہے۔

آریوں کو مبارک ہو کہ ان کا پیشوا عقل و خرد میں انوکھا درجہ رکھتا ہے، کسی مقام کے رہنے والوں میں سے کسی ایک میں جو بات پائی جاتی ہے اگر سب میں اس کا پایا جانا ضروری ہو تو پنڈت جی کو یہ خیال کرنے کا حق ہو گا کہ جس ملک میں گائیں اور بھینسیں سینگ اور دم والی ہوتی ہیں، وہاں کے آدمی اور پرندے وغیرہ سب سینگ اور دم رکھتے ہوں گے اور جس ملک میں کوئی پرندہ ہو وہاں کی ساری مخلوق سب پرواز ہوگی مگر پنڈت جی کے اس فلسفہ کو تعلیم یافتہ آریہ ہی قدر کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔

اسلام پر اعتراض کرنے والے اسی عقل و خرد کے ہو سکتے ہیں اور جب تک ان کے قوائے عقلی و دماغی اس حالت تک نہ پہنچیں اس وقت تک اسلام پر اعتراض کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ پنڈت صاحب نے اپنے اس قیاس پر دلیل بھی بیان کی ہے۔ وہ یہ کہ "خاک کے جسم بغیر اعضاء نہیں بن سکتے۔" اول تو فرشتوں کے لیے انسان جیسے اعضاء کا تسلیم کر لینا ان کا سرمایہ پنڈت صاحب کے صرف اپنی تنہائی کا تخیل ہے پھر اعضاء کا حصولِ خاک پر منحصر ہونا یہ بھی آپ کی ایجاد طبع زاد ہے۔ آپ نے پانی سے پیدا ہو کر پانی ہی میں رہنے والے ایسے درخت ملاحظہ نہیں فرمائے جس کا زمین سے کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا۔

آپ کے خیال میں مٹی کے سوا باقی عناصر مادہ نہیں یا ان کی ذات قبول صورِ سے آبی اور منکر ہیں۔ یہ خیال کتنا قابل مضحکہ اور لائق تعجب ہے۔ اس سے اور بڑھ کر عجیب تر بات آپ نے یہ فرمائی کہ خاکی جسم ہونے کی وجہ سے مرنا بھی ضرور لازم آئے گا۔ لکھے پڑھے سمجھدار آریہ سوچیں تو کہ اس لزوم کے لیے کیا علاقہ ہے اور جسم کا خاکی ہونا مرنے کو کیوں مستلزم ہے؟ کیا موت جسم خاکی کا ذاتی اقتضا ہے ماننا پیدا ہو تو خاکی جسم

والوں کا زندہ ہونا ناممکن کہ مقتضائے ذات کا شے سے جدا ہونا غیر متصور و نامعقول اور اگر مقتضائے ذات نہ ہو تو اس کے لیے کوئی علت ہوگی اور وہ علت یا خاک ہوگی یا اس کا غیر۔ اگر خاک کہیئے تو بھی یہی قباحت لازم کیونکہ معلول کا علت سے تخلف ناممکن اور غیر خاک کہیئے تو وہ قادر مطلق کا ارادہ ہے یا کچھ اور اگر کچھ اور کہیئے تب تو تصرفات بالذات غیر کے لیے ثابت ہوتے ہیں اور شرک لازم آتا ہے اور اگر قادر مطلق کا ارادہ کہیئے تو موت ضروری نہیں ہوتی اور جسم کی خاکیت کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ وہ جس جسم کو جب چاہے موت دے اور جسے چاہے باقی رکھے، جسے وہ فنا نہ کرے اسے کون فنا کرے گا۔

پنڈت جی کے نزدیک موت و فنا ان کے ایشور کے اختیار سے باہر ہے جب وہ قادر مطلق نہیں اس کو ایشور خالق و مالک کہنا غلط اور اگر اس کے اختیار میں ہے تو کیا خاکی اجسام کو وہ فنا کرنے پر مجبور ہے، اگر وہ مجبور ہے تو خدا نہیں۔ اسے ایشور کیسے کہا جاتا ہے اور اس پر جبر کرنے والا کون ہے اور اگر وہ مجبور نہیں تو جس خاکی جسم کو وہ چاہے حیات دائمی کیوں نہیں دے سکتا؟ اگر دے سکتا ہے تو اس کے لیے مرنا کس طرح ضروری اور لازم ہوگا۔ پنڈت جی کے ایسے بے تکے اعتراض تعلیم ربانی کی شان و شوکت میں تو فرق نہیں ڈال سکتے مگر ان سے خود ان کے علم و لیاقت فہم و فراست کا اندازہ ہو جاتا ہے اس کے بعد آپ نے فرمایا ہے کہ پیدائش ہے تو موت بھی ضروری ہونا کس دلیل سے ثابت ہے؟ میری ابھی عرض کی ہوئی تقریر سے پنڈت کے اس دعوے کا بطلان نہایت روشن و واضح ہے۔ منطق کے مبتدی بچے بھی اتنا جانتے ہیں کہ جس موجود کا وجود ضروری نہ ہو اس کا عدم بھی ضروری نہ ہوگا۔ ممکن اسی کو کہتے ہیں کہ نہ اس کا وجود ضروری ہو نہ عدم۔ پنڈت جی کا یہ کہہ دینا کہ پیدائش ہے تو موت بھی ضروری ہے، یہ بتاتا ہے کہ پنڈت جی کو علوم حکمت کی ابتدائی منازل تک بھی رسائی نہیں۔ انہیں باطل اوہام پر جو آپ نے تفریع کی ہے کہ اہل بہشت کے لیے موت ضرور ہوگی، یہ بھی ایسے ہی باطل ہے جیسے اس تفریع کی بناء باطل پر جو متفرع ہوگا باطل ہوگا۔ پنڈت صاحب کے اعتراض کی لغویت و رکاکت بحمد اللہ خوب ظاہر ہو چکی اور ممکن نہیں

ہے کہ اس کا کوئی ہوا خواہ علمی طور پر اس کو ثابت کر سکے۔ اس پر پنڈت اپنے آپ کو محقق کہیں یا اپنے منہ سے اپنی تعریف کریں۔

قرآن پاک کی حقانیت کا یہ اثر ہے کہ کوئی صحیح الدماغ آدمی بحالت صحت عقل اس پر اعتراض نہیں کر سکتا جو معترض اس پر زبان اعتراض کھولتا ہے پہلے اس کو عقل و خرد سے قطع تعلق کرنا پڑتا ہے۔

○ ○ ○

اعتراض: اس دن سے ڈرو کہ جب کوئی روح پر بھروسہ نہ رکھے گی، نہ اس کی سفارش قبول کی جائے گی، نہ اس سے بدلہ لیا جائے گا اور نہ وہ مدد پائیں گے۔

محقق: کیا موجودہ دنوں میں نہ ڈریں۔ برائی کرنے سے ہمیشہ ڈرنا چاہیے۔ جب سفارش نہ مانی جائے گی تو پھر (یہ بات کہ پیغمبر کی شہادت یا سفارش سے خدا بہشت دیتے گا) کیونکر سچ ہو سکے گی۔ کیا خدا بہشت والوں ہی کا مددگار ہے، دوزخ والوں کا نہیں۔ اگر ایسا ہے تو خدا طرف دار ہے۔

جواب: عجیب لغو اعتراض ہے، کس نے کہا ہے کہ موجودہ دنوں میں نہ ڈریں۔ آیت شریف کے کونسے لفظ کا یہ مطلب ہے، خود پنڈت کا کیا ہوا ترجمہ موجود ہے اس سے بھی یہ بات کسی طرح نہیں پائی جاتی۔ اپنے آپ لکھا ہے: "اس دن سے ڈرو" جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ساری زندگی اس دن سے ڈرتے رہو، اس دن سے ڈرو کے یہ معنی کون بے وقوف سمجھے گا کہ آج مت ڈرو اور کبھی مت ڈرو، خاص اس دن ڈرو۔ جو شخص اپنے کیے ہوئے ترجمہ کو نہ سمجھے یا سمجھے تو دیدہ و دانستہ کتاب پاک پہ بہتان لگائے اس کا اعتراض کیا چیز ہے۔ اعتراض نہیں نافہمیاں ہیں اور نافہمیاں بھی ایسی کہ ادنیٰ درجہ کا اور کند ذہن شخص بھی ایسی نافہمی نہ کرے۔ پھر آیت میں لا تجزی کا ترجمہ "بھروسہ نہ رکھے گی" یہ کس لغت سے لیا ہے؟ آتا کچھ نہیں ترجمہ کرنے کا شوق۔

یہ اعتراض کہ "سفارش نہ مانی جائے گی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے خدا بہشت دے گا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟"

یہ بھی ناقص ہے، قرآن پاک میں جابجا موجود ہے: "من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ" اور اس مضمون کی بکثرت آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ماذون بندے انبیاء و مرسلین، علماء، صالحین وغیرہ شفاعت کریں گے، ان کی شفاعتیں قبول کی جائیں گی۔ کفار جن بتوں اور طاغوتوں کو اپنا شفیع اعتقاد کرتے تھے اور "شفعاونا عند اللہ" کہتے تھے اور ان کی شفاعت پر بھولے اور بھولے بیٹھے تھے، قرآن کریم نے اس کا رد فرمایا ہے کہ تمہارے باطل معبود تمہارے کام نہ آسکیں گے۔ یہ کہاں کہ مقربانِ بارگاہ حق بھی شفاعت نہ کریں گے۔

پنڈت جی کا یہ قول کہ خدا بہشت والوں ہی کا مددگار ہے، دوزخ والوں کا نہیں۔ اگر ایسا ہے تو خدا طرفدار ہے۔ اس سے کیا مطلب ہے۔ کیا پنڈت جی یہ چاہتے ہیں کہ عاصی خطاکار مجرم بدکردار اور بندہ فرمانبردار دونوں کے ساتھ ایک ہی سلوک ہو، ان میں کوئی فرق و امتیاز ہی نہ ہو تو ایسا کرنا اقتضائے حکمت نہیں۔ حکیم کی شان نہیں جو خدا سے اس کا امیدوار ہو، اس نے خدا کی عزت نہ پہچانی۔ اگر ایسا ہو تو پھر دین و مذہب کاہے کے لیے ہے۔ آپ کے طور پر مسلمان، عیسائی وغیرہ جتنے غیر آریہ ہیں اگر ایشور پر سب کے ساتھ وہی سلوک کرنا لازمی ہو جو آریہ کے ساتھ ہے تو پھر آریہ بننا حماقت ہے، مفت تکلیف اٹھائے، دل ساگ پر بسر کرے، جب ایشور کا سلوک وہی رہا جو گوشت خوروں بلکہ منکروں کے ساتھ ہے تو آریہ بننا بھگتی کرنا ہوں میں آگ پھونکنا گھی جلا جلا کر برباد کرنا، سب اکارت و بیکار ہوا۔ دنیا میں کوئی عاقل منصف مزاج نہیں کہہ سکتا کہ نیک و بد کے ساتھ ایک ہی سلوک ہونا چاہیے۔ یہ حکمت و انصاف کا یہ اقتضا ہے، پھر اس کو طرفداری کہنا کس درجہ کی عقل مندی ہے۔

ㅇ ㅇ ㅇ

اعتراض: ہم نے موسیٰ کو کتاب اور معجزے دیئے۔ ہم نے ان کو کہا کہ تم ذلیل بندر ہو جاؤ۔ یہ ایک ڈر دکھایا جو ان کے سامنے اور پیچھے تھے ان کو اور ہدایت ایمانداروں کو۔ (منزل سپارہ ۱)

جواب: پنڈت جی ہیں اپنے ہنر میں پورے۔ کہاں کی کہاں آیتیں ملا کر ترجمہ کس کا کس سے جوڑ کر مضمون مختل کرنا چاہا ہے؟ اسے ہی آریہ قابلیت، فضیلت، محققیت کہیں تو ان کی دانائی پر افسوس۔ کہاں تو یہ کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور معجزے عطا فرمائے اور اس کے بعد کی آیات چھوڑ کر ایک ٹکڑا ایک آیت میں سے تراش کر اس کے ساتھ ملایا کہ ہم نے ان کو کہا کہ تم ذلیل بندر ہو جاؤ۔ اب اس سے سمجھنے والا کہاں تک غلطی میں نہ پڑے۔ یہ بھی کوئی دیانتداری ہے، درمیان کی آیت چھوڑ دی تھی تو اس کا کوئی اشارہ کیا ہوتا۔ اتنا بھی نہیں آتا تھا تو دوسری پوری ہی لکھ دی ہوتی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ کس سے فرمایا کہ بندر ہو جاؤ۔ اس کے بعد کی آیت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بندر ہو گئے اور ان کا بندر ہو جانا ان کے عہد کے لوگوں اور بعد والوں کے لیے عبرت اور پرہیزگاروں کے لیے موعظت و ہدایت ہوا۔ پنڈت جی اگر آیتوں کو اصلی حالت میں نقل کرتے تو انہیں اپنے خیال میں بھی اعتراض کا کوئی موقع نہ تھا اس لیے قطع برید کی تکلیف برداشت کی۔ اب اتنی قطع برید کرنے کے بعد آپ نے جو اعتراض کیے ہیں، وہ یہ ہیں:

اعتراض (۱): اگر موسیٰ کو کتاب دی تھی تو قرآن کا ہونا فضول ہے، اس کی تائید میں آگے چل کر لکھتے ہیں کیونکہ اگر برائی بھلائی کرنے کا اپدیش سب جگہ یکساں ہے تو دوبارہ مختلف کے بیان سے پسے ہوئے کے پیسنے کی مثال عائد ہوتی ہے۔ کیا خدا اس کتاب میں جو موسیٰ کو دی تھی، کچھ بھول گیا تھا۔

(۲) یہ بات جو بائبل اور قرآن میں لکھی ہے کہ ان کو معجزے کرنے کی طاقت دی تھی، قابل تسلیم نہیں، کیونکہ اگر ایسا ہوا تھا تو اب بھی ہوتا۔ اگر اب نہیں ہوتا تو پہلے بھی نہیں ہوا تھا جیسے خود غرض لوگ آج کل بھی بے علموں کے درمیان عالم بن جاتے ہیں۔ ویسے ہی اس زمانہ میں بھی فریب کیا ہو گا کیونکہ خدا اور اس کی پرستش کرنے

والے اب بھی موجود ہیں۔ اس وقت خدا معجزہ کرنے کی طاقت کیوں نہیں دیتا اور نہ وہ معجزے کر سکتا ہے۔

(۳) اگر خدا نے ذلیل بدر ہو جانا محض ڈرانے کے لیے کہا تو اس کا کہنا جھوٹ ہوا یا اس نے دھوکہ دیا جو ایسی باتیں کرتا ہے وہ خدا نہیں ہو سکتا اور جس کتاب میں ایسی باتیں ہوں، وہ خدا کی طرف نہیں ہو سکتی۔

جواب: پنڈت جی کی فلاسفی تمام ہو چکی۔ قرآن شریف کی عبارت کو قطع برید کرنے کے بعد آپ نے یہ تین اعتراض بنائے ہیں جس میں سے ہر ایک پنڈت جی کے انوکھے فضل و کمال کی گواہی دیتا ہے۔ آپ کا پہلا اعتراض یہ کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی تو قرآن کا ہونا فضول۔ یہ کیا معنی، اس میں کون سا ملازمہ ہے۔ یہ اعتراض منطق کے کون سے اصول پر مبنی ہے۔ ایک جاہل بھی ایسا لچر اعتراض کرنے کی جرأت نہیں کرتا اور کسی مدرسہ کا نا سمجھ بچہ بھی یہ کہنا اپنی شان کے لائق نہیں دیکھتا کہ جب معلم نے ابتدائی کتاب پڑھا دی تو پھر دوسری کتابوں کا پڑھنا بے کار ہے۔ ہم خود پنڈت جی سے یہ پوچھتے ہیں کہ ان کے اعتقاد میں جب وید ایک دفعہ آ گیا اور وہ عالم کی ہدایت کے لیے کافی تھا تو بار بار ایڈیشن کرنے اور نئی کتابیں چھاپنے اور ستیارتھ پرکاش بنانے کی فضول حرکت کیوں کی جاتی ہے؟ اس سے پسے ہوئے کے پیسنے کی مثال صادق آتی ہے یا نہیں۔ مثال بھی اپنے حسب حیثیت کیا عمدہ دی ہے۔ اس بات سے تو پنڈت جی کیا باخبر ہوتے جس کو اصول ہدایت و ارشاد کا جاننے والا سمجھ سکتا ہے کہ اقوام کے عادات، مزاج، طبائع، احوال، افعال جداگانہ نہ ہوتے ہیں، وقتوں اور صحبتوں کی خصوصیات سے مختلف قرنوں میں دماغوں کی مختلف حالت ہوتی ہے اور ذہنیت کچھ سے کچھ ہو جایا کرتی ہیں۔ ایک زمانہ بت پرستی کا ہوتا ہے، دنیا اوہام میں گرفتار ہوتی ہے، سحر اور جادوگری کا چرچا ہوتا ہے، طبیعتیں افعال عجیبہ اور آثار غریبہ کی طرف اپنی توجہ منعطف کرنا پڑتی ہیں اور زبانی تاثیرات سے سحر کی قوتوں کو باطل کر کے قوم کو راہ راست کی طرف دعوت دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر بجائے اس کے فقط علم برہان پر اکتفا کیا جائے تو دماغ صالح نہیں ہیں، کہاں تعلیم سے فیض حاصل کر سکیں اسی لیے اس زمانہ

کے لیے ایک قانونِ ہدایت ہونا چاہیے جس میں اس قوم کی خصوصیت کا لحاظ ہو۔ اس کے بعد قرن بدلے، دنیا کا مذاق کچھ سے کچھ ہو جائے، کواکب پرستی کا چرچا ہو، علم ہیئت کا رواج ہو، اس وقت ہادی کو کواکب پرستی کی گمراہی سے بچانے کے لیے دقائق ہیئت سے استدلال کر کے وجودِ حق ثابت کرنا چاہیے اور قوم کو باطل سے نکال کر راہ راست پر لانا چاہیے، کیونکہ ان کی طبیعتیں اس وقت اسی علم کے ساتھ مانوس ہو چکی ہیں، دوسری بات ان پر اثر نہ کرے گی۔ یہ تعلیم بھی ایک عرصہ جاری رہے اور ان تعلیموں سے دنیا میں شائستگی پیدا ہو، بصیرت حاصل ہو، پھر قرن بدلے اور انسانوں کی خیرہ سری پہلی گمراہیوں کا پردہ فاش دیکھ کر یہ یقین کریں کہ حق کے ہادیوں کی تعلیمیں اب ان طریقوں کو پورے طور پر رائج نہیں ہونے دیں گی اور نیا طریقہ گمراہی نکالیں، آتش پرستی کر دیں۔ اس زمانہ میں فلسفہ کا شغل و منطق کی گرم بازاری ہو تو اب اس زمانہ کے ہادی کو اس زمانہ کے مناسب حال اسلوب ہدایت اختیار کرنا ناگزیر ہے، وہ مدعیان حکمت کو دعوت دے گا اور مذہب حق کو زبردست قاہر استوار برہانوں سے ثابت کرے گا اور علم برہان کے جاننے والوں کو اطمینان دلا دے گا کہ حق اس کی زبان پر ناطق ہے۔ اس طرح جب بہت سے ادوار گزر چکیں اور دنیا کی قومیں طرح طرح کے سبق اور قسم قسم کی تعلیمیں حاصل کر چکیں، استعدادیں ترقی کر جائیں اور دماغوں کے لیے مختلف قسم کے ذوق، مختلف طرح کے سامان، طرح طرح کے علوم بکثرت اقوام کے احوال کا سرمایہ جمع ہو جائے اس وقت اقتضائے حکمت ہے کہ ایک قانون مکمل دیا جائے جس میں ہر قسم کے امراض ضلال کا علاج ہو اور جو ہر صاحب ذوق کی تشفی کر سکے اور جو جمیع اسالیب ہدایت و ارشاد کا جامع ہو۔ یہ قدرت کی حکمت بالغہ ہے جو پنڈت جی بے چارے تو کیا سمجھیں مگر کارخانہ عالم میں نظر رکھنے والا شخص ہر چیز میں اس اصول حکمت کو کارفرما دیکھ لیتا ہے۔ ایک دانہ جس کو بیج یا تخم کہتے ہیں، قویٰ کا ایک اجمالی خزانہ ہوتا ہے۔ عالم میں تفصیل میں آنے کے لیے جب وہ اپنا پہلا قدم نہاں خانہ ابہام سے نکالتا ہے تو اس میں سے سوئیاں سی پھوٹتی ہیں، ایک نیچے اور ایک اوپر۔ یہ ایک پودے کی ابتدائی حالت ہے، نہ یہاں برگ ہے نہ بار، نہ شگوفہ نہ گل نہ اثمار۔ وہ حادے سوت

ہیں: ایک اوپر کی طرف چلتا ہے اور ایک نیچے زمین میں پھیل جاتا ہے۔ اب اس میں ترقی شروع ہوتی ہے، کونپلیں نکلتی ہیں، شاخیں پیدا ہوتی ہیں، پتے نکلتے ہیں، زمین کو گھیرتا ہے، سایہ کرتا ہے، بہت سا پانی پی جاتا ہے، دُور ہوتا چلا جاتا، کلیاں آتی ہیں، کھلتی ہیں، پھولوں سے زینت چمن بنتا ہے، پھل لگتا ہے، شیرینی خوشگواری خوشبو سب چیزیں اس سے حاصل ہوتی ہیں، تو اب پنڈت جی کہیں کہ جب اس دانہ کو یہ تن توش شاخیں جھانده کلی، پھول، پھل، پتے، کونپل یہ پہلو و بیابان دینا تھا تو ایشور نے پہلے ہی کیوں نہیں دے دیا، اس دن کیا بھول گیا تھا۔ اسی طرح خود پنڈت جی اپنے وجود پر بھی نظر ڈالیں کہ یہ قد و قامت، تن و توش، اعضاء و جوارح، دانت ڈاڑھی مونچھ تمام چیزیں پہلی منزل میں بھی ان کے ساتھ تھیں جب والدہ کے شکم میں قیام کی ابتدا تھی تو کیا وہ یہ سوال کریں گے کہ یہ چیزیں جواب دے گئی ہیں۔ کیا اس وقت ایشور بھول گیا تھا جو جواب اس کا دیں، وہی جواب کتاب کی نسبت بھی سوچ لیں۔

(۲) دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ بات جو بائبل و قرآن میں لکھی ہے کہ ان کو معجزہ کرنے کی طاقت دی تھی، قابل تسلیم نہیں اور اس کی دلیل پنڈت کے نزدیک یہ ہے کہ اگر ایسا ہوا تھا تو اب بھی ہوتا اگر اب نہیں ہوتا تو پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔

جواب: پنڈت صاحب کی عقل پر کہاں تک افسوس کیا جائے۔ انہیں ابھی یہ معلوم نہیں کہ واقعات کا ثبوت کس چیز سے ہوتا ہے اور اس کے انکار کے لیے کیا سرو سامان درکار ہوتا ہے۔ آپ اگر خدانخواستہ کسی بدبخت قوم کی بدنصیبی سے کہیں کے مجسٹریٹ ہو جاتے اور پیش ہوتا آپ کے سامنے ایک چور اور ثابت کی جاتی اس کی چوری شہادتوں سے تو واقعہ کو جھٹلانے اور ناقابلِ فہم بنانے کے لیے آپ کے پاس یہی حجت کافی ہوتی کہ اگر اس نے پہلے چوری کی تھی تو اب چوری کیوں نہیں کرتا اور اب چوری نہیں کرتا تو اس نے پہلے چوری نہیں کی تھی۔ آپ کی مجسٹریٹی کا زمانہ اگر صدیوں تک دراز ہوتا تو پولیس کی تفتیش اور شاہدوں کے بیان کسی ایک شخص کو بھی مجرم ثابت نہ کر سکتے اور آپ کی یہ انوکھی دلیل سب ہی کا رد کر ڈالتی۔ یہ تو میں آپ کو کیا بتاؤں کہ واقعہ کا ثبوت خبر معتبر پر ہوتا ہے اور اس کے انکار کے لیے مخبر کا کوئی نقص خواہ وہ اس

کے حافظہ نگاہداشت وغیرہ کے متعلق ہو یا اس کے صدق و دیانت کے متعلق، یہ امر قادح قرار دیا جاتا ہے یا اسی کے بیان کو اس کا مکذب بنا کر پیش کیا جاتا ہے، تب واقعہ کی تکذیب ہو سکتی ہے۔ یہ باتیں تو کسی عاقل سے کہنے کی ہے مگر آپ کو آسانی سے اس طرح سمجھائے دیتا ہوں کہ آپ اپنے اس پیمانہ سے اپنے گھر کی کلیا تو ناپئے اور اپنی ہی میزان میں اپنی پونجی تول کر دیکھئے اور پھر بتائیے کہ میزان جھوٹی تھی یا پونجی اوچھی۔

ذرا یہ تو ملاحظہ فرمائیے کہ آپ کے عقیدہ کے بموجب اگر ایشور نے پہلے چار آدمیوں کو وید کا الہام کیا تھا تو اب کیوں نہیں کرتا اگر اب نہیں کرتا تو پہلے بھی نہیں کیا تھا۔ بقول آپ کے یہ خود غرض لوگوں کا فریب ہو گا اور سنئے آپ نے اسی ستیارتھ میں یہ لکھا ہے کہ ابتداء دنیا میں ہزاروں جوان آدمی بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے۔ (ستیارتھ ص ۲۹۴) اگر یہ بات سچی ہے تو اب کیوں نہیں ہوتے، اگر اب نہیں ہوتے تو پہلے بھی نہیں ہوئے تھے۔ بقول آپ کے خود غرض لوگوں نے فریب کیا ہو گا۔ اب آپ بتایئے کہ آپ کی یہ میزان جس پر آپ قرآن شریف اور بائبل کو تول رہے تھے، وید اور وید کے دعاوے کو کیسی بتاتی ہے۔ اس حالت میں آپ اپنی اس میزان کو جھوٹا کہیں گے یا وید کو؟ فیصلہ تو کیجئے۔

(۳) اگر خدا نے ذلیل بندر ہو جانا محض ڈرانے کے لیے کہا تو اس کا کہنا جھوٹا ہوا یا اس نے دھوکا دیا جو ایسی باتیں کرتا ہے، وہ خدا نہیں اور جس کتاب میں ایسی باتیں ہوں وہ خدا کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔

جواب: پنڈت جی نے آیت لکھی اور قطع برید کی فقلنا لھم سے شروع کیا اور اس سے پہلا جملہ ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت چھوڑ دیا جس کے اوپر فقلنا لھم مرتب تھا۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے اور یقیناً تم ان لوگوں کو جانتے ہو تم میں سے جنہوں نے ہفتہ کے معاملہ میں سرکشی کی تو ہم نے فرمادیا اُن سے، ہو جاؤ بندر، ذلیل۔ پس ہم نے اس واقعہ کو اس بستی کے اگلوں پچھلوں کے لیے عبرت اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت کر دیا۔ ترجمہ سے مطلب صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ ہفتہ کے متعلق احکامِ الٰہی کی نافرمانی اور سرکشی کرنے کی سزا میں پروردگار

عالم نے ان لوگوں کو بندر ہو جانے کا حکم دیا اور ان کا بندر ہو جانا اس بستی کے آگے اور پیچھے والوں کے لیے عبرت اور پرہیزگاروں کے لیے عبرت و نصیحت کر دیا۔

یقیناً کسی قوم کو سرکشی اور بغاوت پر جو سزا دی جاتی ہے وہ دوسروں کے لیے عبرت و نصیحت ہوتی ہے۔ آیت کے ترجمہ سے معمولی فہم کا انسان بھی اتنا با آسانی سمجھ لیتا ہے مگر پنڈت صاحب کی یہ دیانت ہے کہ انہوں نے آیت کا پہلا حصہ ہی چھوڑ دیا اور باقی حصہ کا ترجمہ نہایت بے ڈھنگا اور غلط کیا پھر اپنی ناسمجھی پر اپنے حسب عادت دریدہ دہنی اور بد زبانی کے ساتھ اعتراض کیا۔

پنڈت جی کا یہ کہنا کہ محض ڈرانے کے لیے کہا تو اس کا کہنا جھوٹا ہوا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بندر نہیں ہوئے۔ یہ پنڈت جی آیت میں کہاں پایا اگر اردو ترجمہ سمجھنے کی بھی لیاقت ہوتی تو حیادار انسان بے سروپا بات کہنے کی جرأت نہ کر سکتا۔ پروردگار عالم اپنی مخلوق کو سزا دے اور تکوینی حکم جاری فرمائے اور اس کا نفاذ نہ ہو' یہ کوئی کودن مغز ہی سمجھ سکتا ہوگا پھر عقل کے پورے اتنا بھی نہ سمجھے کہ اگر وہ بندر نہ بن گئے تو جھوٹ کیا چیز ہوئی' اس سمجھ پر محقق ہونے کا دعویٰ' اتنا علم تو مکتب کے مبتدی بچوں کو بھی ہوتا ہے کہ امر و نہی قسم انشاء سے ہیں اور صدق و کذب کا تعلق خبر سے ہوتا ہے نہ کہ انشاء سے' اگر کسی کو حکم دیا جائے اور اس حکم کی مطابعت نہ بھی ہو تو حکم دینے والے کو کوئی پاگل بھی کاذب کہے گا۔ بد دماغی کی انتہا ہو گئی۔ ایک بات اگر اپنے دل سے تراشی اور قرآن پاک کے مضمون کے خلاف ایک بات گھڑ کر براہ بددیانتی قرآن شریف کی طرف نسبت کر دی اور اس پر جاہلانہ اعتراض شروع کر دیے۔ یہ کہاں کا سلیقہ ہے' سچائی کی کوئی رمق تو اپنے کلام میں آنے دو اور اس کے اوپر یہ تفریع کہ جو ایسی باتیں کرتا ہے' وہ خدا نہیں ہے اور جس کتاب میں ایسی باتیں ہیں وہ خدا کی طرف سے نہیں۔ بے ایمانی کے سر پر کیا سینگ ہوتے ہیں' یہ طوفان جوڑنا اور بہتان باندھنا بھی قابلیت اور محققیت ہے جس دین کے پیشوا کی یہ حالت ہو اس کی قوم کس منزل پر پہنچے گی اور اس کا کیا انجام ہوگا۔

آریو! اپنے حال پر رحم کرو' سچائی سے محبت پیدا کرو' صدق و دیانت سے رشتے

جو ثبوت' دیانت اور راست بازی سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرو۔ آؤ! آؤ! اسلام کے سایہ میں تم کو یہ نعمتیں ملیں گی۔ اسلام سے بھٹک کر تمہیں ایسا ہی محقق ہاتھ آئے گا جس کی تحقیق کا لب لباب افتراء و بہتان ہو۔

○ ○ ○

اعتراض: آیت مبارکہ کَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ پنڈت جی اس آیت کا ترجمہ لکھتے ہیں: اس طرح خدا مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ تم سمجھو۔ اس پر پنڈت جی کا اعتراض یہ ہے: "اگر مُردوں کو خدا زندہ کرتا تھا تو اب کیوں نہیں کرتا کیا وہ قیامت کی رات تک قبروں میں پڑے رہیں گے' کیا آج کل دورہ سپرد ہیں' کیا خدا کی نشانیاں اتنی ہی ہیں' کیا کائنات میں یہ گوناگوں مخلوقات سامنے نظر آتی ہے' یہ کوئی نشانیاں ہیں۔"

یہ ہے پنڈت جی کی عقل و دماغ اور علم' ہنر کا کمال۔ آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس مقتول کو زندہ کیا' اسی طرح اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ کرے گا اور تم کو اپنی نشانیاں دکھلاتا ہے تاکہ تم سمجھو آیت میں یہ کہیں نہیں ہے کہ مُردوں کو زندہ کرتا تھا جس پر پنڈت جی نے اپنے اعتراض کی بنیاد رکھی ہے۔

ایک قوم کے سامنے ایک واقعہ آیا کہ مقتول کو اللہ تعالیٰ نے حیات دی' جو لوگ اس کو جانتے ہیں ان سے فرمایا جاتا ہے کہ جس طرح یہ ایک مُردہ زندہ ہونا تمہارے علم و یقین میں آیا ایسے ہی اللہ تعالیٰ روز قیامت مُردوں کو زندہ فرمائے گا اور وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ یقیناً ایک مُردہ کا زندہ کرنا متردین کو اطمینان دلاتا ہے اور ان کے لیے قدرت کی نشانی ہے جس سے وہ اس یقین تک پہنچ جائیں کہ جس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اس مُردہ کو زندہ کیا۔ وہ تمام مُردوں کو جب چاہے زندہ کرے' کس قدر دل نشین مضمون ہے اور اصولِ ہدایت کے کس قدر مطابق ہے کہ کسی امر عجیب کا نمونہ سامنے آتے ہی ایک قوم کو پیش آنے والے واقعات سے مطمئن کیا جاتا ہے۔ اس

پر پنڈت جی کا یہ اعتراض کہ اگر مُردوں کو خدا زندہ کرتا تھا تو اب کیوں نہیں کرتا، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید قرآن شریف میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پہلے زمانہ میں دستور ہی یہ تھا کہ تمام مُردے زندہ کر دیئے جاتے تھے، اب کچھ دنوں سے یہ بند ہو گیا ہے تو پنڈت جی گھبرا رہے ہیں مگر پنڈت کا تراشیدۂ طبع اور من گھڑت مضمون قرآن پاک میں نہیں ہے، یہ اس کی سچائی ہے کہ وہ قرآن شریف کی طرف ایسی چیز کی نسبت کیا کرتا ہے جو قرآن پاک میں نہ ہو۔ پھر بھی سوال کی معقولیت پر نظر ڈالیے، یہ سوال کیا عاقلانہ ہے کہ پہلے کیا کرتا تھا اور اب کیوں نہیں کرتا۔

ایک ایمان دار بچہ اس کا جواب دے سکتا ہے کہ قادر مختار ہے، جو چاہے جب چاہے کرے، اس پر کوئی پابندی عائد نہیں۔ جب پنڈت جی کے چہرہ کا آغاز ہوا اور داڑھی مونچھ نکلنی شروع ہوئی تو پنڈت جی نے اس وقت یہ سوال نہیں کیا کہ پہلے تو قدرت گالوں کو صفاچٹ رکھتا تھا اب ایسا کیوں نہیں کرتا؟ پنڈت جی کو اپنی کوئی بات یاد نہیں رہتی، ان کے اعتقاد میں پہلے چند لوگوں پر وید کا الہام کیا کرتا تھا اب کیوں نہیں کرتا۔ پنڈت جی یہ اعتراض پہلے بھی کر چکے ہیں اور اوپر اس کا جواب کافی گزر چکا ہے اس کو پھر مطالعہ کیجئے۔

پنڈت جی کا یہ قول کہ کیا وہ قیامت کی رات تک قبروں میں پڑے رہیں گے؟ کیا اعتراض کے قابل ہے؟ اس کی حکمت ہے اپنے بندوں کو جب تک چاہے کام میں لگائے، جب چاہے بے کار کر دے، معطل کر دے، جب چاہے موت دے، جب چاہے زندہ کرے، اعتراض کی کیا بات؟ آپ روز سو جاتے ہیں، رات بھر بستر پر پڑے رہتے ہیں خالق نے نیند مسلط کر دی ہے تو اس میں آپ پر اعتراض کیا ہے؟ یہ کون سی شان قدرت کے خلاف بات ہے؟ پنڈت جی کو خبر بھی ہے کہ اعتراض کسے کہتے ہیں اور وہ کیا ہوتا ہے یا محض کچھ نہ کچھ بول دینا ہی قابلیت ہے۔

بچہ بلوغ کے وقت تک جوانی کے قویٰ سے معطل رہتا ہے تو کیا اس زمانہ میں وہ قبر کے سپرد ہوتا ہے یا پنڈت جی کے نزدیک قدرت کا یہ دستور قابل اعتراض ہے۔ اس پر ہزار ہا افسوس! پھر یہ کہنا کہ کیا اتنی ہی خدا کی نشانیاں ہیں، کیا عقل مندی کی بات

ہے؟ لیکھ کسی نے کہا تھا کہ نشانیاں اتنی ہی ہیں مگر عقل ہوتی تو آدمی سمجھتا کہ مردوں کو زندہ کرنا آنکھوں کا مردوں کے زندہ کرنے کے لیے ایسی قریب الفہم نشانی ہے جس سے کم سمجھ اور نادان انسان بھی اطمینان حاصل کر سکتے ہیں جو شخص محل کلام سے واقف نہ ہو وہ اعتراض کرے، شرم ہزار شرم۔

○ ○ ○

اعتراض: آیت کریمہ اولئک اصحب الجنۃ ھم فیھا خلدون کا پنڈت جی نے یہ ترجمہ کیا: "وہ جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔" اس پر آپ کا اعتراض یہ ہے: "چونکہ جیو (روح) غیر متناہی گناہ و ثواب کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اس لیے ہمیشہ کے لیے بہشت یا دوزخ میں نہیں رہ سکتے اور اگر خدا ایسا کرے تو وہ بے منصف و لاعلم ہے۔ اگر قیامت کی رات انصاف ہوگا تو انسانوں کے گناہ و ثواب مساوی ہونے چاہئیں، اگر اعمال غیر متناہی نہیں ہیں تو ان کا ثمرہ غیر متناہی کیونکر ہو سکتا ہے اور مسلمان لوگ دنیا کی پیدائش سات، آٹھ ہزار برسوں سے بھی کم بتلاتے ہیں۔ کیا اس سے پیشتر خدا نکما بیٹھا رہا تھا اور کیا قیامت کے پیچھے بھی نکما رہے گا۔ یہ باتیں لڑکوں کی باتوں کی مانند ہیں کیونکہ پرمیشور کے کام ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور جس قدر کسی کے گناہ و ثواب ہوتے ہیں اس کے مطابق ہی اس کو وہ ثمرہ دیتا ہے، لہٰذا قرآن کی بات سچی نہیں ہے۔" (معاذ اللہ)

جواب: آیت کا صحیح ترجمہ تو پنڈت جی کو کبھی نصیب ہی نہیں ہوا، اس کی کہاں تک شکایت کی جائے مگر جس آیت پر آپ نے اعتراض کیا ہے، اہل عقل و خرد کے نزدیک اس کا مضمون نہایت پسندیدہ، دل پذیر ہے اور کوئی صاحب عقل سلیم اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ اس آیت پاک میں بتایا گیا ہے کہ مومنین مخلصین کو ان کے ایمان و اخلاص کی جزا میں عیش دائم اور راحت مخلد عطا ہوگی۔ وہ جنت میں ہمیشہ، ان پر انعام و اکرام کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا زوال نعمت کا جو دغدغہ دنیا میں انسان کے دم کے

ساتھ رہتا ہے اور جس کا تصور عیش کو منغص اور آسائش کو بے لطف بنا دیتا ہے، جنت میں اس سے امن ہوگی اور اہلِ جنت کو دار راحت سے نکالے جانے کا خطرہ نہ ہوگا۔ نفس انسان کی غایت تمنا اور نہایت مراد یہی ہے اور اس لیے وہ بڑی سے بڑی اور مشکل سے مشکل قربانیوں کے لیے بشوق تیار ہو جاتا ہے اور اپنے ولولوں اور امنگوں کو اسی نعمت کی طلب میں ذبح کر ڈالتا ہے۔ زندگی کے پیارے اوقات کا لمحہ لمحہ اسی امید کی قربان گاہ کی نذر چڑھا دیتا ہے اور اس امید پر کہ اس کا معاملہ ایک ایسے کریم سے ہے جس کے جود و نوال اور قدرت کی کوئی نہایت نہیں۔ وہ اپنی ہستی کا تمام ذخیرہ بڑی اولوالعزمی کے ساتھ بہ نیاز و اخلاص فدا کر دیتا ہے۔ ہر عاقل کے نزدیک کریم کی سرکار میں ایسے بندے کی یہی جزا ہونا چاہیے کہ اس کو نعیم مخلد اور دائمی راحت عنایت کی جائے کیونکہ اس کے پاس جو کچھ سرو سامان تھا، وہ سب اس نے بے کم و کاست اس کریم کی مرضی پر لٹا دیا، تو اس کی جزا یہی ہے کہ وہ کریم اپنی شان کے لائق نہ مٹنے اور ہمیشہ باقی رہنے والی نعمتوں اور دولتوں سے اس کو سرفراز فرمائے۔ اس کو کوئی مجنوں تو خلافِ انصاف کہہ سکتا ہے مگر خردور نہیں۔

یہ پنڈت جی کا نیا ہی فلسفہ ہے کہ جزا عمل سے زیادہ نہ ہو ورنہ ظلم ہو جائے گا، ظلم کا معنی انھوں نے آج تک نہیں سمجھا، اگر ایک شخص کو اس کی محنت سے زیادہ دیا جائے تو یہ عطا ہوگی، انعام ہوگا کرم ہوگا، احسان ہوگا نہ کہ ظلم۔ اس میں بھی کوئی اختلافِ حق ہے، اسے ظلم کہنا اگر دیوانگی نہیں تو کونسی سلامت عقل ہے۔ پنڈت جی کے اس اصول نے یہ ثابت کر دیا کہ جس کو وہ پرمیشور کہتے ہیں اور جس کا نام وہ قادر مطلق (سرو شکتی ماں) رکھتے ہیں، وہ خالی لفظوں کا بادشاہ ہے اور حقیقت میں کمالاتِ الوہیت سے معرا اور خالی ہے۔ نہ وہ جواد ہے نہ کریم، نہ منعم نہ محسن، انعام و احسان کی صفت سے اسے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ ایک دانہ کسی کو نہیں دے سکتا۔ اب اسے دیا تو کہنا ایسے ہی ہے جیسے کسی کے کالے آبنوس فام لڑکے کا نام مہتاب رکھ دیا جائے اور یقیناً جو ان صفاتِ کمالات سے معرا ہو، وہ خدا نہیں۔

اگر پنڈت جی کا یہ بیان ان کا اپنا آفریدہ طبع و تراشیدہ خیال نہیں ہے بلکہ ان کے

مذہب نے بھی یہی بتایا ہے اور وید کی بھی یہی تعلیم ہے، تو ثابت ہو گیا کہ وید اور ویدک دھرمیوں کو آج تک وجود حق کا پتا ہی نہیں چلا اور وہ صفاتِ خداوندی سے بالکل نا آشنا ہیں اور ایک عاجز و مجبور، نادار و ناتواں وجود فرض کر کے اس کو اپنا معبود مانتے اور بے کار اپنا سر کھپاتے ہیں، پھر اس عقیدہ میں بھی صدق و راستی، صفائی و سچائی سے منزلوں دور ہیں، جب ان کے نزدیک ان کا ایشور کسی کو کچھ نہیں دے سکتا اور کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو اس کو سرو شکتی مان اور دیالو اور داتا کیوں کہا جاتا ہے؟ کیوں اس کی جھوٹی تعریف کی جاتی ہے؟ کیوں دنیا کو غلطی میں مبتلا کیا جاتا ہے؟ اپاسنا اور دعاؤں میں کیوں بے کار وقت کھوئے جاتے ہیں اور کس لیے بے فائدہ خوشامد کی جاتی ہے۔ وید میں جو دعائیں جابجا مذکور ہیں اور طرح طرح کی استدعائیں کی گئی ہیں، اس عقیدہ کی بناء پر وہ سب لغو، باطل ہیں۔ پنڈت جی کے اس اعتراض نے تو ان کے دین و ملت کی حقیقت کھول دی اور پردے الٹ کر دکھا دیا کہ وہ ایشور کو صفاتِ کمال سے مبرا ایک وجود فرض کر رہے ہیں اور اس سے دعا اور اس کی عبادت سب ان کے اس عقیدہ سے باطل اور بے کار ثابت ہوتی ہے۔

پنڈت جی کے اس اعتراض کی بھی یہی وجہ ہے، جب انہوں نے اپنے گریبان میں دیکھا اور انہیں معلوم ہوا کہ ان کے دین نے ایشور کا صرف اتنا ہی مرتبہ بتایا ہے کہ نہ وہ کسی کو ضرر پہنچا سکے اور نہ نفع تو انہوں نے قرآن پاک میں خداوند عالم کی وسعت، رحمت و کرم کے بیان دیکھ کر اپنی خفت مٹانے کے لیے اس کو خلاف انصاف بتانا ضروری سمجھا اور یہ نہ خیال کیا کہ دنیا میں ان کی اس ہٹ دھرمی پر کیسا مضحکہ اڑایا جائے گا۔ ایک معمولی انسان اپنے ملازم کو مہینہ بھر کی تنخواہ دینے کے بعد دو روپے انعام دے سکتا ہے اور اسے دنیا میں کوئی ظلم نہیں بتا سکتا مگر پنڈت جی کے ایشور کو اتنا بھی مقدور نہیں۔ گورنمنٹ برطانیہ کے ہزارہا ملازمین اپنی خدمتوں کا معاوضہ پانے کے بعد انعام اور پنشن پاتے ہیں اور شاید بہت سے آریہ بھی پنشن خوار ہوں، تو کیا پنڈت جی کے نزدیک انعام اور پنشن دینا گورنمنٹ کا خلافِ انصاف فعل ہے۔ اگر آریوں کو پنڈت جی کی اس تعلیم پر کچھ اعتماد اور بھروسہ ہو تو وہ اپنے ساتھ یہ خلافِ انصاف کارروائی نہ ہونے دیں

اور اس ظلم کو روکیں اور پنشن و انعام واپس کریں اور حساب سے تنخواہ بقدر محنت وصول کریں۔ ایک مزدور کو دن بھر اینٹیں ڈھونے پر آٹھ آنے پیسے ملتے ہیں تو ایک محرر چھ گھنٹہ ٹکا بھر کا قلم ہلا کر زیادہ سے زیادہ آٹھ پیسے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ پنڈت جی کے انصاف پر عمل کریں تو آریوں کے دیوالے نکل جائیں، ملازمت تو کی بیس پچیس سال اس کی پاتے رہے تنخواہ، اس کے بعد جو عمر بھر پنشن ملتی رہی یہ تو یقیناً عمل سے زائد ہے۔ آریہ دھرم میں حرام، اس حرام کے آپ کیوں مرتکب ہیں، مگر پنڈت جی نے گھر والوں کو کبھی یہ نصیحت نہ فرمائی۔

اب ذرا سود کے مسئلہ پر نظر ڈالیے وہاں دیئے تو تھے سو روپے تو پنڈت جی کے اصول مصرعہ سے سو ہی لینے جائز تھے، اس سے زیادہ جو لیا جاتا ہے بجز ظلم ہے، خلافِ انصاف ہے، مالِ حرام ہے، ایذائے خلق ہے، مگر ایسا ہندو کیوں کرتے ہیں اور پنڈت جی اور ان کے دین والے اس فعل بد سے اپنی قوم کو کیوں نہیں روکتے، باوجودیکہ اس میں علاوہ اس پنڈت جی کے اصول کے اور بھی بہت سے مفاسد ہیں۔ آپ کا یہ اصول اچھے برتنے کے لیے نہیں ہے، محض دوسروں پر اعتراض کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اب آپ ذرا اپنی تجویزوں پر تو نظر ڈالیں کہ آپ نے خود اپنی تحریر کی ہوئی سزاؤں میں کہاں تک اس اصول کا لحاظ رکھا ہے اور آپ کا اعتراض مع آپ کے ناشائستہ کلمات کے کتنی مرتبہ آپ کے دین پر عائد ہوتا ہے۔

ستیارتھ پرکاش ص ۲۲۲ پر ملاحظہ ہو: "چور جس طریق پر جس جس عضو سے انسانوں میں نامناسب حرکات کام کرتا ہے اس عضو کو سب کی عبرت کے لیے راجہ کاٹ دیوے۔" انتہی۔

بلفظہ خالی مکان میں کھونٹی پر اچکن پڑی تھی، اس کی جیب میں ایک پائی تھی، چور نے چوری کی نیت سے اٹھ کر پاؤں سے چل کر ایک ہاتھ سے اچکن پکڑ کر دوسرا ہاتھ جیب میں ڈال کر پائی نکالی، آنکھوں سے دیکھی اور چھپانے کے لیے منہ میں رکھی، بازار میں آکر اس پائی کے چنے خریدے اور چاب کر کھا گیا۔ چوری کے لیے پاؤں سے چلنا، ہاتھ سے اچکن اتارنا، دوسرا ہاتھ جیب میں ڈالنا، آنکھ سے دیکھنا، منہ میں چھپانا، چنے خرید

کر دانتوں سے چبانا یہ تمام اعضاء سے نامناسب حرکتیں ہیں، تو پنڈت جی کے دین کا فیصلہ یہ ہے کہ اس پائی کے چور کے دونوں پاؤں کاٹ ڈالے جائیں، دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں، دونوں آنکھیں نکال ڈالی جائیں، سب دانت توڑ دیے جائیں اور گال جن میں پائی چھپائی تھی، ان کو کاٹ ڈالا جائے۔ اب بتائیں پنڈت جی کہ یہ سزا قدر عمل ہوئی یا اس سے زائد۔ ایک پائی چوری اور اس میں ہاتھ پاؤں کی تھوڑی سی جنبش، جو زیادہ سے زیادہ دو ایک منٹ رہی ہو، اس کی سزا ہمیشہ کے لیے اتنے اعضاء سے محروم کر دیا جائے۔ پنڈت جی کے اصول سے بہت زیادہ سزا یہ ہونی چاہیے تھی کہ ایک پائی لے لی جاتی، پاؤں کو ایک گھنٹہ چلا کر تھکا دیا جاتا، ہاتھوں سے کچھ ورزش کرا لی جاتی، دانتوں کو تھوڑی دیر کے لیے کچھ کام بتا دیا جاتا، آنکھیں چند منٹ بند کرا دی جاتیں۔ یہ تو بہت زیادہ کی صورت میں ہے ورنہ پورے طور پر تو پنڈت جی کے اصول کی متابعت یہی ہے کہ جتنی دیر چور کے اعضاء نامناسب حرکات میں مشغول رہے، اتنی ہی دیر ان کو اسی قدر تکلیف دے لی جائے، جتنا عمل انہوں نے کیا تھا، لیکن پنڈت جی اپنے اس اصول پر عامل نہیں ہیں اور ان کا دین یہ سزا نہیں تجویز کرتا بلکہ ایسی سخت سزا تجویز کی گئی ہے جسے پنڈت جی انصاف کریں تو ان کو کہنا ہو گا کہ ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ ڈالے، سزاؤں کے سلسلہ میں پنڈت جی نے اور بھی بہت سی عجیب و غریب سزائیں لکھی ہیں جو سب کی سب عقلاء کے نزدیک قابلِ اعتراض ہونے کے علاوہ خود پنڈت جی کے اصول سے ظلم عظیم ہیں۔

پنڈت جی اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ معمولی آدمی کی نسبت راجہ کو ہزار گنی سزا ہونی چاہیے۔ آپ کے دین کی تعلیم یہ ہے، اسی پر ناز ہے، اگر کوئی معمولی آدمی کسی کو قتل کرے تو اس کی سزا قتل ہے اور راجہ کسی کو قتل کر دے تو اس کی ہزار گنی سزا کیا ہے؟ کیا اس کا تمام کنبہ، قبیلہ، قوم، برادری، سب تلوار کے گھاٹ اتار دی جائے۔ بات ایسی تو کہی جاتی جو ممکن ہوتی، قانونِ سزا دھرم کا مقرر کیا تھا اور اتنا لچر پوچ جس پر عمل ناممکن، پھر ہزار گنا زیادہ ہوا تو سزا قدر عمل کہاں ہوئی۔ غرض پنڈت جی کا یہ اصول کہیں نہیں ٹھہرتا۔ اب پنڈت جی کے اعتقاد کے مطابق خاص ایشور کی دی ہوئی سزاؤں کا

نمونہ بھی ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ ایشور کے پاس بھی پنڈت جی ترازو موجود ہے یا بقول پنڈت جی کے وہاں اندھیر کھاتہ ہی ہو رہا ہے۔ دیکھئے منو سمرتی بارھواں ادھیاص ۳۴۶:

"سوائے مصیبت کی حالت کے عام حالتوں میں اپنے کرموں کے چھوڑ دینے سے چار خراب جسموں میں جنم لیتے ہیں اور دشمنوں کے غلام ہوتے ہیں۔"

اگر کوئی پنڈت اپنے اشغال ترک کر دے تو اوّل تو اس پر ایشور کو اعتراض ہی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جب وہ کچھ دے نہیں سکتا، بگاڑ نہیں سکتا، عطا سخا کا مالک نہیں، داد و دہش سے مجبور ہے، جیسا کہ پنڈت جی کا عقیدہ ہے، تو اپنی عبادت کیوں کراتا ہے اور نہ کرنے پر سزا کیوں دیتا ہے۔ جب پیدا کرنا، انسان کا بنانا، عقل و خرد دینا، زندگی تندرستی سب پچھلے ہی کاموں کا نتیجہ ہے، اس میں ایشور کا کچھ بھی دخل نہیں، اس نے کچھ بھی نہیں دیا، کوئی محنت و احسان اس کا نہیں تو اس پر شکر گزاری کیسی؟ اور اس کے ترک پر سزا کا اس کو کیا حق؟ ہم ایک مزدور رکھیں، دن بھر وہ کام کرے، شام کے وقت اس کو ٹھہری ہوئی مزدوری دے دیں تو ہمیں کیا حق ہے کہ اس کے اوپر ایک گھنٹہ اپنی تعریف کرنے کا فرض بھی عائد کریں اور ہماری خوشامد نہ کرے تو ایک کی جگہ چار دن تک اسے قید کر رکھیں، اس سے بڑھ کر اور ظلم کیا ہوگا۔

اب فرض کیجئے کہ پنڈت جی اپنے اصول اور عقل کے خلاف مجبور اور بے کار ایشور کی عبادت کو لازم اعتقاد کریں اور اس کے ترک کو گناہ جانیں تو ایک جون کے کسی حصہ کے گناہ کی سزا دوسری جون کے اسی قدر حصہ میں ہونی چاہیے نہ کہ اکٹھے چار جونوں میں۔ اب وہ اپنے ایشور کی نسبت فرمائیں اور اپنی منو سمرتی پر حکم لگائیں، یہ کہاں کی عاقلانہ تعلیم ہے۔

سزاؤں کا سلسلہ پنڈت جی کی دینی کتابوں سے اگر پیش کیا جائے تو دنیا متحیر ہو جائے اور جو قوم ان کتابوں پر ایمان رکھتی ہے اس کی عقل و دانائی پر افسوس کرے مگر پنڈت جی کو ان کے اصول کی نارسائی دکھانے کے لیے اسی قدر مثالیں کافی ہیں۔ یہ مثالیں تو میں نے سزاؤں کی دیں کہ ان میں تساوی اور مقدار کا برابر ہونا پنڈت جی کو دینی تعلیم کے خلاف ہے اور جزا میں زیادتی اور انعام و عطا تو ہر کریم النفس انسان بھی قابلِ

مستانٔش سمجھتا ہے۔ اس پر اعتراض عقل و انصاف سے بے گانگی اور محرومی ہے۔ اس کے علاوہ پنڈت جی کی بہت فاحش غلطی یہ ہے کہ وہ غیر متناہی نیکی و بدی کے معنی ہی نہیں سمجھے اور ہر وہ شخص جو معرفت الٰہی سے محروم ہو' ایسی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔

پنڈت جی کی لفظی غلطیوں سے میں قطع نظر کرتا ہوں جیسا کہ انہوں نے اسی اعتراض میں لکھا ہے کہ جیو غیر متناہی گناہ و ثواب کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس میں گناہ گار قابلِ ثواب کو قرار دینا اور ثواب جو جزا کے معنی میں ہے اس کو روح کا فعل بتانا ایسی غلطی ہے جس کو شہر کا رہنے والا صحبت یافتہ جاہل بھی پکڑ سکتا ہے۔ ثواب کا مقابل عذاب تھا اور گناہ کا مقابل نیکی لیکن ایسے اغلاط پنڈت صاحب کے کلام میں اس کثرت سے ہیں کہ ان کے شمار کرنے میں بہت طول ہو گا اس لیے میں معنوی زبردست غلطی کا ذکر کرتا ہوں جو دینی پیشوائی کے مدعی اور متناہی اور غیر متناہی گناہ کے معنی نہ سمجھے اور یہ کہہ دے کہ جیو غیر متناہی گناہ و ثواب کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک غیر متناہی عمل کے یہ معنی ہیں کہ وہ غیر متناہی زمانہ میں کیا جائے۔ اس کا بطلان تو اوپر کی تقریر سے ظاہر ہو گیا کہ نیکی اور بدی کی بڑائی اور چھوٹائی زمانہ کے اور وقت پر موقوف نہیں ہے' کسی کی بیمار پرسی کے لیے ایک ہزار میل کا سفر کر کے جانا بہت وقت چاہتا ہے مگر یہ عمل قلیل ہے اور قتل ایک آن میں ہو جاتا ہے مگر یہ عمل نہایت سخت ہے' تو عمل کا اعتبار وقت پر کرنا نیکی اور بدی کی حقیقت سے ناآشنائی ہے۔ جو شخص اتنا بھی نہیں جانتا وہ اعمالِ صالحہ و قبیحہ کا کس طرح معلم و حکیم ہو سکتا ہے۔ عمل کا اعتبار بلحاظ اثر و نتیجہ اہم ہو گا اتنی ہی عمل میں اہمیت ہے اور جتنا ہلکا ہو گا اتنا ہی عمل خفیف ہے' چاہے اس میں وقت کتنا ہی صرف ہو گیا ہو۔ ایک شخص جو پروردگار عالم کے غیر متناہی وجود' غیر متناہی علم' غیر متناہی قدرت اور غیر متناہی کمالات کا قائل و معتقد ہے' اس کی یہ نیکی غیر متناہی کہنا حقیقت عمل سے ناواقفیت ہے۔ اس نے غیر متناہی وجود اور غیر متناہی کمالات کا اذعان و اقرار کیا یہ متناہی کیسے ہو گیا۔ اسی طرح ایک خدا کا منکر معاذ اللہ اس کے غیر متناہی وجود اور غیر متناہی کمالات کا انکار کرتا ہے تو اس کی یہ بدی بھی غیر متناہی ہے' پھر اس غیر متناہی عمل کی غیر متناہی جزا کیا قابلِ تعجب ہے۔

اگر پنڈت جی اس حقیقت کو سمجھتے تو اعتراض نہ کرتے مگر اعتراض کی بناء ناواقفیت ہے۔ اسی سے پنڈت جی کے دین کا بطلان بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ایسے غیر متناہی اعمال کی غیر متناہی جزا تجویز نہیں کی اور اس دین میں وجود الٰہی کے انکار جیسا جرم بھی مستوجب سزا نہیں تو دوراں کیا خدا شناسی بتائے گا۔ خدا کا انکار آدمی ایک منٹ میں کر دیتا ہے تو پنڈت جی کے اصول سے اس کو ایک منٹ کی سزا ہونی چاہیے۔ یہ ہے خدا شناسی کی قدر، جس دین کی یہ تعلیم ہو اس کو دین حق کون کہہ سکتا ہے۔

پنڈت جی کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "اگر قیامت کی رات انصاف ہوگا تو انسانوں کے گناہ و ثواب مساوی ہونا چاہئیں۔" قیامت کو رات بتانا دن کو رات کہنا ہے۔ قرآن پاک میں یوم القیمہ آیا ہے۔ پنڈت جی کے علم کی حالت ہے کہ یوم کو رات سمجھتے ہیں۔ اس فہم و فراست سے جو اعتراض کیا جائے گا اس کی حقیقت عقلاء خود سمجھ لیں۔ اب رہی یہ بات کہ انصاف کے وقت نیکی اور بدی کا مساوی ہونا ضروری ہے، اس پر کیا دلیل۔ اگر مخلوق کا رجحان بدی کی طرف زیادہ ہو جیسا کہ دیکھا بھی جاتا ہے اور خود پنڈت جی کے عقیدے کے اعتبار سے بھی دنیا میں ان کے عقیدے اور مسلک کے لوگ بہت ہی کم ہیں تو کبھی انصاف کا وقت نہ آنا چاہیے۔ یہ عجیب دانائی ہے کہ اگر بدکاری کی گرم بازاری ہو اور دنیا کے لوگ رات دن فساد، فتنہ، شرارت، بد معاشی میں مشغول ہوں اور نیکیاں بہت ہی کم ہوں تو کبھی انصاف ہی نہ کیا جائے۔ تمام بدمعاش آزاد، سارے بدچلن مطمئن، انصاف تو ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ نیکیوں کی تعداد کم ہے اور اگر نیکیوں کی تعداد زیادہ ہو جائے اور دنیا کا عام رجحان خدا پرستی کی طرف ہو، بدی بہت کم رہ جائے تو بھی نیکی بدی کی مساوات نہ ہوگی۔ عبادت کرنے والے عبادت کرتے کرتے مر جائیں مگر پنڈت جی کے قانون سے انصاف نہ ہوگا۔ تو صاف ہی نہ کہئے کہ ایشور کے یہاں انصاف ہی نہیں۔ یہ اسلام پر تو اعتراض نہ ہوا مگر اس سے پنڈت جی کے دین کی معقولیت کا اظہار ہو گیا۔

پنڈت جی کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ "مسلمان لوگ دنیا کی پیدائش کی مدت، آٹھ ہزار برسوں سے بھی کم بتاتے ہیں۔ کیا اس سے پیشتر خدا نکما بیٹھ رہا تھا۔"

پنڈت جی کے اعتراضات ان کی اور ان کے دین کی حقیقت ظاہر کرنے کا پورا معیار ہیں۔ عاقل انسان ان پر غور کرے تو سمجھ سکتا ہے کہ اس شخص کو خدا شناسی کی ہوا بھی نہیں لگی۔ نکما بیٹھ رہنا کیا معنی نکما کس کو کہتے ہیں، کیا پنڈت جی کے نزدیک خدا کے لیے دنیا کو پیدا کرنا ہی ایک کام ہے اور جب یہ کام نہ ہو تو پروردگار نکما ہو جاتا ہے۔ یہ بات ہے تو پرلے میں کیا ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں آپ کے نزدیک ایشور نکما رہتا ہے، اگر عیب ہے تو اس کی کوئی صفت بھی معطل نہیں ہو سکتی، پھر ابتدائے عالم میں وید کا بھیجنا، رشیوں کو الہام کرنا، انہیں بغیر ماں باپ کے جوان جوان پیدا کرنا یہ تمام قدرتیں معطل ہو گئیں۔ ایک دفعہ چند انسان بے ماں باپ کے جوان جوان پیدا ہو گئے پھر وہ قدرت جاتی رہی یا بقول پنڈت جی کے بے کار و نکمی پڑی ہے اور کسی کام میں لگے رہنے کے لیے کیا ایشور مجبور ہے، اس پر پابندی کون عائد کرتا ہے، اس کا حاکم اور لعن طعن بازپرس کرنے والا کس کو تجویز کیا ہے اور کیا دنیا کے پیدا کرنے میں ایشور کو رات دن محنت اٹھانی پڑتی ہے اور برابر کام میں لگا رہتا ہے۔ یہی اس کی قدرتِ مطلقہ ہے۔ اسلام نے تو یہ بتایا کہ ایک کن سے چاہے تو ایک عالم پیدا کر دے۔ سمجھئے کہ آپ قدرتِ الٰہی کو نہیں سمجھے اور آپ نے اس کو اپنے اوپر قیاس کیا تو کس طرح آپ راہ راست پر پہنچ سکتے ہیں۔ پنڈت جی نے ان اعتراضات کے سلسلہ میں جو دل آزار، خلافِ ادب کلمات استعمال کیے ہیں، ان کی داد ان کے شائستہ معتقدین ہی دیں اور سمجھیں کہ دینی پیشوائی تو بڑی چیز ہے، کسی مہذب اور شائستہ انسان کے لیے بھی ایسا طریق گفتگو اپنے برابر والے کے حق میں روا نہیں ہو سکتا ہے، چہ جائیکہ جنابِ الٰہی میں ایسے گستاخانہ انداز سے قلم اٹھانا۔

○ ○ ○
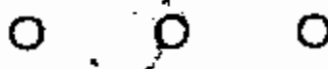
پنڈت جی کا ترجمہ: اور جب لیا ہم نے عہد تمہارا نہ ڈالو تم لہو اپنے آپس کے اور نہ نکال دو کسی آپس اپنے کو گھروں اپنے سے پھر اقرار کیا تم نے اور تم شاہد ہو پھر تم وہ لوگ ہو کہ مار ڈالتے ہو آپس اپنے کو اور نکال دیتے ہو ایک فرقہ کو آپ میں سے

گھروں ان کے ہے۔

اعتراض: پہلا اقرار کرنا اور کرانا محدود العقل آدمیوں کی بات ہے یا خدا کی، جب خدا ہمہ داں ہے تو ایسی بے ہودہ باتیں دنیاداروں کی مانند کیوں کرے گا۔ آپس میں لہو نہ بہانا اور اپنے ہم مذہبوں کو گھر سے نہ نکالنا اور دوسرے مذہب والوں کا لہو بہانا اور گھر سے انھیں نکال دینا بھلا کونسی اچھی بات ہے۔ یہ بے علمی اور طرفداری سے بھری ہوئی فضول بات ہے۔ کیا خدا پہلے ہی سے نہیں جانتا تھا کہ یہ اقرار کے خلاف کریں گے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا خدا بھی عیسائیوں کے خدا کی بہت صفات رکھتا ہے اور یہ قرآن دوسری کتاب کا محتاج ہے کیونکہ اس کی تھوڑی سی باتوں کو چھوڑ کر باقی سب بائبل کی سی ہیں۔

جواب: پنڈت جی کا یہ اعتراض آیہ کریمہ "وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ۔" اس آیت کا ترجمہ پنڈت صاحب نے جو کیا ہے، نہایت غلط ہے۔ جس شخص کو ترجمہ بھی نہ آتا ہو وہ مطلب کیا سمجھے گا اور جو مطلب نہ سمجھے اس کا اعتراض کرنا اپنے جہل یا جنون کا اقرار ہے۔ جب کلام سمجھا ہی نہیں اور متکلم کی مراد پر وقوف اور آگاہی حاصل ہی نہیں ہوئی، پھر بھی اعتراض کے لیے منہ پھیلا دینا کسی سلیم العقل اور ذی علم انسان سے کس طرح ممکن ہے اور ایسے اعتراضوں سے کلام یا متکلم عزت و شان میں کیا دھبہ لگ سکتا ہے۔ ایسے اعتراضات خود معترض کی جہل و سفاہت کے برہان ہوتے ہیں۔ ابھی بات سمجھی نہیں، اعتراض پہلے کر دیا۔ ایسے شخص کو جو قوم اپنا دینی پیشوا مانے اور اس کی ہر بات کے سامنے گردنِ نیاز جھکا دے اور آنکھیں بند کر کے اس کی تقلید کرے، ایسی قوم کی حالت نہایت رحم اور قابلِ افسوس ہے کہ اس نے غلامی بھی کی اور جانیں بھی قربان کیں مگر یہ نہ دیکھا کہ یہ فداکاری جس کے لیے کی جا رہی ہے اس کا رنگ روپ کیسا ہے اور وہ کس قابل ہے۔

پنڈت جی نے یہ کچھ انوکھا کام نہیں کیا ہے، ان کی عادت ہی یہ ہے اور وہ ہمیشہ ہی غلط ترجمہ کرتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ جس پر پنڈت جی نے اپنی عجیب و غریب عقل مندی

سے اعتراض کیا ہے' ہدایت و رہنمائی کا ایسا زبردست سرچشمہ ہے جس نے دنیا کو سیراب کر دیا اور فتنوں فساد کی آگ جس سے عالم انسانیت برباد ہو رہا تھا اس کے ایک چھینٹے سے ٹھنڈی ہو گئی۔

عرب کی اقوام میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے' اس دوران خزرج کی شہرۂ عالم جنگ زور پر تھی' عرب کے میدان بے رحمی کا مذبح بنے ہوئے تھے جہاں دوست دوستوں کو اور حلیف حلیفوں کو قتل اور جلاوطن کرتے تھے۔ ایک طوفان برپا تھا جس کو ساکن کرنے کے لیے کوئی قوت کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی تھیں۔ اس آیت کریمہ کے ان چند جملوں نے بگڑے ہوئے دلوں کی اصلاح کر دی اور ایسے خونخوار بے رحموں کو پھر انسانی شرافت کا جامہ عطا فرمایا جو اس سے عریاں ہو کر درندوں کو شرمندہ کر چکے تھے اور جن کا ظلم و جفا دشمن سے گزر کر حلیفوں کے حلق پر خنجر ستم چلا رہا تھا اور انہیں اپنے حلیفوں کا قتل و اخراج کچھ نامناسب نظر نہ آتا تھا۔ تمام ملک میں کوئی مذہب اس جنگ کی بھڑکتی آگ کو بجھا نہ سکا اور کسی کو اس فتنہ کے فرو کرنے کی ہمت و جرأت نہ ہوئی مگر وہ اسلام جو تمام عالم کے لیے مرجاں تلب ہے' اس نے اپنی روشنی سے نورانی دل منور کر دیئے اور اس آیت کے چند جملوں سے بہیمی اور سبعی زندگی کو شریفانہ حیات سے بدل دیا اور خونریز جنگ موقوف کر کے صلح و امن کو رواج دیا' عداوت و عناد کی جگہ سینوں میں ہمدردی و محبت کے ولولے موجزن کر دیئے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کَرَمِہٖ وَاِحْسَانِہٖ۔

یہ وہ چیز تھی جس سے اندھوں کی آنکھیں کھل گئیں' کفار نے دیکھ لیا کہ حضور پُرنور سرور انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اشاروں میں قدرتِ الٰہیہ کے حیرت میں ڈالنے والے آثار نمایاں ہیں اور جن عقدوں کو اعلیٰ مدبرین کی عقلیں لاینحل سمجھتی ہیں' وہ ایک اشارۂ ابرو سے حل ہو جاتے ہیں' اگر پنڈت جی مطلب سمجھتے اور انصاف سے کام لیتے تو قرآن کریم کی ان آیات کا وہ زبردست اثر نظر آ رہا تھا اور قدرتِ الٰہی اور ارشاد ہدایت کا وہ منظر جلوہ گر تھا کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی گواہی دینے کے سوا دل کو کسی طرح چین ہی نہ آتا تھا مگر جہاں مطلب

تک رسائی نہ ہو، حقیقت حال کیسے کھلے۔ آیہ کریمہ کا انداز بیان ایسا ہے جس پر فصاحت و بلاغت قربان ہوتی ہے، اگر اس کی تفسیر کی جائے تو فصحاء حیران ہو جائیں اور فصاحت وجد میں آ جائے لیکن اس کا بیان کسی ضمنی بحث میں ممکن نہیں، اس کے لیے مبسوط مضمون درکار ہے، اجمال کے ساتھ آپ کو صرف لفظی ترجمہ پر ایک نظر ڈالنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ کلام کی فصاحت اور اسلوب ارشاد و ہدایت کی لطافت سے لذت اٹھایئے اور دیکھیے انداز کلام کس قدر بلند ہے۔ ارشاد فرمایا:

واذ اخذنا میثاقکم لا تسفکون دماء کم ولا تخرجون انفسکم من دیارکم ثم اقررتم وانتم تشھدون۔

اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

جب ہم نے تمہارا عہد لیا تم اپنے خون نہ بہاؤ گے اور اپنے آپ کو اپنے دیار سے جلاوطن نہ کرو گے پھر تم نے شہادت دیتے ہوئے اقرار کیا۔

یہ لفظی ترجمہ ہے، اس پر ایک نظر ڈالیے... پہلا جملہ یہ ہے کہ ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم اپنے خون نہ بہاؤ گے۔ کیا پاکیزہ اسلوب ہدایت ہے۔ ایک چھوٹے سے جملہ میں قاتل کو قتل سے روکا جاتا ہے۔ قتل کی ممانعت اور ممانعت اس شان سے کہ اس ممانعت سے بغیر کسی طویل عبارت کے قاتل کو اپنے فعل کی شناخت بھی معلوم ہو جائے جس سے اس کا دل ارتکاب جرم سے نفرت کرنے لگے اور اس کا ثمرہ و نتیجہ بھی ظاہر ہو جائے تاکہ نفس انسانی مآل اندیشی کا خوگر ہو اور نتیجہ پر نظر ڈال کر اس کی عقل اس کے لیے اقدام عمل بد سے زنجیر پا ہو جائے۔

یہ تمام باتیں اس ایک جملہ میں حاصل ہیں۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ حلیفوں کو نہ مارو، یہ نہیں فرمایا گیا کہ دوسروں کو قتل نہ کرو کیونکہ عناد و عداوت کے جذبات جو اپنے انتہائی اشتعال پر پہنچے ہوئے تھے، اتنا کہنے سے ٹھنڈے نہیں ہو سکتے تھے اور ہٹ اور ضد جو ان کے ایسے حرکات کا باعث تھی، صرف اتنا کہنے سے دب نہ سکتی کہ قاتل کے سامنے خود اس کے اپنے حق میں کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوا، اس لیے ہادی برحق نے یہ فرمایا:

لا تسفکون دمائکم۔ تم اپنے خون نہ بہاؤ گے۔

کیا معنی کہ غیر کا خون بہانا اتنا ہی نہیں ہے کیا اس پر گزر جائے اور تم پر اس کا اثر نہ آئے بلکہ اگر آنکھ کھولو اور چشمِ حقیقت شناس سے دیکھو تو تمہیں نظر آ جائے گا کہ غیر کا قتل دینی اور دنیوی دونوں حیثیتوں سے بالآخر اپنا قتل ہے۔ اس کو مارو گے تو مارے جاؤ گے۔ دنیا میں اگر وہ تمہارا بالکل غیر تھا تو یا اس کے رفقاء تمہیں قتل کر دیں گے یا حکومت کی تلوار تمہاری گردن اڑائے گی اور اگر وہ حلیف تھا تو حلیفوں کے ساتھ ایسا سلوک دوسرے حلفاء کے لیے سبق ہو گا کہ وہ تمہارے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں اسی طرح آخرت میں جہاں عمل کی جزا ملتی ہے، تمہارا دوسرے کو قتل کرنا تمہارے حق میں وبال ہو گا۔ غرض کہ ہر طرح وہ خون بہانا تمہارے اپنے لیے ہی مضر ہے۔ اس لیے دوسرے کے خون بہانے کو اس عبارت سے منع کرتے ہیں کہ تم اپنا خون مت بہاؤ کیونکہ دوسرے کا خون بہانا اپنے خون بہانے کا سبب ہے۔ سبحان اللہ! کیا پاکیزہ ادا ہے اور کیا پاکیزہ حسن بیان ہے کہ فصاحت کے لیے اس کے قدم چومنا عزت ہے۔

اس آیت پاک میں حضور پرنور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس کے یہود کو خطاب فرما کر یاد دلایا گیا کہ ان کے آباء سے عہد لیا گیا تھا کہ وہ باہم خونریزی نہ کریں اور ایک دوسرے کو ان کے دیار سے نہ نکالیں۔ اس پر انہوں نے اقرار کیا اور اس عہد کو قبول کیا تھا اور تم اپنے اسلاف کے اقرار پر شاہد ہو۔ یہ تو آیت کا مختصر ترجمہ تھا جو اس لیے ذکر کر دیا گیا کہ ناظرین معترض کے اعتراض پر نظر ڈال کر فیصلہ کر سکیں کہ وہ آیت کریمہ سے کہاں تک علاقہ رکھتا ہے، ورنہ آیت کریمہ کے لطائف و حکم تو بحر زخار ہیں جن کے لیے دفاتر کافی نہیں۔

پنڈت جی نے اس آیت پر کیا اعتراض کیے ہیں اور وہ کہاں تک معقولیت رکھتے ہیں اس پر غور فرمائیے۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ "اقرار کرنا اور کرانا محدود العقل آدمیوں کی بات ہے۔"

یہ پنڈت جی کا نیا ہی قانون ہے جس پر نہ کوئی دلیل ہے نہ برہان، نہ عقل میں آنے کے قابل، اقرار میں کیا عیب ہے اور اس سے اقرار لینے والے کی کیا کسر شان لازم آتی ہے اور اقرار لینا کس لیے شانِ الٰہی کے خلاف ہے، اس کی نہ کوئی وجہ پنڈت جی

نے بیان کی نہ بیان کر سکتے تھے۔ یہ ایسا ہی اعتراض ہے جیسا کوئی شخص یہ کہے کہ آفتاب میں روشنی ہونا بہت بڑا عیب ہے۔ جب پنڈت کو اقرار عیب معلوم ہوتا ہے تو نیک اور بد کی تلقین کو وہ کیوں جائز رکھتے ہیں، کسی کو راہ نیک کا بتانا اور بدی سے بچنے کی ہدایت کرنا یہ بھی شانِ الٰہی کے لائق ہے یا نہیں، اگر یہ بات شانِ الٰہی کے لائق ہو تو اقرار پر کیا اعتراض ہے۔ اقرار بھی تو اسی کی تائید ہے اور تعلیم و تلقین کا ایک ابلغ طریقہ ہے کہ راہ صواب بتا کر اقرار بھی لے لیا جائے، بات خوب موکد ہو جائے، حجت اتمام کو پہنچے، جو دین نیکیوں کو پھیلانے والا ہو اور جس کا مقصود فتنہ و فساد کا مٹانا ہو، ضرور ہے کہ وہ اس مدعا کے لیے موثر اور زبردست طریقے سے عمل میں لائے اور دنیا کو نیک چلنی و پاکبازی کے عہد لے کر کج روی و گمراہی سے بچائے۔

اسلام میں بدیوں کو روکنے کا یہ اہتمام دیکھ کر آریان کے مدعیان حقانیت کو پسینہ آ جاتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے اس طریقہ ہدایت کو دیکھ کر اگر دنیا نے جب یہ سوال کیا کہ تم دنیا کی اصلاح و درستی کا دعویٰ تو کرتے ہو، بتاؤ کہ تم نے مفاسد کو روکنے میں کبھی ایسی جدوجہد کی ہے، کبھی ایسے عہد و پیمان لیے ہیں، کبھی امن قائم کرتے اور شرارت کو روکنے کے لیے کوئی قول و قرار لیا ہے اگر یہ کچھ نہیں کیا تو کس منہ سے تم اصلاح خلق کا دعویٰ کرتے ہو۔ یہ سوچ کر تمام باطل کار پریشان ہو جاتے ہیں اور ایسی مجبوری کی حالت میں پنڈت جی کی طرح ایسی غیر عاقلانہ بات زبان سے نکالنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اقرار کرنا اور کرانا محدود العقل آدمیوں کی بات ہے۔ انسان ضرور محدود العقل ہے اور محدود العلم ہے لیکن کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس کے جملہ افعال قابل اعتراض ہو جائیں۔ سچ بولنا، دیانتداری کرنا، عدل و انصاف، رحم و کرم یہ تمام باتیں انسانوں میں پائی جاتی ہیں تو کیا انسان کے محدود العقل ہونے سے اس کی یہ تمام خوبیاں عیب و قابل اعتراض قرار دی جائیں گی۔

پنڈت جی کا ایشور سچائی، دیانت داری، انصاف، رحم و کرم کو اس لیے چھوڑ بیٹھے گا کہ محدود العقل ہونے سے انسان کی سب باتیں بے جا ہوتی ہیں تو ان کی کوئی بات کس طرح درست ہو سکے گی۔ آپ نے یہ نہ سوچا کہ آپ آدمی ہیں، محدود العقل ہیں،

ناصحِ ودانا العلیم پروردگار پر اعتراض کرنا کیسا شرمناک جرم ہے۔ پنڈت جی نے اقرار کرنے کو بے ہودہ بات بتایا ہے۔ تمام دنیا کے نزدیک مرنا اور انکار کرنا عیب ہے اور کسی بات کا سچائی کے ساتھ اقرار کر لینا عیب نہیں مگر پنڈت جی کی الٹی منطق میں اقرار کر لینا بے ہودہ بات ہے۔ ایسی بے ہودہ باتیں اگر تلاش فرمائیں گے ان کو اس ذخیرہ میں بہت مل جائیں گی جس کو وہ ایشور کا کلام اور الہامی بتاتے ہیں۔ پنڈت جی کے ایسے لغو اعتراض ان کے ادعائے پیشوائی کی قلعی کھولتے ہیں۔

آیہ کریمہ کا مضمون ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، اس میں خونریزی و فتنہ انگیزی کو روکنے کی بلیغ ترین ہدایت ہے مگر پنڈت صاحب کو یہ بھی قابلِ اعتراض معلوم ہوئی۔ ان کے تعصب نے گوارا نہ کیا کہ ایسی پاکیزہ اور واضح تعلیم کو جس کی خوبی کا ہر فرد بشر معترف ہو اور جس کی پاکیزگی کی ہر ضمیر شہادت دے، وہ بھی قابلِ تعریف تعلیم کو معیوب بنانے پر ابھارا مگر عیب لگاتے تو کس طرح لگاتے، اس لیے انہوں نے آیت کریمہ کے مضمون کے ساتھ ایک فقرہ اپنی طرف سے لگا دیا جس کا آیت کریمہ میں نام و نشان نہیں ہے اور وہ فقرہ یہ ہے کہ دوسرے مذہب والوں کا لہو بہانا اور گھر سے انہیں نکال دینا بھلا کونسی اچھی بات ہے۔

اب پنڈت جی کے تمام ہوا خواہ مل کر تو بتائیں کہ اس آیت میں دوسرے مذہب والوں کے لہو بہانے اور انہیں گھر سے نکالنے کا کہاں حکم ہے۔ جب قرآن پاک پر اعتراض کرنے والا اقرار کرتا ہے تو مسلمانوں کے ایمانوں کو مزید تقویت ہوتی ہے کہ کتاب الٰہی کے کسی حرف پر اعتراض کرنے کی معاند دشمن کو جگہ نہ ملی اور وہ اپنا عناد نکالنے کے لیے افتراء و بہتان کرنے پر مجبور ہوا۔

اس سلسلہ میں آپ کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ کیا خدا پہلے ہی سے نہیں جانتا تھا کہ یہ اقرار کے خلاف کریں گے۔ بے شک خداوند عالم، عالم الغیب والشہادۃ ہے، اس کا علم قدیم و ازلی ہے۔ وہ ہر ایک بات کو ہمیشہ سے جانتا ہے لیکن بندوں سے نیکیوں کا اقرار لینا کس دلیل سے اس علم کے منافی ہے، ذرا وہ دلیل بھی تو آپ بیان کرتے۔ اگر پنڈت جی کے نزدیک یہ بات قابلِ اعتراض تھی تو انہیں پہلے یہ اعتراض وید پر کرنا

چاہیے تھا کہ کیا ایشور پہلے سے نہیں جانتا تھا کہ بندے نافرمانی کریں گے۔ وید کی تعلیم کو نظر التفات سے نہ دیکھیں گے۔ قرنوں تک وید برہمنوں کی جھولیوں میں پڑے رہیں گے اور صدیوں تک ان پر عمل تو درکنار ان کا ایک کلمہ بھی دنیا کی نظر کے سامنے نہ آئے گا اگر نہ جانتا تھا تو ایشور کیسا اور اگر جانتا تھا تو بقول پنڈت جی کے اس نے ایسا لغو اور عبث کام کیوں کیا۔ پنڈت جی کو یہ بھی سوچنا چاہیے تھا کہ جو آدمی دنیا میں پیدا ہو کر پاپ (گناہ) کے کام کرتا ہے اور اسی میں اپنی عمر گزار دیتا ہے اور وہ پنڈت جی کے اعتقاد میں اپنے عملوں سے سور وغیرہ کی بدترین جون پانے کا مستحق ہوتا ہے، اگر ایشور کو خبر نہ تھی کہ وہ انسانی جون میں جاکر ایسے پاپ کرے گا جن کی پاداش سور کی جون ہے تو وہ ایشور ہی کیا ہوا اور اگر جانتا تھا تو پنڈت جی اپنے پیش کیے ہوئے معیار پر ان کی کتاب اور ان کا دین پورا نہیں اترتا۔

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ مول لیا دنیا کی زندگی کو بدلے آخرت کے۔ پس نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ وہ مدد کیے جائیں گے۔ یہ ترجمہ پنڈت جی نے لکھا ہے۔ آیت میں یہ مضمون ہے کہ کفار ایسے بے عقل اور حریص ہیں جنھوں نے دنیوی ناپائیدار زندگی کی آسائش کو اختیار کیا اور خدا کی نافرمانی کر کے آخرت کی دائمی زندگی سے ہاتھ اٹھا بیٹھے ان کے عذاب میں تخفیف نہ ہوگی اور نہ دنیا کی طرح مصیبت کے وقت وہاں ان کا کوئی مددگار ہوگا جو انہیں اس عذاب سے چھڑا سکے۔ اس پر پنڈت جی یہ اعتراض کرتے ہیں۔

○ ○ ○

اعتراض: بھلا ایسی نفرت وحسد کی باتیں کبھی خدا کی طرف سے ہو سکتی ہیں جن لوگوں کے گناہ ہلکے کیے جائیں گے یا جن کو مدد دی جائے گی وہ کون لوگ ہیں؟ اگر وہ گناہ گار ہیں اور گناہوں کے بلا سزا دیے ہلکے کیے جائیں گے تو بے انصافی ہے جو سزا دے کر ہلکے کیے جائیں گے تو جن کا بیان اس آیت میں ہے، یہ بھی سزا پا کر ہلکے ہو سکتے

ہیں اور سزا دے کر بھی ہلکے رکھتے جائیں گے تو بھی بے انصافی ہوگی اگر گناہوں سے ہلکے کیے جانے والوں سے مطلب پرہیزگاروں سے ہے تو ان کے گناہ تو آپ ہی ہلکے ہیں، خدا کیا کرے گا؟

جواب: معترض اپنی جہالت و نادانی کے باوجود مغرور اور اپنے آپ کو ہمہ داں سمجھتا ہے۔ اور درحقیقت ایسے لایعنی اعتراض کوئی لکھا پڑھا آدمی کر ہی نہیں سکتا۔

اس کا اعتراض جیسا کچھ بھی ہے، وہ صرف اتنی بات پر ہے کہ بعض لوگوں کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی اور انہیں مدد دی جائے گی مگر نادان معترض سے پوچھیے۔ یہ مضمون اس آیت میں کہاں ہے، معلوم نہیں۔ معترض نے خواب میں دیکھا یا کسی خمار میں لکھ مارا۔ ایسے معترض اور ایسے اعتراض کو وہی لوگ قبول کر سکتے ہیں جن کی بصیرت کی روشنی بالکل زائل ہو چکی ہے۔ یہ ایک جہالت ہوئی۔

معترض کی دوسری جہالت یہ ہے کہ وہ ایسی پاکیزہ تعلیم کو حسد بتاتا ہے جو بدکرداری سے روکنے والی ہے اور جس میں سیاہ کاروں کو ان کے اعمال کے نتیجہ سے باخبر کیا گیا ہے اگر یہ حسد ہو تو دنیا کے تمام قانون حسد ہو جائیں جن میں مجرموں کی سزا کا بیان ہوتا ہے اور خود پنڈت اور اس کے دین کے تمام احکام اس کو حسد ماننے پڑیں۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

تیسری جہالت یہ ہے کہ آیت میں یہ بیان ہے کہ ان کے عذاب میں تخفیف نہ ہوگی۔ پنڈت نے اعتراض میں گناہ کی تخفیف پر نکتہ چینی کی، آج تک اس کو گناہ اور عذاب کا فرق معلوم نہیں۔

چوتھی جہالت یہ ہے کہ تمام مجرموں کو ایک درجہ میں رکھنا چاہتا ہے۔ خواہ ان کے جرموں میں کیسا ہی عظیم فرق ہو۔ اس کے نزدیک اگر انتہا درجہ کے سنگین جرم کی سزا میں تخفیف نہیں ہو سکتی تو معمولی جرم کی سزا بھی ایسی ہی ہونی چاہیے، یہ کہاں کی عقل مندی ہے۔ دنیا کے قانون میں بھی ایک جرم کی سزا حبس دوام ہوتی ہے جس سے کبھی رہائی نہیں ہوتی لیکن معمولی جرائم کی سزا ایسی نہیں ہوتی تو پنڈت صاحب کے نزدیک یہ حسد ہے۔ ایک آدمی نے قتل کیا، وہ مجرم ہے ایک نے کسی کے چپت مار دیا وہ

بھی مجرم ہے۔ پنڈت جی کے نزدیک اگر قاتل کی سزا میں کبھی تخفیف نہ ہو اور اس کے حبس دوام کیا جائے تو چپت مارنے والے کی سزا بھی ایسی ہی ہونی چاہیے ورنہ حسد ہوگا۔ جن لوگوں نے کفر کیا اور خدا کے منکر ہوگئے ان کا جرم معمولی گناہ گاروں کی سزا کے برابر کیسے ہو سکتا ہے؟ مگر شوق اعتراض میں عقل سے دشمنی کر لی۔ اس کے علاوہ اور بھی جہالتیں ہیں اور تمام اعتراض جہالتوں کا طومار ہیں۔

○ ○ ○

اعتراض: اور بالتحقیق دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور پیچھے ہم پیغمبروں کو لائے اور دیئے ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزے، ظاہر اور قوت دی ہم نے اس کو ساتھ روح پاک کے پھر بھلا جب آیا تمہارے پاس پیغمبر ساتھ اس چیز کے کہ نہیں چاہتے جی تمہارے، تکبر کیا تم نے، پس ایک فرقہ کو جھٹلایا تم نے اور ایک فرقہ کو مار ڈالتے۔

(منزل اول سپارہ اول سورۃ البقر آیت ۸۷)

محقق: جب قرآن میں شہادت ہے کہ موسیٰ کو کتاب دی تو اس کا ماننا مسلمانوں کے لیے لازم آیا اور جو جو اس کتاب میں نقص ہیں وہ بھی مسلمانوں کے مذہب میں آگئے اور معجزے کی باتیں سب فضول ہیں اور سادہ لوح مسلمانوں کے بہکانے کے واسطے گھڑی گئی ہیں کیونکہ قانونِ قدرت اور علم کے برخلاف تمام باتیں جھوٹی ہی ہوا کرتی ہیں اور اگر اس وقت معجزے تھے تو اب کیوں نہیں ہوتے چونکہ اس وقت نہیں ہوتے اس وقت بھی نہیں ہوتے تھے اس میں کچھ بھی شک نہیں۔

جواب: حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور تمام انبیاء کی کتابوں پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ پنڈت جی کو کیا وہم ہوا جو کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی کتاب کا ماننا مسلمانوں کے لیے لازم آیا۔ یہ تو مسلمان ہونے کے لیے لازم ہے جو ان کتب کو نہ مانے مسلمان نہیں۔ بے شک قرآن پاک میں کتب انبیاء کی شہادتیں ہیں اور ہم ان تمام کتب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اب اس میں اعتراض کیا ہے۔ پنڈت جی نے بھی

سوچا کہ یہ بات کچھ اعتراض کی ہوئی نہیں تو آپ نے حسب عادت اپنی طرف سے ایک بہتان جوڑ کر اس کے ساتھ شامل کر دیا وہ یہ کہ جو جو اس کتاب میں نقص ہیں وہ بھی مسلمانوں کے مذہب میں آ گئے۔ پنڈت جی کو تو اتنی سمجھ ہو گی اور جب وہ معترض بنے ہیں تو اتنا بھی جانتے ہوں گے کہ یہود و نصاریٰ نے کتب الٰہیہ میں جو تحریفیں کیں اور اپنی ہوائے نفسانی سے مضامین بدل کر کچھ کے کچھ کر ڈالے۔ اس پر قرآن پاک نے ان کی گرفت فرمائی تو یہود و نصاریٰ کی تحریفات تو کتاب الٰہی ہے نہیں۔ کتاب الٰہی وہی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء پر نازل فرمائی' اس میں نقص بتانا پرلے سرے کا کمینہ طوفان ہے۔ قرآن پاک میں اگر یہ بتایا گیا ہوتا کہ ان کتابوں میں نقص ہے۔ معاذ اللہ تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ قرآن پاک نے ان کتابوں میں نقص بھی بتایا اور پھر مسلمان مانتے بھی ہیں تو اس سے ان کے دین میں نقص لازم آتا مگر قرآن پاک تو ان کتابوں کو ہدایت و رحمت فرماتا ہے۔ یہ نقص پنڈت کا اپنا ہے جو دوسروں کی طرف منسوب کرتا ہے اس طرح کے تعصب سے جو اعتراض کیے جائیں وہ شہادت دیتے ہیں کہ معترض انسانی فضیلت اور ضمیر کی صفائی سے محروم ہے۔ اس کے بعد پنڈت نے کہا ہے کہ معجزے کی باتیں سب فضول ہیں۔ کیسا جاہلانہ انکار ہے' واقعات جو خبر صادق سے ثابت ہو جائیں اور کروڑوں معاندین خود اس زمانہ کے ان کی صحبت میں کلام نہ کر سکیں' انہیں یہ کہہ دینا کہ سب فضول ہے' کہاں کی دانش مندی ہے۔ یہ کلمہ ہر جاہل ہر چیز کی نسبت کہہ سکتا ہے تو کیا اس سے واقعات کے ثبوت اور صداقت میں کوئی کمزوری آ سکتی ہے۔

اب رہا یہ کہنا کہ معجزات قانونِ قدرت کے خلاف ہیں۔ یہ اور زیادہ جہل کی بات ہے۔ خداوند عالم کے لیے قدرت و اختیار کے حدود معین کرنے کا دعویٰ شان عبدیت کے بالکل خلاف ہے۔ اس شخص کو خدا شناسی کی ہوا ہی نہیں لگی جو ایسی لغو و بے ہودہ بات زبان پر لائے۔ کبھی پنڈت جی نے قانون قدرت کی کوئی کتاب دیکھی ہے جس میں خدائی اختیار کے لیے حدود معین کیے گئے ہوں۔ یہ بات کیا کہتے ہیں اور پھر اپنے گریبان میں منہ نہیں ڈالا جاتا کہ ابتدائے دنیا میں ہزاروں جون جوان آدمیوں کا بے ماں باپ کے زمین سے پیدا ہونا تسلیم کر کے اپنے قانونِ قدرت کی کیسی بے حرمتی کی' وہاں پنڈت جی

کیوں نہیں کہتے کہ اگر اس وقت آدمی بے ماں باپ کے پیدا ہوتے تھے تو اب کیوں نہیں ہوتے چونکہ اب نہیں ہوتے اس لیے اس وقت بھی نہیں ہوئے تھے۔ یہ پنڈت جی ہی کے کلمے ہیں جو انھوں نے معجزہ کی نسبت کہے ہیں مگر عائد ہوتے ہیں ان ہی کے عقیدے پر۔

یہ تو بڑی جاہلانہ بات ہے کہ جو چیز آپ نے اپنے زمانہ میں ہوتی ہوئی نہیں دیکھی اس کی نسبت انکار کر دیا کہ کبھی ہوئی ہی نہیں۔ وید کا الہام آپ کے عقیدہ میں آج کسی کو نہیں ہوتا تو آپ مانئے کہ پہلے بھی کسی کو نہیں ہوتا تھا کیونکہ آپ نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ جو چیز اب نہیں ہوتی وہ پہلے بھی نہیں ہوئی۔

یہ اعتراض تو پنڈت جی کے دین و مذہب کا خاتمہ ہی کر دیتا ہے اور ہم پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں کیونکہ اول تو اس کے سب مقدمات باطل اور اس سے قطع نظر ثبوت قطعی اخبار صادقہ موجود اور ہزاروں معجزوں کے آثار اب تک باقی، انکار کرنے والا کہاں انکار کرے گا اور پھر ان کے پر تو اولیاء کی کرامتیں اس وقت بھی معائنے میں آ رہی ہیں۔ امروہہ ضلع مراد آباد میں شاہ ولایت صاحب کے مزار پر بے انتہا بچھو ہیں، اینٹ اٹھائیے بچھو نکل آئے گا مگر احاطہ درگاہ میں ممکن نہیں کہ وہ بچھو کسی کے کاٹ لے، بچھوؤں کے ہار بنا کر گلے میں ڈال لیتے ہیں، ہاتھوں میں لیے پھرتے ہیں، ڈنک پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں مگر وہ اپنا ڈنک موڑتا چلا جاتا ہے، مجال نہیں کہ کاٹ لے، پھر وہاں سے کسی محدود عرصہ کی اجازت لے کر آپ بچھو کو جس مقام پر چاہیے لے جائیے، اس میعاد کے اندر ہرگز نہ کاٹے گا۔

ہزاروں کرامتیں اولیاء کی آج معائنہ کی جاتی ہیں۔ انکار کرنے والا پنڈت آئے اور گئے اور ایمان لائے۔

○ ○ ○

اعتراض: جس طرح تم غیر مذہب والوں کو کافر کہتے ہو اسی طرح کیا وہ تم کو

کافر نہیں کہتے اور وہ اپنے مذہب کے خدا کی طرف سے تمہیں لعنت دیتے ہیں، پھر کہو کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔ جب غور سے دیکھتے ہیں تو سب مذہب والوں میں جھوٹ پایا جاتا ہے اور جو سچ ہے وہ سب میں یکساں ہے۔ (ستیارتھ پرکاش ص ۶۶۹)

جواب: آیت میں یہ مضمون تھا کہ یہود و نصاریٰ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کے وقت تک حضور کے نام پاک کے توسل سے مصیبت کے وقتوں میں دعائیں کیا کرتے تھے اور اپنے دشمن مشرکین کے مقابلہ میں فتح حاصل کرنے کے لیے اس نام کے ذریعے مدد طلب کرتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے۔ حضور کے ظہور نبوت تک تو ان کی عقیدت کا یہ حال تھا اور بچہ بچہ حضور کے نام پاک کی برکت کا معتقد تھا اور انھیں تجربے حاصل تھے کہ اس نام پاک کے توسل سے فتح و کامیابی حاصل ہوتی ہے، لیکن جس وقت وہی جانے اور پہچانے ہوئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سریر نبوت پر جلوہ فرما ہوئے اور آفتاب رسالت کی عالم افروز شعاعوں نے جہان کو منور کیا تو حسد و عناد سے یہ لوگ جل مرے اور حضور کے ساتھ کفر کر بیٹھے۔ اس آیت میں کفار کی نابینائی اور ان کے کمال عناد کا بیان ہے کہ حضور کے ظہور سے قبل تو نام پاک کا وردو وظیفہ رکھتے تھے، چاہیے تھا کہ ظہور کے وقت بھی اس نعمت عظمیٰ کی دل سے قدر کرتے، اسلام لانے میں دوسروں سے سبقت کرتے۔ ایسا نہیں کیا، جان پہچان کر حضور کے فضائل و کمالات کا مدتوں اعتراف کرنے کے بعد ظہور کے وقت منکر ہو گئے اور حسد در آنکھوں سے حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیادت و اقبال کا جلوہ نہ دیکھا گیا اور اس دشمنی میں انھوں نے اپنی عاقبت خراب کر لی اور کفر جیسی تاریکی میں گرفتار ہو گئے۔ ایسے معاندین بے شمار لعنت و ملامت کے مستحق ہیں اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہود و نصاریٰ نے توریت و انجیل میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کمالات اور آپ کی تشریف آوری کی خبریں پڑھ کر مدتوں آپ کا انتظار کیا، مشکلوں میں آپ کے نام کی برکت سے فائدے اٹھائے۔ باوجود اس کے آپ کی تشریف آوری کے وقت منکر ہو گئے، ان کا یہ کفران کے اپنے اعتراف و اقرار سے ان کے حق میں موجب ملامت ہے اور اس ملامت کو کوئی صاحب عقل و انصاف نظر اعتراض سے

نہیں دیکھ سکتا۔ پنڈت صاحب نے حسب عادت ان تمام واقعات سے نظر بچا کر ایک نہایت بھونڈا اعتراض لکھ دیا کہ جس طرح تم غیر مذہب والوں کو کافر کہتے ہو، اسی طرح وہ تم کو کافر نہیں کہتے۔

اوّل تو الحمد للہ تمام زمانہ کے کافر یہود و نصاریٰ مجوسی ہنود وغیرہ کوئی بھی مسلمانوں کو کافر نہیں کہتا۔ پنڈت صاحب کا اعتراض تو یہیں ختم ہو گیا۔ اب ذرا ان کے علم و قابلیت پر بھی تو نظر ڈال لیجئے، تو کیا اگر دوسرے مذہب والے بھی مسلمانوں کو کافر کہتے تو دونوں کا قول غلط ہو جاتا جیسا کہ پنڈت جی نے لکھا ہے۔ یہ لزوم انہوں نے کہاں سے نکالا اور اس پر ان کے پاس کیا دلیل ہے، کیا دو مخالفوں میں اگر ہر ایک دوسرے کی تکذیب کرتا ہو تو پنڈت صاحب کے نزدیک دونوں کا جھوٹا ہونا لازم ہے، کچہری میں جو مقدمات پیش ہوتے ہیں ان میں بالعموم ہر فریق دوسرے کو جھٹلاتا ہے تو کیا کسی مجسٹریٹ کے لیے یہ فیصلہ لکھنا جائز ہو گا کہ چونکہ ہر دو فریق ایک دوسرے کو جھٹلاتے ہیں۔ لہٰذا دونوں جھوٹے ہیں، مقدمہ خارج۔ اگر پنڈت جی کسی دیوانی کی کچہری کے حاکم یا کسی ملکی نزاع کے پنچ اور ثالث بنا دیئے جاتے تو وہ یہی فیصلہ لکھتے کہ فریقین میں سے ہر ایک زمین یا مکان کو اپنی ملک بتاتا ہے اور دوسرے کی ملکیت کا انکار کرتا ہے، لہٰذا دونوں جھوٹے ہیں مال یاروں کا۔

پنڈت جی نے یہ بات کیا سمجھ کر لکھی، اگر ایک نابینا کو کوئی اندھا کہے اور وہ نابینا جواب میں اس کو اندھا کہہ دے کہ وہ تو تمہیں اندھا کہتا ہے لہٰذا دونوں جھوٹے ہوئے لیکن کسی صاحب عقل سے پوچھئے کہ پنڈت جی کی اس بات میں کتنی سچائی ہے کسی شخص کے واقعی جرم پر گرفت کرنے کے بعد اگر وہ طیش میں آ کر گرفت کرنے والے کو گالی دے اور وہی لفظ کہے تو کیا اس سے وہ مجرم بے گناہ ہو جائے گا اور یہ اتہام اس کی برأت کی دلیل قرار پائے گا۔ ایک آوارہ اور بد چلن شخص کو اگر کوئی شخص بدمعاش کہے تو محض اس کے کہہ دینے سے ناصح بدمعاش بن جائے گا یا وہ بدمعاش صالح اور نیک چلن ہو جائے گا۔ یہ نمونہ ہے پنڈت صاحب کے علم و قابلیت کا۔

اس کے بعد پنڈت صاحب نے دل کھول کر تمام مذہبوں کو جھوٹا بتا دیا ہے اور کسی

مذہب کا بھی استثناء نہیں کیا۔ دوسرے مذہب والے تو پنڈت صاحب کے اس الزام کو کیوں مانیں گے لیکن پنڈت صاحب کے اس اقرار کا اثر خود ان کے اپنے مذہب پر ضرور پڑے گا اور یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ انہوں نے اپنے مذہب کو غیر مذاہب کی مخالفت کے ضمن میں جھوٹا مان لیا اور جب جھوٹا مان لیا تو وہ اور ان کے متبعین دنیا کو ایسے مذہب کی دعوت کیوں دیتے ہیں جو ان کی اپنی نظر میں بھی جھوٹ سے پاک نہیں۔

ثانیاً دنیا کے تمام مذاہب کو جھوٹا بتانا خود پنڈت جی کے بیان کردہ اصول سے ان کے دین کے باطل اور جھوٹ ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ وہ اسی ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۱۹۱ میں لکھتے ہیں: جو دوسرے مذہبوں کو کہ جن کے ہزاروں کروڑوں آدمی معتقد ہوں، جھوٹا بتلا دے اور اپنے کو سچا ظاہر کرے، اس سے بڑھ کر جھوٹا اور مذہب کون ہو سکتا ہے؟

یہ پنڈت جی کا اپنا فیصلہ ہے، اس کی بناء پر وہ تمام مذاہب کو جھوٹا بتا کر خود جھوٹے ہوئے اور انہوں نے اپنے مانے ہوئے اصول سے اپنے مذہب کے کذب و بطلان کا فیصلہ صادر کر دیا۔ یہ وہ فیصلہ ہے جس کی اپیل بھی نہیں۔ پنڈت جی نے اعتراض کے لیے جو اصول قائم کیا ہے، ارباب عقل کے نزدیک وہ نہایت جاہلانہ اصول ہے۔ انہیں یہ بھی نظر نہ آیا کہ اس کا اثر ان پر کیا پڑتا ہے، وہ جینیوں ستائیوں دام مارگیوں کو برا اور باطل پرست کہتے ہیں اور وہ لوگ آریوں کو تو پنڈت جی کے اپنے اسی اصول سے ماننا پڑے گا کہ دونوں جھوٹے ہیں۔

○ ○ ○

اعتراض: جب مسلمان کہتے ہیں کہ خدا لاشریک ہے، پھر یہ فوج کی فوج شریک کہاں سے کر دی کیا جو اوروں کا دشمن ہو، وہ خدا کا بھی دشمن ہو، اگر ایسا ہے تو ٹھیک نہیں کیونکہ خدا کسی کا دشمن نہیں ہو سکتا۔

جواب: پنڈت جی کا یہ اعتراض آیت "من کان عدوا للہ وملائکتہ

ورسلہ وجبریل ومیکال فان اللہ عدو للکافرین" پر ہے۔ اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو خدا کا اور خدا کے مقبول اور اس کی راہ بتانے والوں کا دشمن ہے، (وہ کافر ہے) اور خدا کافروں کا دشمن ہے۔ یہ تو ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ خدا کی دشمنی کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس سے ناخوش اور ناراض ہے اور اسے سخت ترین سزا دے گا۔ یہ معنی ہماری بول چال اور ہمارے محاورات میں بھی مستعمل ہیں۔ رات دن کہا جاتا ہے کہ زید جھوٹ کا دشمن ہے، اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ اس کو جھوٹ سے انتہا درجہ کی نفرت اور بے زاری ہے۔ اس کے یہ معنی کوئی نہیں سمجھتا کہ وہ جھوٹ سے برسر جنگ ہوتا ہے اور جھوٹ اس کے مقابلہ میں صف آرائی کرتا ہے۔ یقیناً جو خدا کے مقبولوں اور اس کی راہ بتانے والوں سے عداوت کرے، خداوند عالم ضرور اس سے ناراض ہوگا اور اس کو سخت سزا دے گا۔ سلطنت کے عمال اور اس کے احکام نافذ کرنے والوں کی مخالفت کرنے والا سلطنت کا باغی سمجھا جاتا ہے۔ ایک وائسرائے کا دشمن سمجھا بلکہ منصبی حیثیت سے ایک کانسٹیبل اور چپراسی کا دشمن حکومت کا دشمن سمجھا جاتا ہے اور حکومت کی مخالفت کے الزام میں اس کو گرفتار کرکے سزا دی جاتی ہے، تو کیسے ممکن ہے کہ خدا کے مخصوص بندوں کا دشمن خدا کا دشمن نہ ہو۔ یہ بات اس قدر صاف تھی جس کے سمجھنے میں کسی ادنیٰ فہم والے کو بھی تامل نہ ہوتا مگر پنڈت صاحب چکرا رہے ہیں اور ان کے لیے یہ بات عقدہ لاینحل ہو رہی ہے۔

سب سے پہلے تو پنڈت صاحب کی دیانت اور راستی قابل داد ہے جو یہ فرماتے ہیں کہ یہ فوج کی فوج شریک کہاں سے آگئی۔ آیت میں ملائکہ اور مرسلین اور جبریل و میکائیل کو شریک کب بتایا ہے۔ وہ کونسا لفظ ہے جس کے معنی پنڈت صاحب شریک کرتے ہیں۔ بسا افسوس کہ پنڈت صاحب کا منشائے اعتراض افتراء محض اور بہتان خالص ہے اور ایسا افتراء جس کا قرآن پاک میں ہزار جگہ صراحت و فصاحت کے ساتھ رد کیا گیا ہے اس کو قرآن پاک کی طرف منسوب کر دیا باوجودیکہ آیت میں کوئی ایسا کلمہ نہیں جس سے اس معنی کا ایہام بھی ہو سکے۔ پنڈت صاحب کی حیلہ داری کی داد دینا چاہیے جس مذہب کے پیشوا کی راستی کا یہ حال ہو اس مذہب کی سچائی کا کیا پوچھنا؟

○ ○ ○

اعتراض: وقولوا حطة نغفر لکم خطایاکم و سنزید المحسنین کا ترجمہ پنڈت جی نے یہ لکھا اور کہا کہ معافی مانگتے ہیں۔ ہم معاف کریں گے، تمہارے گناہ اور زیادہ دیں گے نیکی کرنے والوں کو۔ اس پر پنڈت نے یہ اعتراض کیا ہے: "بھلا یہ خدا کی ہدایت سب کو گناہگار بنانے والی ہے یا نہیں، کیونکہ گناہ معاف ہونے کا سہارا آدمیوں کو ملتا ہے، تب گناہوں سے کوئی بھی نہیں ڈرے گا اس واسطے ایسا لکھنے والا خدا اور یہ خدا کی بنائی ہوئی کتاب نہیں ہو سکتی وہ عادل ہے، بے انصافی کبھی نہیں کرتا اور گناہ معاف کرنے سے تو بے انصاف ہو جاتا ہے کیونکہ جیسا قصور ہو ویسی سزا دینے ہی سے عادل ہو سکتا ہے۔"

جواب: آیت کا صحیح ترجمہ تو کبھی پنڈت کو نصیب ہی نہیں ہوا۔ اس کی کہاں تک شکایت کی جائے۔ اب آپ کے اعتراض کو دیکھیے کس قدر عقل و دانش سے دور ہے، امید عفو کو آپ سبب گناہ قرار دیتے ہیں۔ یہ فاحش ترین غلطی ہے آپ کو یہ کیا معلوم ہوگا کہ آپ کب جانتے ہوں گے کہ مغفرت و معافی سے مایوسی بسا اوقات آدمی کو گناہوں میں مستغرق رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ دنیا میں ہر ایک مجرم کو فیصلے بلکہ نتیجہ اپیل کے وقت تک اپنی برأت کی امید لگی رہتی ہے اور یہی امید اس کو مزید فراغ کے ارتکاب سے روکتی ہے، طیش میں آکر ایک غضب ناک انسان دوسرے کو قتل کرتا ہے مگر اس کے ساتھ امیدوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے کہ شاید قتل کا ثبوت نہ پہنچے۔ شاید وکیلوں کی جرح ثبوت کی شہادتوں کو نکما کر دے، شاید ترحم خسروانہ کے سلسلہ میں میرے اس جرم سے درگزر کی جائے، شاید کوئی اور صورت رہائی کی نکل آئے، شاید مجھے بھاگ کر جانے کا موقع مل سکے۔ یہ امیدیں اس کو ایک قتل کے بعد دوسرے قتل کرنے سے روک دیتی ہیں، لیکن اگر وہ قتل کے ساتھ ہی اپنی رہائی سے بالکل مایوس ہو جائے اور خفیف سی کوئی امید بھی باقی نہ رہے اور یقین کامل ہو کہ اس کو ضرور پھانسی لگے گی، تو وہ جہاں تک ہو سکے اپنے اور دشمنوں پر بھی ہاتھ صاف کرتا چلا جائے اور یہ

سوچے کہ میری جان تو اب بچے ہی گی نہیں تو اب میں کسی کے ساتھ کیوں رعایت کروں؟

پنڈت جی کی فہم یہاں تک نہ پہنچی اور در حقیقت یہ ان کے مذہب کا قصور ہے جس نے خدا کو صفت عفو سے عاری سمجھا ہے لیکن جس حال میں کہ پنڈت جی کا یہ اعتقاد ہے کہ گناہ معاف کرنا خلاف عدل و انصاف ہے اور ان کے ایشور کو اس پر قدرت ہی نہیں تو دنیا کو ویدک دھرم کی دعوت دینا ایک لاحاصل بات ہے، کیونکہ جن لوگوں نے عمر بھر بت پرستی کی، پرانوں کو مانا، مورتیوں کو پوجا، دیوں کو برہما کے چار مونہوں سے نکلا ہوا مانا اور وید کے خلاف عمل کرتے رہے یا جو مسلمان ہیں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہیں، گائے کی قربانی کرتے ہیں، اس کا گوشت کھاتے ہیں اور عمر بھر انہیں افعال میں گزری ہے، ہزاروں گائیں انہوں نے ذبح کر ڈالی ہیں۔ پنڈت جی کے اعتقاد کے مطابق ایشور ان کا جرم تو معاف کر نہیں سکتا، صد ہا جونوں تک انہیں سزا بھگتی ہے۔ اس جون میں اتنے گناہ ہو گئے تو اگلی جون میں کیا اطمینان ہے کہ کوئی گناہ نہ ہوگا اور ضرور ہوگا اور ایشور معاف کر نہیں سکتا تو پھر اس کے بدلے اور جونوں میں سزا ملے گی اور اس میں بھی گناہ ہوگا تو سزا ہمیشہ بڑھتی ہی رہے گی۔ نجات کی ساعت کبھی نہ آئے گی تو اب بتائیں کہ کسی ہندو، مسلمان یا عیسائی کو آریہ بنانے سے کیا نتیجہ اور وہ کس طرح شدھ ہو سکتا ہے۔ جب پاپ معاف نہیں ہوتا گناہ نہیں بخشا جاتا، نجات متصور نہیں تو اب آدمی اپنا دین تبدیل کرے تو کیوں اور کس لیے اور جو لوگ آریہ ہیں، ان میں سے کیا گناہ نہیں ہوتے ہیں، صدہا گناہ ان سے صادر ہوتے ہیں اور معاف نہیں ہو سکتے تو نجات کا راستہ ان کے لیے ہی بند ہے۔ پنڈت جی کے اس اصول نے یہ بتایا کہ ان کے دھرم سے نجات کی توقع کرنی نئے اور پرانے آریہ دونوں کے لیے باطل و غلط ہے۔
اب ذرا یہ بھی دیکھ لیجئے کہ پنڈت جی کے دھرم میں غلط اور نمائش کی باتیں کس قدر ہیں۔ ستیارتھ پرکاش میں ایشور کے ناموں کے سلسلہ میں لکھتا ہے:

(وایو) چونکہ وہ (ایشور) متحرک اور ساکن جہاں کو قائم اور زندہ رکھتا ہے اور فنا کرتا ہے اور تمام قادروں سے قادر ہے اس لیے اس پرمیشور کا نام وایو ہے۔ (ص ۷)

یہاں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ایشور قادر ہے اور فنا و بقاء اس کے اختیار میں ہے لیکن حقیقت یہ ہے۔ قرآن پاک نے جو صفاتِ الٰہیہ کے شاندار درس دیئے ہیں اس کی نقل اتاری جاتی ہے اور محض نمائش کے لیے یہ صفتیں پیش کی جاتی ہیں، ورنہ جو فوج تناسخ کی قائل ہو اور مادہ کے ذرے ذرے اور ایک ایک جیو کو قدیم مانے وہ کس طرح اس کی فنا کی قائل ہو سکتی ہے۔ ایشور کے لیے فنا کا عام اختیار ظاہر کرنا ویدک دھرم کے مسلمہ اصول کے خلاف اور محض دکھاوے کی بات ہے۔ اسی طرح اس کو قادر بلکہ اقدر القادرین کہنا یہ بھی ایک مغالطہ ہے کیونکہ جو شخص آریہ دھرم میں کسی مجرم کا خفیف سا جرم ہی معاف نہیں کر سکتا اس کو قادر یا اقدر القادرین کہنے کے کیا معنی ہیں، بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص زندگی نسبت رکھے کہ اسے اندھیرے اجالے میں کچھ نظر نہیں آتا۔ ایک شہتیر کو دن دہاڑے نہیں دیکھ سکتا، پہاڑ تک اس کو نہیں سوجھتا، مگر ہے وہ بڑا حدید البصر تیز نظر۔ جبھی یہ تعریف ایک تمسخر اور یاوہ گوئی ہے، ایسا ہی مجبور محض کو مجبور مانتے ہوئے ایشور کو اقدر القادرین کہنا تمسخر اور صرف نمائشی بات ہے، جیسے پرمیشور کی سچائی، انصاف، رحم، کامل قدرت اور کامل علم وغیرہ۔ بے شمار صفتیں ویسی دیگر کسی بے جان یا جان دار کی نہیں ہیں۔ (ستیارتھ پرکاش ص ۸)

رحم اور کامل قدرت کا یہ حال ہے کہ ایک خطاکار کا چھوٹے سے چھوٹا گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ اتنے بڑے رحیم کو خطا بخشنے سے مجبور اور ایسی کامل قدرت رکھتے ہیں کہ ایک ذرہ بھر قصور معاف کرنے کا اختیار نہیں۔ انصاف کی عینک لگا کر دیکھیے کہ یہ صفتیں محض گنانے یا شمار کرانے کے لیے لکھی گئی ہیں اور حقیقتاً اعتقاد ہے کہ ایشور بے چارا مجبور محض اور عاجز و ناچار ہے۔

(۳) چونکہ کامل جاہ و حشمت رکھنے والا پرمیشور ہی ہے، اس لیے اس کو اندر بھی کہتے ہیں۔ (ص ۹ ستیارتھ) یہ صفتیں بھی نرے دکھاوے ہی کی ہیں۔ کامل جاہ کا تو یہ حال کہ کسی قصوروار کی تقصیر سے درگزر اختیار سے باہر اور حشمت و دولت کی یہ کیفیت کہ ایک دانہ بے عوض کسی کو نہیں دے سکتے۔ مالک تو ہیں ساری کائنات کے مگر ایک جو دینے کا اختیار نہیں۔ کیا شانِ علی ہے اور کیا صفت کامل ہے، تاگری بھی ہو تو ایسی ہو۔

(۴۰) وید منتر میں ایک التجا ہے:

"اے پرمیشور آپ ہی عالم القلوب (انتریامی) ہونے سے بالتحقیق برہم ہیں کیونکہ آپ ہر جگہ موجود ہونے کی وجہ سے سب کے لیے قابل حصول ہیں۔ جو آپ کا صحیح حکم ویدوں میں ہے میں سب کو اسی کا اپدیش اور خود بھی عمل کروں گا۔ سچ بولوں گا، سچ مانوں گا اور سچ ہی عمل میں لاؤں گا۔ پس آپ میری حفاظت کیجئے۔ آپ مجھ آپت یعنی راست گو کی حفاظت کیجئے، تاکہ میری عقل آپ کے فرمانوں میں قائم رہ کر الٹی کبھی نہ ہو۔"

(ستیارتھ پرکاش ص ۱۱۰)

اس منتر میں دعا کا چربہ اتارا ہے اور نمائش کے لیے یہ ظاہر کیا ہے کہ ایشور دعا کے قبول کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ اس کے صفات رب العالمین کے اس مرتبہ سے گھٹ نہ جائیں جو اسلام اور قرآن نے بتایا ہے اور مجیب الداعین کی صفت سے ایشور محروم اور کورا نہ رہ جائے۔ مگر اس کی حقیقت نمائش سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ ویدک دھرم میں اگر پچھلے عمل اس کو مستحق حفاظت کرتے ہیں تو دعا و التجا بے کار ہے۔ ایشور پر خود ہی حفاظت کرنا واجب ہے بلکہ اگر منع بھی کیجئے تو وہ حفاظت کرے گا اور حفاظت کرنے پر حسب اعتقاد آریہ مجبور ہوگا اور اگر پچھلے عمل ایسے نہیں ہیں تو آپ لاکھ کہئے، کبھی حفاظت نہ کرے گا تو بقول پنڈت جی کے اس کا انصاف جاتا رہے گا۔ دونوں حالتوں میں ایشور بے چارا دعا کے قبول کرنے سے عاجز و مجبور ہے، اب جو یہ دعا کی گئی یہ محض دکھاوا اور مسلمانوں کی نقل نہیں تو اور کیا ہے۔ اس منتر سے یہ بھی ثابت ہوا کہ سیدھی راہ چلنے کی توفیق دینا بھی ایشور کے ہاتھ میں ہے۔ اگر ایسا ہے تو کارخانہ تناسخ باطل ہے کہ وہاں سوائے عمل صالح کے کوئی سبب نعمت نہیں ہو سکتی اور بغیر جزا کے کوئی سلوک نیک کسی کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ نقل تو کی اھدنا الصراط المستقیم کی مگر اس اعتقاد حق سے محروم تھے جس پر اس دعا کے حق ہونے کا دار ہے۔

○ ○ ○

اعتراض: آیہ "واذ استسقی موسی لقومہ" کا ترجمہ ان لفظوں میں لکھا ہے: "جب موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے پانی مانگا ہم نے کہا کہ اپنا عصا پتھر پر مار، اس میں سے بارہ چشمے بہہ نکلے۔"

یہ ترجمہ کر کے پنڈت جی یہ اعتراض کرتے ہیں۔ اعتراض دیکھئے ان ناممکن باتوں کی برابر دوسرا کوئی شخص کیا کہے گا۔ ایک پتھر پر عصا مارنے سے بارہ چشموں کا نکلنا ناممکن ہے، ہاں اس پتھر کو اندر سے کولا کر کے اس میں پانی بھر لیں اور بارہ سوراخ کرنے سے ایسا ہونا ممکن ہے اور کسی طرح نہیں۔

جواب: پنڈت جی نے ارادہ کر لیا ہے کہ وہ آیات قرآنیہ کی تکذیب و انکار پر کورانہ اڑے رہیں گے اور خواہ عقلاً وہ انکار کتنا بھی معیوب ہو اس کی اصلاح نہ کریں گے۔ حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوۃ والسلام کا معجزہ تھا کہ ضرب عصا سے بارہ چشمے نمودار ہوئے۔

کائنات میں نظر کرنے والے روز مرہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ خاصانِ خدا کے ہاتھوں پر ہزارہا عجائب و غرائب ایسے ظہور پذیر ہوتے ہیں جو ناظرین کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ چوں و چرا کرنے اور ناممکن و محال کہہ دینے سے واقعات نہیں مٹ سکتے۔ بچھو کا کام کاٹنے کا ہے اس کی طبیعت کا یہی مقتضا ہے۔

نیش کژدم نہ از پئے کین ست
مقتضائے طبیعتش این ست

پنڈت کے نزدیک کسی چیز کے طبعی خواص کو ایشور بھی نہیں بدل سکتا چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "جو قدرتی اصول ہیں مثلاً آگ گرم، پانی ٹھنڈا اور مٹی وغیرہ تمام ذی شعور ہیں، ان کی طبعی صفت کو پرمیشور بھی نہیں پلٹ سکتا۔" (ستیارتھ پرکاش ص ۲۸۱)

پنڈت جی کے نزدیک اس عقیدہ کے بموجب ناممکن ہے کہ بچھو کا طبعی خواص یعنی ڈنک مارنا اور کاٹنا بدل جائے۔ یہ بات پنڈت جی کے نزدیک ناممکن بھی ہے اور ایشور کے مقدور سے باہر بھی کہ اگر پنڈت جی کا ایشور چاہے بھی کہ بچھو کاٹنا چھوڑ دے تو اس بے چارے کے چاہے کچھ نہ ہو اور بچھو ڈنک مارنے سے باز نہ آئے۔ اپنے عقیدہ کے

بموجب ایشور کے یہ اختیارات دیکھتے ہوئے اگر ایک پتھر سے بارہ چشموں کا برآمد ہونا ناممکن سمجھ گئے تو کوئی تعجب نہیں، مگر واقعات ان کے اس اعتقاد کو باطل کر دیں تو بے چارے کے بس کی بات نہیں۔ زمانہ پاک حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام بہت دور ہو چکا اور اسی بھروسہ پر پنڈت جی نے اس کے معجزہ کا انکار کر دیا کہ نہ اب وہ زمانہ لوٹ آئے گا نہ پنڈت جی کو کوئی ذلیل کر سکے گا مگر ان بے چارے کو یہ خیال نہ آیا کہ غلامان حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی کرامتیں آج بھی دنیا کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ وہ پنڈت جی کے عقیدہ کا بطلان ظاہر کر دیں گے۔

امروہہ ضلع مراد آباد میں آستانہ حضرت شاہ ولایت صاحب قدس سرہ العزیز میں ہر زمانہ و ہر موسم میں ہزارہا بچھو ملتے ہیں اور احاطہ درگاہ کے اندر کوئی بچھو کسی طرح نہیں کاٹتا، ہاتھ پر رکھئے خواہ گلے میں بچھوؤں کا ہار بنا کر ڈال لیجئے یا بچھو کے ڈنک پر ہاتھ رکھئے، کسی طرح وہ نہیں کاٹتا اور اس کا وہ طبعی خاصہ پلٹ جاتا ہے جس کو پنڈت جی کا ایشور بھی نہیں پلٹ سکتا تھا تو اب پنڈت جی بتائیں کہ ایسی ناممکن بات جو ان کے عقیدہ پر ایشور کے اختیار میں نہ تھی، کس طرح واقع ہو گئی اور اس کا استحالہ کہاں چلا گیا اور ایشور سے بڑھ کر کونسی قدرت ہے جس نے اپنا کرشمہ دکھلایا۔ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا نہیں جس کو مکر جائے تو اس زمانہ کا پھر آپ کی آنکھوں کے سامنے لانا ممکن نہ ہو۔ یہ کرامت آج ظاہر ہے، لاکھوں کفار دیکھ چکے ہیں۔ روزانہ خلق خدا اس کے تجربے اور مشاہدے کرتی ہے جس آریہ کا دل چاہے امروہہ جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے، قادر مطلق اپنے مقبولان بارگاہ کے مبارک ہاتھوں پر ایسے عجائب کا اظہار فرماتا ہے اس کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام سے بارہ چشمے ظاہر فرمادے۔ اس کو پنڈت جی نے محض اپنے عقیدے کی بناء پر ناممکن کہہ دیا۔ کچھ علم ہوتا تو استحالہ پر کوئی دلیل قائم کرتے۔ محال ہونے کا دعویٰ اور دلیل خاک نہیں، کس قدر شرمناک جہالت ہے۔

آخر میں آپ کو خود بھی کچھ خیال آیا تو لکھتے ہیں اس پتھر کو اندر سے پولا کر اس میں پانی بھر لیں اور بارہ سوراخ کرنے سے ایسا ہونا ممکن ہے اور کسی طرح نہیں۔ ابھی

ابھی جو بات ناممکن بتائی تھی، ابھی اپنی ایک خیالی صورت سے اس کو ممکن قرار دے دیا۔ اس شخص کو اپنی رائے پر خود جزم و اعتماد نہیں، پھر اس کے اعتراض کی کیا حقیقت۔ جو اعتراض پتھر سے چشمے جاری ہونے کے استحالہ و عدم امکان کی بناء پر تھا، وہ چشموں کا جریان پتھر سے ممکن مان لینے سے باطل ہو گیا۔ پنڈت جی کی اپنی ہی بات خود ان کا رد ہو گئی، پھر نہ معلوم یہ اعتراض کیا کیوں ہے کہ اس سے عقلا سوائے معترض کی کم عقلی و نادانی اور کیا سمجھیں۔ اس سے بے فائدہ کاغذ سیاہ کرنے کا کیا نتیجہ۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

○ ○ ○

اعتراض: آیہ کریمہ "واللہ یختص برحمتہ من یشاء" کا پنڈت جی نے یہ ترجمہ لکھا: "اور اللہ خاص کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، ساتھ رحم اپنے کے" اور اس پر یہ اعتراض کیا: "کیا جو مخصوص اور رحم کیے جانے کے لائق نہیں ان کو بھی (خدا) مخصوص کرتا ہے اور اس پر رحم کرتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو خدا گڑبڑ مچانے والا ہے، پھر اچھا کام کون کرے گا؟ اور برے کام کون چھوڑے گا؟ کیونکہ ایسی صورت میں خدا کی رضامندی پر انسان بھروسہ کریں گے اور اعمالوں کے نتائج پر نہیں۔ اس گڑبڑ کی وجہ سے تو سب نیک اعمال کرنے سے دستبردار ہو جائیں گے۔"

جواب: پنڈت جی کی تہذیب کا ماتم تو اس حالت میں کچھ مناسب ہو سکتا جبکہ ان کی ذات سے اس کی امید بھی ہوتی۔ یہ بدزبانی اور شانِ الٰہی میں، بد سے بد اور سیاہ دل آدمی بھی اس کی جرأت نہیں کر سکتا۔ صحرائی اور وحشی آدمی بھی خدا کا نام ادب سے لیتا ہے مگر آریہ دھرم کا بانی شانِ الٰہی میں بدزبانی کرنا اپنی قابلیت سمجھتا ہے۔ جس کی شائستگی کا یہ حال ہو وہ کیا رہنمائی کرے گا اور جو قوم ایسے شخص کو پیشوا مانتی ہو وہ کیسے صفات پیدا کر سکے گی؟

اس سے قطع نظر کر کے اعتراض کو دیکھیے تو نہایت لغو اور تعصب محض ہے، اہل

علم اس کو کس حقارت کی نظر سے دیکھیں گے۔

یہ اعتراض نہیں اس کو منہ چڑانا کہتے ہیں۔ آیت شریفہ میں مضمون تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے مخصوص فرماتا ہے، اس پر یہ کہنا کہ جو رحم کیے جائیں گے، لائق نہیں ان کو بھی مخصوص کرتا اور ان پر بھی رحم کرتا ہے، کس قدر بے محل بات ہے۔ یہ کہا کس لیے تھا کہ جو رحم کے قابل نہیں اس پر رحم کرتا ہے۔ آیت میں یہ مضمون ہے کب، عجب معترض ہے جو نشہ اعتراض میں اس قدر بے خود و سرشار ہے کہ اس کو یہ بھی پتا نہیں کہ جس بات پر وہ اعتراض کرتا ہے وہ اس کلام میں موجود ہی نہیں، جس پر اس کو اعتراض ہے۔

علاوہ بریں یہ کہنا کہ جو قابلِ رحم نہیں، کیا خدا اس پر بھی رحم کرتا ہے؟ انتہا درجہ کی خدا ناشناسی ہے۔ حکیم جو کرتا ہے وہ حکمت ہے، خدا جس کو دیتا ہے وہی اہل ہے، جس پر رحم فرماتا ہے وہی لائق ہے، جس کو اس کا رحم مخصوص کرے اس سے بڑھ کر لائق کون، لیاقت آتی کہاں سے ہے۔

داد حق را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرط قابلیت داد او ست

پنڈت جی لیاقت کس کو کہتے ہیں؟ انہوں نے لیاقت و قابلیت سے استحقاق مراد لیا ہے اور مطلب انکار ہے کہ جو اپنے اعمال نیک سے مستحق ہو اس پر رحم ہونا چاہیے مگر ایسا کہنا جہالت ہے کیونکہ جس چیز کا کوئی مستحق ہے اس کا دینا رحم نہیں یہ تو ادائے حق ہوا اس کو رحم کہنا ہی غلطی ہے۔ اس اعتراض سے معلوم ہوا کہ معترض رحم کے معنی تک نہیں جانتا اور جانتا تو جب کہ اس کے عقیدہ میں رحم ہوتا بھی یقیناً رحم ایک پاکیزہ اور برتر صفت ہے۔

مگر آریہ دھرم نے ایشور کو اس بہترین صفت سے عاری و محروم کیا ہے۔ ایک زمیندار رعایا پر رحم کر سکتا ہے، ایک مجسٹریٹ مجرم کو اپنے رحم سے نواز سکتا ہے مگر آریہ دھرم کا ایشور جس کو عالم کا کارساز کہا جاتا ہے، اپنے بندوں پر رحم نہیں کر سکتا۔ مجبور ہے اگر بالفرض وہ ایسا کرے تو آریہ اصول کی بناء پر تمام کارخانہ اس کی خدائی کا

درہم برہم ہو جائے اور اس کے بندوں میں اس کا کچھ خوف باقی نہ رہے اور لوگ نیک کام کرنا چھوڑ دیں جیسا کہ پنڈت جی نے اسی اعتراض کے سلسلہ میں کہا ہے۔ تعجب ہے کہ ایشور کو قادر مطلق مانتے ہوئے اتنے اندیشوں اور مجبوریوں نے گھیر رکھا ہے مگر گاؤں کا چودھری بے دھڑک رحم کر سکتا ہے، کہو تم نے ایشور کی کتنی قدر کی؟ اس کی شان بندوں سے بھی گھٹا دی۔ اب رہی یہ بات کہ رحم سے رعب جاتا رہتا ہے اور بندے جری ہو جاتے ہیں۔ یہ بات وہ کہہ سکتا ہے جو خدا کو قادر مطلق اور جبار و قہار نہ جانتا ہو یا یہ سمجھتا ہو کہ سزا دینا اس کے اختیار سے باہر ہے' ورنہ جو یہ اعتقاد نہ رکھے وہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ بندے نیک کام کرنا چھوڑ دیں گے۔ جب وہ جانتے ہیں کہ وہ رحیم بھی ہے، قہار بھی ہے، قادر مختار بھی، جو چاہے کرے، اگر گناہ پر پکڑے تو اس کے عذاب سے چھڑانے والا کوئی نہیں، اگر معاف کرے تو اس کو اختیار ہے۔ یہ جاننے والا کیسے بے خوف ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ معاف بھی کرتے ہیں، رحم و کرم بھی مگر پھر بھی مارے خوف کے رعایا لرزتی اور کانپتی ہے، اگر پنڈت جی کا خیال درست ہو تو دنیا کی ہر سلطنت میں قانون بے کار ہو جانا چاہیے اور ہر ملک کی رعایا کو بالعموم باغی اور غدار بننا لازم ہو۔ ایسے اباطیل پر جس مذہب کے عقائد کی بناء ہے، وہ انسان کو سوائے گمراہی کے اور کیا دے سکتا ہے۔

○ ○ ○

اعتراض: "وکثیر من اھل الکتاب لو یردونکم من بعد ایمانکم کفارا حسدا من عند انفسھم من بعد ما تبین لھم الحق" کا پنڈت نے یہ ترجمہ لکھا: ایسا نہ ہو کہ کافر لوگ حسد کر کے تم کو ایمان سے منحرف کر دیویں کیونکہ ان میں ایمان والوں کے بہت سے دوست ہیں اور اس پر یہ اعتراض کیا اب دیکھیے خدا ہی ان کو یاد دلاتا ہے کہ تمہارے ایمان کو کافر لوگ نہ گرا دیویں۔ کیا خدا ہمہ داں نہیں ہے، ایسی باتیں خدا کی نہیں ہو سکتی ہیں۔

جواب: معترض دیانت اور عقل دونوں سے بالکل محروم ہے۔ ترجمہ بگاڑا ایسا بگاڑا کہ کچھ کا کچھ کر دیا جو قرآن پاک میں نہیں، جس کا شائبہ اور بو بھی نہیں، وہ اپنی طرف سے داخل کر دیا۔ تمام آب بیتے بتائیں کہ پنڈت کے یہ الفاظ "کیونکہ ان میں سے ایمان والوں کے بہت سے دوست ہیں" یہ عبارت اس آیت کے کونسے جملہ کا ترجمہ ہے؟ کونسے جز کا حاصل ہے؟ ایسا ستم یہ غضب ایسا صریح جھوٹ اتنا بڑا جیتا افترا ایسا اندھیر یا بہتان اور وہ بھی قرآن پاک پر جو دید کی طرح کوئی چھپی چیز نہیں کہ اس کا میسر آنا دشوار ہو۔ ترجمے ناپید ہوں، اردو، فارسی، انگریزی تمام زبانوں میں قرآن پاک کے ترجمے موجود ہیں۔ یہ جرأت اور شوخ چشمی کہ ایسی کتاب پر صریح کھلا بہتان اٹھا دیا اور پرواہ نہ کی کہ ارباب انصاف دیکھیں گے۔ صداقت و راستی کے جانچنے والے نظر تحقیق سے جانچیں گے تو ایسے مفتری کو روسیاہ تیرہ باطن بتائیں گے۔

یہ قرآن کریم پر اعتراض ہوا یا معترض کی اپنی بے دینی و بے ایمانی کا ثبوت۔

یہ دلیل واضح ہے کہ قرآن پاک پر اعتراض کرنے والا اس کتاب مقدس کے مضامین میں چون و چرا کی جگہ نہیں پاتا تو مجبوراً اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے کذب و دروغ پر اتر آتا ہے، ہمیں یہ بھی غور کرنا ہے کہ جو انسان کسی پر اعتراض کرنے کے لیے جھوٹ بولتا ہے اس کا ضمیر اور اس کا آئینہ خاطر کیا ہے۔ کسی صاحب عقل کے نزدیک پاک اور مصفا ہو سکتا ہے اور کیا ایسے شخص کو رہنما بنانا قرین عقل ہے اور جس قوم نے ایسے شخص کے ساتھ روابط عقیدت کو مضبوط کیا ہو، کیا وہ انسانی فضائل سے بہرہ مند ہو سکتی ہے۔ آنکھ والو چشم بصیرت سے دیکھو، بے جا طرف داری کے جذبے یا تعصب کے جوش میں اپنے آپ کو قعر ضلالت و ورطہ گمراہی میں نہ ڈالو۔

آیت کریمہ کا صاف صریح ترجمہ یہ ہے جو مولوی عبدالحق صاحب حقانی دہلوی کی تفسیر سے اس لیے نقل کیا جاتا ہے کہ پنڈت جی نے ان کی تفسیر کا شاہ[1] عبدالحق کہہ کر حوالہ دیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے تفسیر فتح المنان مطبع مجتبائی دہلی ص ۲۳۳: "اکثر اہل کتاب تو اپنے حسد سے حق ظاہر ہونے کے بعد یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم کو ایمان لانے کے بعد بھی

[1] یہ بھی معلومات کی کوتاہی ہے، ۱۲۔

پھر کافر کر ڈالیں گے؟"

یہ ترجمہ اس لیے نقل کیا گیا کہ ستیارتھ کے فٹ نوٹ میں مولوی عبدالحق کی تفسیر کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتراض کرتے وقت یہ تفسیر پیش نظر تھی، باوجود اس کے یہ افترا پردازی کی گئی۔ اب عینک نہیں دوربین لگا کر دیکھئے کہ پنڈت جی کا جملہ مذکورہ اس ترجمہ میں کب موجود ہے جس سے اس معنی کی طرف اشارہ بھی ہوتا ہو جس کو انھوں نے بے دھڑک قرآن پاک کی طرف نسبت کیا ہے۔

اب اس پر کچھ بھی اعتراض ہوگا وہ معترض کی اپنی ساختہ عبارت پر ہوگا۔ قرآن پاک سے اس کو کیا علاقہ۔

یہ تو تھا معترض کی دیانت کا بیان، اب معترض کی عقل و دانائی سے بے تعلق ملاحظہ کیجئے کہ یہ جملہ جو اس نے اپنی طرف سے بڑھایا اسی کو "کیونکہ" کہہ کر جملہ سابقہ کی دلیل بنایا اور اس پر نظر نہ کی کہ یہ جملہ پہلے جملہ سے مناسبت ہی کیا رکھتا ہے، دلیل کیسے ہو سکے گا حسد کر کے بے ایمانی کرنے کی دوست ہوتا یہ معترض کی سادگی ہے کہ وہ دوستی کو حسد کی دلیل قرار دیتا ہے۔

اس کے بعد جو آپ نے اعتراض کیا ہے وہ بھی نہایت بے سروپا سارا مجموعہ ہی ذخیرہ بے ربطگی ہے۔ اعتراض کیا گیا ہے کہ خدا ہی ان کو یاد دلاتا ہے کہ تمہارے ایمان کو کافر لوگ نہ گرا دیویں۔ کیا خدا ہمہ دان نہیں ہے، نہ گرا دیویں کا محاورہ زباں دانی اور قابلیت کا جوہر ہے اور یہ اعتراض معترض کی عقل و دانائی کا خاتمہ کرتا ہے۔ ادنی عقل والا سمجھ سکتا ہے کہ کسی کو پیش آنے والا خطرہ سے آگاہ کرنا واقف کار اور صاحب علم ہی کا کام ہو سکتا ہے، اس کو ہمہ دانی کے خلاف سمجھنا عقل و دانائی کے خلاف بلکہ دانش مندی سے عداوت ہے۔ ایسے اعتراض کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے اس قسم کا لایعنی کلام آدمی کو بے عزت اور اہلِ علم کی نظر میں ذلیل و رسوا کرتا ہے۔

○ ○ ○

اعتراض: پنڈت نے آیہ کریمہ "اینما تولوا فثم وجہ اللہ" کا ترجمہ ان الفاظ میں لکھا: "تم جدھر منہ کرو، ادھر ہی منہ اللہ کا ہے۔" اور اس پر یہ اعتراض کیا ہے: "اگر یہ بات سچی ہے تو مسلمان قبلہ کی طرف منہ کیوں کرتے ہیں؟ اگر کہیں کہ ہم کو قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہے تو یہ بھی حکم ہے کہ چاہے جس طرف کو منہ کرو۔ کیا ایک بات سچی اور دوسری جھوٹی ہوگی؟ اور اگر اللہ کا منہ ہے تو وہ سب طرف ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ایک منہ ایک طرف رہے گا سب طرف کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس واسطے یہ بات ٹھیک نہیں۔"

جواب: آیہ کریمہ کا ترجمہ یہ ہے: "تم جہاں منہ کرو وہیں وہ اللہ تمہاری طرف متوجہ ہے۔" جو شخص قرآن پاک کو نہ سمجھے، موارد کلام سے بے خبر ہو، تفاسیر کا علم نہ رکھتا ہو، اس نافہم کا اعتراض کیا حقیقت رکھتا ہے؟ بات کیا تھی، ابھی سمجھے ہی نہیں اور اعتراض جڑ دیا۔ یہ ایک رسوا کرنے والی جہالت ہے۔ آیت کے معانی کی تفصیل تو کہاں پنڈت کے دماغ میں سما سکتی تھی لیکن اگر قرآن پاک پر کچھ نظر ہوتی تو اس کو معلوم ہوتا کہ قبلہ پہلے کعبہ تھا پھر بیت المقدس ہوا۔ اس کی طرف حضور نماز پڑھتے تھے پھر بیت المقدس کا قبلہ منسوخ ہوا اور حضور کے حسبِ خواہش کعبہ شریف قبلہ بنایا گیا۔ اس پر عرب کے کفار نے طعن کیا، اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: للہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ کہ مشرق و مغرب سب خدا کا ہے جہاں تم رُخ کرو وہیں وجہ اللہ یعنی جہت مامورہ یا رضائے الٰہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے، مشرق و مغرب اور تمام جہات اسی کے ہیں، وہ بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دے یا کعبہ مقدسہ کی طرف، جدھر اس کی رضا ہو وہی قبلہ ہے اور اسی طرف متوجہ ہونا مقبول بندہ کو اس میں کیا جائے عذر اور کیا مجال اعتراض جس طرح کعبہ اس کے حکم سے قبلہ ہوتا ہے، اسی طرح بیت المقدس اسی کے حکم سے قبلہ ہو جاتا ہے۔ اس پر اعتراض کرنا نہایت نادانی و سفاہت ہے۔

کفار کے اعتراض کا یہ جواب دیا گیا اور قرآن کریم میں ان کے اعتراض سے پہلے خبر دے دی گئی تھی کہ وہ اس طرح کی یاوہ گوئی کریں گے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ۔

عنقریب کہیں گے بے وقوف لوگ کس نے بنا دیا ان کو (مسلمانوں کو) ان کے اس قبلہ سے جس پر وہ تھے، آپ فرما دیجیے کہ اللہ ہی کا مشرق و مغرب۔

اس آیت میں خبر ہے کہ کفار تحویل قبلہ پر اعتراض کریں گے اور ان کا یہ جواب ہے کہ مشرق و مغرب خدا ہی کا ہے، وہ جدھر چاہے اپنے بندوں کو متوجہ ہونے کا حکم دے، اس پر اعتراض کیا چنانچہ ایسا ہی ہوا اور قرآن پاک کی خبر کے مطابق کفار نے یہ اعتراض کیا اور ان کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا گیا: لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔ مراد یہ ہے کہ جب مشرق و مغرب سب کا مالک اللہ ہے، تو جدھر تم اس کے حکم سے منہ کرو اس کی رضا حاصل ہوگی۔ اس پر کافروں کا معترض ہونا اور طعن کرنا محض جہالت ہے۔ اس مضمون سے پنڈت کے اعتراض کو کیا مناسبت اور اس آیت سے قبلہ کی طرف منہ نہ کرنا اس نے کیسے سمجھ لیا اگر قرآن پاک پر معترض کی نظر ہوتی اور آیت سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ جو ہم نے اوپر نقل کی ہے، اس نے دیکھی ہوتی تو ایسا لایعنی اعتراض کر کے اہل علم کی نگاہوں میں اپنے آپ کو رسوا نہ کرتا پھر وجہ اللہ کے معنی خدا کا منہ کس نے بتائے ہیں۔ وجہ جہت اور قبلہ کے معنی میں آتا ہے یا رضا کے معنی میں۔

چنانچہ تفسیر احمدی میں ہے: "اَلْوَجْهُ اما بِمَعْنَى الْجِهَةِ او الْقِبْلَةِ اَوِ الرِّضَاءِ۔" دونوں تقدیروں پر اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ خواہ وجہ قبلہ کے معنی میں لیا جائے یا رضا کے اور یہ کہہ دینا کہ جس کا منہ ہوگا ایک ہی طرف ہوگا۔ یہ بھی کوتاہ نظری ہے۔ عالم حیوانات میں نظر کو مقصور کرنے سے کوئی کوتاہ عقل اس شبہ میں پڑ سکتا ہے، ورنہ ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ وجہ اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ مواجہت حاصل ہو تو جس شے کو کوئی جہت مواجہت سے مانع نہ ہو اس کے منہ کو ایک جہت خاص کے ساتھ مقید کر دینا کم فہمی و نادانی ہے۔ مجلس میں روشن ہونے والی ایک شمع کا منہ تمام اہل مجلس کی طرف ہے اور ہر ایک کو اس سے یکساں مواجہت حاصل ہے یہ تو نور مجازی کا

حال ہے اور نورِ حقیقی جو کیف سے بھی وراء ہے' اس کو جہت کیا مقید کر سکے گی۔ اسی فہم پر ذات و صفاتِ الٰہی میں کلام کرنے کا دعویٰ ہے۔ ہمارے لیے منہ ہونا اور ایک طرف ہونا اور ہماری مواجہت کا ایک جہت کے ساتھ مقید ہونا اور ہمارے بصر و کلام وغیرہ کا ایک جہت کے ساتھ خاص ہونا ہماری کمزوری اور عبدیت کا ضعف و نقصان ہے۔ کمال یہی تھا کہ قوتِ بینائی ایک جہت کے ساتھ مقید نہ ہوتی' اسی طرح شامہ ذائقہ اور کلام کرنے والے آلات ایک سمت کے پابند نہ ہوتے' بیک لمحہ ہر ہر طرف دیکھتے' شش جہت ہمارے لیے یکساں ہوتیں' ہمارے تمام آلات ہر طرف کام کرتے مگر صرف آنکھیں دیکھتی ہیں' چہرہ کے مقابل کی جانب دیکھتی ہیں' بدن کے باقی حصے بینائی نہیں رکھتے' یہ نقصان ہوا یا کمال اگر ہمارے جملہ اور اکارت ہر جانب یکساں ہوتے تو منہ کو یک طرف نہ کہا جا سکتا۔ اپنی اسی کمزوری اور عیب پر مالک بے عیب کو قیاس کرنا اور جن قیود میں خود مقید ہیں' ان کا اس بے نیاز کو پابند بتایا جائے' نہایت بے علمی اور بے اوبرائی ہے۔

آیت بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ کا ترجمہ پنڈت نے ان الفاظ میں کیا ہے: "جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے جب وہ کچھ کرنا چاہتا ہے یہ نہیں کہ اس کو کرنا پڑتا ہے بلکہ اسے کہتا ہے کہ ہو جا پس ہو جاتا ہے۔" اس پر یہ اعتراض کیا ہے:

اعتراض: بھلا جب خدا نے حکم دیا کہ ہو جا تو یہ حکم کس نے سنا؟ اور کس کو سنایا گیا؟ اور کون بن گیا؟ کس علت مادی سے بنایا گیا؟ جب یہ لکھتے ہیں کہ آفرینش کے پہلے سوائے خدا کے کوئی بھی چیز نہ تھی تو یہ دنیا کہاں سے ہوئی؟ علت کے بغیر معلول نہیں ہوتا تو اتنا بڑا جہان علت کے بغیر کہاں سے ہو گیا؟ یہ بات صرف لڑکپن کی ہے۔

جواب: پنڈت جی بہت حیرت ہے کہ جب پروردگارِ عالم نے حکم دیا ہو گا کس نے سنا ہو گا؟ کس کو سنایا ہو گا اور علت مادی کے بغیر کوئی چیز کیونکر بنی ہو گی؟ جہاں تک ان کے علم' عقل اور مشاہدہ کی رسائی ہے' اسی احاطہ میں آپ عجائباتِ قدرتِ الٰہی کو محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک چوبچہ کا مینڈک کنویں کی وسعت دیکھ کر حیران

ہوتا ہے، تالاب، دریا اور سمندر کے پانی کا اندازہ اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے اور وہ اپنے مشاہدہ کی بناء پر یقین کرتا ہے کہ سمندر کی لمبائی، چوڑائی، گہرائی مبالغہ اور جھوٹ ہے۔ اس سے بدرجہا زیادہ پنڈت صاحب کی حیرانی ہے اور وہ کارساز عالم کی قدرت و صنعت اور اس کے رموز حکمت تک ان کی عقل کیا رسائی کرے۔ آج دنیا میں انسانی مصنوعات کی حیرت انگیزی ان کی عقل کو چکر میں ڈال دے گی۔ ٹیلی فون کے ذریعہ ہزارہا میل کے فاصلہ پر بات چیت کرنا اور سننا اور پہچاننا آواز کا اتنی مسافت بعیدہ تک محفوظ چلا جانا اور وائرلیس تار کے سلسلہ کا بھی نہ ہونا، پنڈت جی کو کس قدر مبہوت کرے گا اور بے چارے کو یہی کہتے بنے گی کہ یہ بچوں کی باتیں ہیں، انگلستان کی بات ہندوستان میں سنائی دے، یہ نری گپ ہے۔ مگر پنڈت جی کے گپ بتانے سے واقعات بے حقیقت نہیں ہوتے، وہ اپنا کام کر رہے ہیں اور دنیا ان سے اپنا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ روزمرہ نئے نئے حیرت انگیز معلومات دنیا پر کھلتے چلے جاتے ہیں، جو دماغ انسانی صنائع تک پہنچنے سے قاصر ہو اور فکر بشری عجائب کاریوں تک رسائی نہ کر سکے، وہ اگر کارخانہ قدرت الٰہی میں معطل ہو تو کیا تعجب ہے۔ اس کی حکمت و قدرت عقول کے اوج پرواز سے بالاتر ہے۔ یہی شان خدائی ہے لیکن ذی علم اور بے علم میں فرق یہ ہے کہ جاہل بے علم اپنی نارسائی بے ادراکی کی معلومات پر نظر نہیں کرتا اور قصور کو جرأت و بے باکی کے ساتھ قدیر مطلق و حکیم برحق کی طرف نسبت کر ڈالتا ہے اور جس کو اللہ نے علم دیا ہے، خرد ور کیا ہے، وہ اپنے محدود علم کو جانتا ہے اور اپنے ضعف ادراک سے واقف ہے، اپنی تقصیر کا اعتراف کر کے اس کی عظمت پر ایمان لاتا ہے۔ پنڈت جی کی طرح ہزارہا جہال حسد کے دقیق اور غامض مسائل پر تمسخر اڑاتے ہیں، ان کی عقل وہاں تک رسائی نہیں کرتی، منکر ہو جاتے ہیں۔ اس سے وہ حقائق غلط نہیں ہو جاتے۔ اسی طرح اگر پنڈت کی سمجھ میں نہ آئے تو یہ اس کے فہم کا قصور و ادراک کا فتور ہے، اس سے قادر حکیم کی قدرت میں بٹہ نہیں لگ سکتا۔

پنڈت امر تکوینی سے خبردار ہی نہیں ہے، خود مخلوق ہے، مخلوقات میں رہا ہے۔ مخلوقیت کے عجز میں مبتلا ہے، اس کی آنکھوں نے خالقیت کے جلوے دیکھنے کی لذت

نہیں اٹھائی سمجھتا ہے کہ امر ہم بھی کرتے ہیں مگر جب کرتے ہیں جب کوئی مخاطب سننے والا موجود ہو اور جب ہی اس امر پر ثمرہ بھی مرتب ہوتا ہے' اگر کوئی سننے والا نہ ہو تو ہمارا امر کرنا بے کار رہے' نہ اس کا کوئی ثمرہ و نتیجہ مگر اتنی عقل اس کے پاس نہیں ہے جس سے وہ یہ غور کرے کہ یہ بات ہے کیوں؟ اسی لیے کہ ہم مخلوق ہیں' عاجز ہیں' شان خالقیت نہیں رکھتے' ہمارے امر میں معدوم کو موجود کرنے کی طاقت نہیں' اس لیے جب تک کوئی سننے والا نہ ہو' ہمارا امر بے کار ہے لیکن جو عالم کو وجود عطا فرمانے والا اور عالم کو ہستی مرحمت فرمانے والا ہے' اس کا امر معدوم کو موجود اور نیست کو ہست نہیں کر سکتا' اس کو کیوں ایشور کہا جاتا ہے؟ کس لیے مستحق عبادت قرار دیا جاتا ہے۔ بے چارگی اور مجبوری میں وہ اور ہم برابر ہیں' نہ ہمارے امر کیے سے کچھ بنتا ہے' نہ اس کے حکم دیئے سے کچھ ہوتا ہے' تو وہ نہ خالق ہے' نہ قادر ہے۔ ہماری طرح ایک وہ بھی ہے۔ ایسے کو ایشور کہتے ہو اور ایسے کی عبادت کرتے ہو تو یہ مخلوق پرستی ہے' عاجز پرستی ہے اور بے کار پرستش ہے۔ مفت کی دردسری اور بے کار محنت ہے۔ ایسے لایعنی وجود کو ایسے نکمے اور غیر مفید وجود کو ایشور بنانا سرد شکتی مان کہنا بالکل جھوٹ اور غلط ہے۔ مسلمان ایسے نکمے مخلوق کو خدا نہیں مانتے۔ ان کا مالک ان کا معبود قادر مطلق ہے کہ موجودات کی ہستیاں اس کے امر کے تابع ہیں' حکم دیا اور بید رنگ جو چاہا ہو گیا' ہستی اس فیاض کے حکم سے تخلف نہیں کر سکتی' اسی کو کہتے ہیں فیاض' اسی کا نام ہے موجد' وہی ہے مبدع۔

اب رہی یہ بات کہ حکم کس کو دیا' اگر امر تکلیفی ہو تو ضرور ہے کہ مامور موجود ہو لیکن پھر بھی وقت امر ہونا ضرور نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ صدہا وصیت نامے لکھے جاتے ہیں' وقف نامے تحریر ہوتے ہیں' نسلوں بعد کے انتظام ان میں کیے جاتے ہیں جو لوگ ابھی تک پیدا نہیں ہوئے ان کو حکم دیئے جاتے ہیں' ان کے لیے پابندیاں مقرر ہوتی ہیں۔ پنڈت جی تو ایسے تمام دستاویزیں ناجائز کر ڈالیں' دستاویزیں ناجائز ہو جائیں تو پنڈت جی کا اس میں زیادہ نقصان نہیں۔ بڑی مشکل کی بات ہے کہ وید اور منوسمرتی میں مخلوق کے لیے بہت سے احکام ہیں۔ دعا کے' عبادت کے' اپاسنا کے' ہوم کے' تو یہ احکام

اگر دنیا پر لازم نہ ہوں تو وید اور منو سمرتی بے کار ہیں اور اگر لازم ہوں تو پنڈت جی بتائیں کہ آج کی مخلوق وید و منو سمرتی کی تصنیف کے وقت کب موجود تھے اور ان کے مصنفوں نے احکام ان لوگوں کو کب سنائے تھے، اگر بقول آپ کے صحت اطلاق امر کے لیے مامور کا موجود ہونا اور سننا ضروری ہے تو وید و منو سمرتی کے جملہ احکام یا لغو اور بے کار ہیں یا زمانہ تصنیف کے لوگوں سے تو متعلق تھے، ان کے بعد کسی سے نہیں۔ دھرم ہی گیا اب کیسی شدھی اور کہاں کی دعوت۔ جب امر تکلیفی میں بھی مامور کا سامنے موجود ہونا، امر کا اسی وقت اپنے کانوں سے سننا ضروری نہیں تو امر تکوین جس کا مقصد ایجاد معدوم ہے، اس کے لیے مامور کا پہلے سے موجود ہونا کس طرح ضروری ہو سکتا ہے لیکن یہ حکیمانہ مسائل پنڈت کے دماغ میں کیسے آ سکتے تھے، یہ عملی باتیں ان تک کہاں پہنچتی تھیں۔

ابھی کانوں میں اس پری کے یہ گفتگو بھی نہیں گئی تھی
ابھی وہ نام خدا ہے غنچہ نسیم چھو بھی نہیں گئی ہے

اس سے زیادہ نادانی پنڈت صاحب کی یہ ہے جو وہ کہتے ہیں کہ کس علت مادی سے بنایا گیا۔ گویا آپ کے نزدیک ہر چیز کے لیے علت مادی ضروری ہے۔ یہ تو حال ہے علم و خرد کا اور اس پر شوق اعتراض، واہ کیا خوب جناب آپ کو اس شکل پر ناز، آئینہ دیکھو اور دل میں پشیمان ہو جاؤ۔

خبر بھی ہے کہ موجودات کتنی قسم کی ہے، موجودات کو اپنے مادیات میں منحصر کر دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ مادیات کے احاطہ سے نظر آگے نہیں بڑھی۔ یہ لیاقت اور علم الہیات میں کلام مادیات کے لیے علت مادی درکار ہے لیکن خود مادہ بھی تو مخلوق ہے، اس کے لیے بھی ایک علت مادی ضروری ہو تو مادہ کا مادہ کی طرف محتاج ہونا لازم آئے اور یہ تسلسل یا دور تک منجر ہو یہ محال تو مادہ کی احتیاج مادہ کی طرف یقیناً محال ہوئی۔

دوسری بات یہ کہ مادہ کو اگر تم نے محتاج الی المادہ مانا تو وہ مادہ نہ ہوا مادی ہو گیا۔ "والمفروض خلافه" تو لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ مادہ کسی مادہ سے نہیں بنایا گیا، ہم صاف ہی کہے دیتے ہیں کہ پنڈت جی اور ان کے ہمنوا بتائیں کہ بسائط عنصریہ کس مادہ

سے بنتے ہیں، جب ان کے لیے کوئی مادہ ثابت نہیں کیا جا سکتا تو ہر شے کے لیے علت مادی کی ضرورت کا دعویٰ باطل و غلط اور بے علمی و جہالت۔

اب رہی یہ بات کہ پنڈت مادے کو قدیم ماننے اور کارساز عالم کے دست قدرت کو اس کی آفرینش تک پہنچنے سے کوتاہ بتائے تو یہ پرلے سرے کی ناخدا شناسی ہو گی اور اس نے جو ایشور کو خالق بتایا ہے، یہ غلط ٹھہرے گا اور جب مادہ خود ہی موجود ہے تو ایشور کا وجود کس دلیل سے ثابت کیا جائے گا اور وہ قدیم مادہ جو اپنے وجود میں جاعل سے غنی ہے، کس طرح دوسرے قدیم یعنی ایشور کا زیر حکم و تابع فرمان ہو سکے گا اور ایشور کو اس پر حکومت و تفوق کیوں حاصل ہو گا۔ یہ عقیدے ہیں جو پنڈت جی اور ان کے ہمنواؤں کے ناخن افکار و افکار سے حل نہیں ہو سکتے اور یہ بے علمی و نادانی ہے کہ خالق عالم کا وجود مانتے ہوئے مادہ کو قدیم کیا جائے۔ اس سے اور بڑھ کر معترض کی جہالت یہ ہے کہ اس نے کہا ہے کہ معلول بے علت نہیں ہو سکتا ہے یہ نابینائی۔ آیت میں تو صاف بتایا گیا ہے کہ موجودات کا وجود امر الٰہی سے ہوتا ہے تو امر الٰہی کا علت ہونا ظاہر تھا، پھر کس طرح یہ لکھ دیا، کوئی معلول بے علت نہیں ہوتا۔ یہ بتایا کس نے ہے کہ معلول بغیر علت ہے۔ امر الٰہی خود علت ہے، مفید وجود ہے۔ لہٰذا معترض کا قول اور اس کے کلام کا ہر جز سراسر جہل بطالت ہے۔ اسی اعتراض کے تتمہ میں پنڈت نے یہ الفاظ لکھے:

"خدا اپنے اور جیو بیروں کے وصف عمل فطرت کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا جیسے دنیا میں کسی چیز کے بننے بنانے میں تین اشیاء پہلے ضرور ہوتی ہیں: ایک فاعل جیسے کمہار، دوسرے بننے والا مثلاً گھڑا مٹی، اور تیسرا اس کا ذریعہ جس سے گھڑا بنایا جاتا ہے۔ جس طرح کمہار مٹی اور آلہ کے ذریعہ گھڑا بناتا ہے اور بننے والے گھڑے کے پہلے کمہار مٹی اور آلات موجود ہوتے ہیں، دنیا کے بننے سے پہلے جہان کی علت مادی یعنی پرکرتی تھی اور ان سب کے اوصاف افعال و فطرت ازلی ہیں، اس لیے یہ قرآن کی بات بالکل ناممکن ہے۔"

جواب: پنڈت جی نے ایشور کو کمہار پر قیاس کرنے میں اپنی قدردانی کا نمونہ دکھلایا کہ جس طرح ایک کمہار حقیقتاً کسی چیز کا خالق نہیں، مجبور ہے وہ بغیر مٹی اور آلات

کے گھڑا نہیں بنا سکتا، یہی ایشور کی مجبوری کا حال ہے کہ جب تک مادہ نہ ہو اور مادہ میں عمل کرنے کے آلات نہ ہوں، اس وقت تک بے چارا ایشور کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ عاجز ہے، مجبور ہے۔ یہ تو ایشور کی شان خدائی ہے اب اس کی خواہ کتنی بھی مدح سرائی فرمائے مگر پنڈت جی یہ لکھنا بھول گئے کہ عالم کے بنانے میں جن آلات کی احتیاج پڑتی ہے اور آفرینش سے پہلے ان آلات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ وہ آلات کیا ہیں اور آلات بھی قدیم ہیں یا حادث۔ حادث تو کہہ نہیں سکتے کیونکہ مخلوقات کے وجود سے پہلے ان کا وجود موقوف علیہ کے طور پر تسلیم کیا ہے اگر انہیں حادث کہیں تو وہ خود داخل مخلوقات ہو جائیں گے، لہٰذا ضرور پنڈت جی کو قدیم ہی ماننا پڑے گا تو اب پنڈت جی بتائیں کہ وہ آلات کیا ہیں؟ روح بھی ان آلات میں داخل نہیں ہو سکتی کیونکہ مادہ کی طرح اس نے بھی ایشور کے عمل کو قبول کیا ہے اور وہ اس کے مقید کرنے سے جسم کی پابند ہوئی ہے تو روح اور مادہ دونوں میں عمل کرنے کے لیے جن آلات سے ایشور نے کام لیا ہے اور جن کا موجود ہونا اس کی خالقیت کے لیے پنڈت جی کے خیال میں ضروری ہے۔ وہ آلات کیا ہیں؟ ابھی تک آریوں نے رُوح، مادہ، ایشور تین ہی قدیم تسلیم کیے ہیں، یہ چوتھا قدیم آلات کہاں سے نکل آیا؟

پنڈت جی تو چلے گئے اب ان کے ماننے والے آریہ ہی بتائیں کہ وہ آلات کیا ہیں، جن کا ایشور محتاج ہے۔ پنڈت جی نے جہاں تک دنیا دیکھی اور موٹے موٹے کام ان کی نظر سے گزرے، ان میں انہوں نے اکثر یہی دیکھا کہ کاریگر آلوں اور اوزاروں سے کام لیتے ہیں۔ اسے دیکھ کر ان کے خیال میں یہی آیا کہ ایشور بھی بہت سے بہت اتنا ہی کر سکتا ہے کہ اوزاروں سے جہاں بنا دے اور پھر یہ بھی نہیں کہ اس کی مشیت کو کچھ اس میں داخل ہو جو چاہے کر سکے، بلکہ اس کی مجبوری اور بے بسی کا یہ عالم ہے کہ کسی چیز کے وصف اور فعل تک کو نہیں بدل سکتا۔ پنڈت صاحب نے اپنے اسی قول میں مادہ (پرکرتی) اور اس کے اوصاف و افعال سب کو ازلی بتایا ہے لیکن حیرت ہے کہ باوجود اس اعتقاد کے کہ وہ کس طرح ایشور کے وجود اور اس کی ہستی کے قائل ہیں اور اس کی اپاسنا و عبادت کیوں لازم بتاتے ہیں۔ جب مادہ اور عالم کا ذرہ ذرہ اور اس کے تمام

اوصاف و افعال قدیم و ازلی ہیں تو عالم بتمامہ قدیم ہوا۔ اب حادث کونسی چیز رہی جس کے لیے محدث اور پیدا کرنے والے کی ضرورت ہوتی یا وہ خود ہی اپنے اوصاف و افعال کے مطابق رنگا رنگ صورتیں اختیار کیا کرتا ہے تو ایشور صاحب کون ہیں' کیا کرتے ہیں؟ ان کا اس پر کیا قابو؟ پھر ان کا وجود ثابت کرنے کے لیے کونسی دلیل ہے؟ اس اعتقاد نے سرے سے ایشور کی ہستی ہی کو مٹا ڈالا' پھر مذہب کی تمام بنیادیں پیوند خاک ہو گئیں' عبادت کس کی اور الہام کیسا؟ جب ایشور ہی نہیں تو یہ تمام منصوبے ہیچ ہیں۔

اعتراض: پنڈت نے آیہ کریمہ وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى کا بالکل غلط ترجمہ لکھ کر یہ اعتراض کیا۔ کیا کعبہ سے پہلے مقدس جگہ خدا نے کوئی بھی نہیں بنائی تھی؟ اگر بنائی تو کعبہ کے بنانے کی کچھ بھی ضرورت نہ تھی' اگر نہیں بنائی تو بے چارے پہلے پیدا ہوئے لوگوں کو مقدس جگہ سے محروم ہی رکھا تھا؟ پہلے خدا کو مقدس جگہ بنانے کی یاد نہ رہی ہوگی۔

جواب: اہلِ عقل اور سمجھدار آریے غور کریں' یہ اعتراض ہی کیا ہوا۔ اس آیت میں یہ کہا ہے کہ کعبہ معظمہ کو پہلے ہی مقدس نہ بنایا تھا پھر اعتراض کس چیز پر؟ محض اپنے تخیل پر آپ معترض ہیں تو یہ کمال نادانی ہے اور فرض کرو یہ ہوتا بھی کہ کعبہ معظمہ کو آفرینش سموات والارض کے بعد مقدس بنایا تو یہ بات کیا قابلِ اعتراض تھی۔ کیا کارخانہ صنع الٰہی میں تدریج نہیں ہے۔ اتنا تو دنیا کا ہر فرد بشر جانتا ہے کہ اس عالم کا نظام تدریج پر ہے۔ پرندوں کے بچے گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں' وقت پیدائش نہ ان کے پَر ہوتے ہیں نہ بال۔ ایک عرصہ کے بعد پَر و بال پیدا ہوتے ہیں تو پنڈت جی تو اپنے بھولے پن سے یہی کہیں گے کہ پہلے ایشور کو پَر لگانے کی یاد نہ رہی ہوگی۔ مگر خدا شناس اور اصحابِ عقل ایسے بیہودہ کلمہ کو سننا گوارا نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر کام حسبِ اقتضاء حکمت و مصلحت کسی وقت کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔ پنڈت جی یہی بتادیں کہ وہ اس زمانہ میں کیوں پیدا ہوئے' پہلے جگ میں کیوں نہیں ہوئے' کیا اس وقت ایشور کو بقول ان کے ان کے بنانے اور پیدا کرنے کی یاد نہیں رہی تھی۔

اس موقع پر ایک واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ عرصہ ہوا کہ بریلی میں آریہ اس فقیر سے مناظرہ کرنے آئے تھے۔ ان کے پنڈت نے یہ اعتراض کیا کہ توریت، انجیل، زبور اور قرآن شریف یہ چار کتابیں مختلف زبانوں میں کیوں نازل ہوئیں؟ ایک ہی مرتبہ ایک مکمل کتاب کیوں نازل نہ کر دی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کتاب نازل کرنے کے وقت (معاذ اللہ) خدا سے بھول ہوئی، جب یاد آیا کہ فلاں فلاں بات رہ گئی تو دوسری کتاب نازل کی، اس میں بھی بھول سے بہت باتیں رہ گئیں، یاد آنے پر تیسری اور اسی طرح سب کے آخر میں چوتھی کتاب نازل کی۔ اگر وہ سب باتیں پہلے ہوتیں تو ایک ہی مرتبہ مکمل کتاب نازل کر دیتا۔

پنڈت صاحب نے بڑے تفاخر سے اچھل اچھل کر اس اعتراض کو پیش کیا اور انہیں یقین تھا کہ اس میں ان کا مقابل لاجواب ہو جائے گا اور میدان ان کے ہاتھ رہے گا۔

فقیر نے کہا کہ پنڈت صاحب یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ حکیم کے افعال حسب اقتضاء حکمت و مصلحت ہوتے ہیں، جس وقت جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اسی کو وہ بہم کرتا ہے۔ ایک حاذق طبیب ایک وقت مریض کے لیے منضج کا نسخہ لکھتا ہے، پھر وہی اس نسخہ کو موقوف کر کے مسہل کا نسخہ دیتا ہے۔ اس کے بعد اس کو بھی موقوف کرتا ہے تبریدیں پلاتا ہے، پھر انہیں موقوف کر کے مصفیات دیتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ منضج کا نسخہ لکھتے وقت اس کو مسہل یاد نہ تھا اور مسہل تجویز کرتے وقت تبرید کا اس کو علم نہ تھا اور تبرید دیتے وقت وہ نہ جانتا تھا کہ آخر کار مصفیات دینے ہوں گے، بلکہ یہ سب کچھ حسب اقتضاء حکمت ہے، وہ حکمت اگر آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو آپ کے علم و عقل کا قصور ہے، حکیم پر اعتراض بے جا ہے۔

یہ مضمون میں نے تفصیل و توضیح کے ساتھ بیان کیا اور بحمد اللہ جلسہ کے دلنشین اور خاطر گزیں ہو گیا۔ مجمع سے آفرین آفرین اور مرحبا مرحبا کی صدائیں آنے لگیں، مگر پنڈت صاحب بہت برہم ہوئے، بہت بگڑے، بڑے جوش میں کھڑے ہوئے تیوری میں بل ڈال کر کہنے لگے: ہم جانتے تھے کہ آپ کے پاس اس اعتراض کا کچھ جواب نہیں ہے

اور آپ یہی کہیں گے کہ دین کی بات میں عقل کا کچھ دخل نہیں، اپنی حکمت کو خدا ہی جانے مگر یہ کہہ دینے سے میرا اعتراض نہیں اٹھا، آپ اعتراض کا جواب دیجئے۔ اس کے ساتھ پنڈت جی نے تعلّی وغیرہ کے بہت کلمات کہے۔ میں نے کہا: پنڈت جی بات تو میں نے بہت معقول کہی اور مجمع کے دل نشین بھی ہو گئی، میری تقریر پر آپ کوئی جرح بھی نہیں کر سکتے اور اس کا کوئی لفظ آپ سے غلط ثابت نہ ہو سکا، اس پر اتنا غصہ ہے، ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیجئے، آپ کے اعتراض کا جواب شافی پیش کر دیا گیا ہے۔

اس متانت کی گفتگو نے پنڈت صاحب کو بہت زیادہ گرم کر دیا اور انہوں نے بہت سخت لب و لہجہ میں پھر اپنے اعتراض کو پیش کر کے جواب طلب کیا۔ میں نے کہا کہ پنڈت صاحب جواب شافی تو میں دے چکا اور مجمع سمجھ گیا۔ مگر آپ کہتے ہیں کہ جواب ہی نہیں ہوا تو اب میں آپ کی فہم کے لائق جواب عرض کرتا ہوں۔ قرآن پاک کو تو آپ مانتے ہی نہیں، مگر یہ تو آپ کو تسلیم ہے کہ آپ کو تو آپ کے ایشور ہی نے پیدا کیا ہے۔ اس وقت تو آپ کا قد پانچ چھ فٹ لمبا ہے، منہ پر مونچھیں تاؤ کھا رہی ہیں، دانت داڑھیں موجود ہیں لیکن جب آپ پیدا ہوئے تھے اس وقت نہ آپ کے منہ میں دانت تھے، نہ داڑھیں، نہ یہ لمبی لمبی مونچھیں، نہ اتنا بڑا قد و قامت، تو کیا آپ کے اعتقاد میں اس وقت ایشور ان سب چیزوں کو بھول گیا تھا۔ آپ کی تو صرف زبان ہلتی ہے، آپ آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ ایشور سے بھول ہو گئی تھی، لیکن اگر کہیں پنڈت پیدائش کے وقت جناب کا یہ قد و قامت ہوتا تو والدہ صاحبہ کی شامت تھی۔ یہ جواب سن کر آریہ تو چل دیئے اور پنڈت جی اکیلے رہ گئے، نہ ان سے اٹھا گیا نہ زبان سے ایک لفظ نکل سکا اور مجمع میں تحسین و آفرین کا شور مچ گیا۔ اس پنڈت کی یہ گفتگوئے نادانی بھی انہی استاد کی تعلیم کا نتیجہ تھی جس پر اس کو انتہا درجہ کی شرمندگی اٹھانا پڑی۔

○ ○ ○

آیہ "ومن یرغب عن ملۃ ابراھیم" کا غلط ترجمہ لکھ کر پنڈت نے یہ

اعتراض کیا ہے:

اعتراض: یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو ابراہیم کے دین کو نہیں مانتے وہ سب جاہل ہیں؟ ابراہیم کو ہی خدا نے پسند کیا اس کا کیا سبب ہے؟ اگر دیندار ہونے کے سبب کیا تو دیندار اور بھی بہت سے ہو سکتے ہیں اگر بلا دین دار ہونے پسند کیا تو بے انصافی ہو۔ ہاں! یہ تو ٹھیک ہے کہ جو دھرماتما ہے، وہی خدا کو عزیز ہوتا ہے، اودھرمی نہیں۔

جواب: پنڈت جی کی فہم پر افسوس اتنا بھی نہ سمجھے کہ کسی نائب السلطنت یا سفیر حکومت کی مخالفت اس سلطان کی مخالفت ہوتی جس نے اسے یہ منصب دیا ہے۔ جب ابراہیم علیہ السلام فرستادۂ خدا اور اس کے رسول تھے اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے انھیں ملت حقہ کی دعوت و تبلیغ کے لیے بھیجا تھا تو جو کوئی ان کے دین سے پھرے گا وہ دین الٰہی سے منحرف ہوا، کس عاقل کے نزدیک ایسا شخص مستحق عتاب و عقاب نہ ہوگا۔ پنڈت جی کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آتی اور ان کا یہ کہنا کہ "دین دار اور بھی بہت ہو سکتے ہیں۔ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اور انبیاء علیہم السلام کو بھی مرسل کیا او روہ بھی دین لائے تو ان سب کی بھی اطاعت واجب ہے اور ان میں سے ہر ایک نبی سے انحراف کرنے والا متمرد باغی مستحق سزا ہے اور اگر پنڈت جی کی یہ مراد ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے طریقوں کے سوا اور لوگ بھی دین دار ہیں تو انھیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے پاس دین الٰہی نہیں، باطل ہے جیسے بت پرستوں کا دین، آتش پرستوں کا دین، کواکب پرستوں کا دین، مادہ پرستوں کا دین، آریوں کا دین۔ یہ دین جو دین الٰہی نہیں ہیں، ان کا اختیار کرنے والا اور دین الٰہی کو چھوڑنے والا تو مستحق سزا ہے۔ پہلے آپ نے اپنے دین کو دین الٰہی تو ثابت کیا ہوتا تب اسے دینوں میں شمار کرتے مگر آپ دین الٰہی کیا ثابت کریں گے، آپ کے اعتقادات تو ایشور کا وجود ہی ثابت نہیں ہونے دیتے۔ مادہ اور اس کے اوصاف و افعال کی قدامت چاہتی ہے کہ عالم خود بخود ہو، جب پنڈت جی کو یہ تسلیم تو وہ خدا کے وجود کا کس منہ سے دعویٰ کر سکتے ہیں اور خدا ہی نہ ہو تو خدائی دین کہاں سے آئے گا۔ پنڈت جی کا یہ کہنا کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو حضرت ابراہیم کو نہیں مانتے وہ سب جاہل ہیں، عاقل کے کہنے کی بات نہیں اتنا تو ہر شخص جانتا

ہے کہ سچے دین کا نہ ماننے والا ضرور جاہل و گمراہ ہے اور اس سے بڑھ کر انسان کی سیہ دلی و سیہ بختی کیا ہو گی کہ دین حق سے منحرف ہو جائے۔

کیا پنڈت صاحب کے اعتقاد میں جو لوگ ان کے دین کے مخالف ہیں، وہ نادان اور غلط کار نہیں۔ عالم دین دار خدا شناس ہو سکتے ہیں اگر کہئے کہ نہیں جب تو پنڈت صاحب کا اعتراض خود ان کے سر پر سوار ہو گیا اور اگر کہیں کہ ہاں ویدک دھرم کے نہ ماننے والا بھی عالم دین دار خدا شناس ہو سکتے ہیں تو پھر انسان کے لیے اس دھرم کا ماننا ضروری نہ رہا، کیونکہ بغیر اس کے بھی علم و خدا شناسی اور دین داری حاصل ہو جاتی ہے تو اس دین کی پابندیاں برداشت کرنے اور بے فائدہ تکلیف اٹھانے کی کیا حاجت۔ پنڈت جی کا یہ نکتہ آریوں کی سمجھ میں آ جائے تو وہ دھرم کی قیدوں سے آزاد ہو کر آنند کریں یا اگر خدا عقل دے تو غور کریں کہ مت تو خدا شناسی کے لیے ضرور نہیں۔ اب وہ کونسا دین ہے جو خدا شناسی کے لیے اپنے اصول کی پابندی ضروری بتاتا ہے اور اگر اس کی پابندی نہ کی جائے تو عذاب دائم اور معیبت ابدی میں گرفتار ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ اس کو قبول کر لیں تاکہ اس کے بموجب بھی نجات پا سکیں اور پنڈت جی کے طور پر تو ان کے دین کا قبول کرنا نجات کے لیے ضروری ہی نہیں ہے۔

○ ○ ○

پنڈت نے یہ آیہ "قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا" الآیہ، نقل کر کے اس کا غلط ترجمہ لکھ کر مسلمانوں پر بت پرستی کا الزام لگایا ہے۔ آیت شریفہ میں کعبہ معظمہ کے قبلہ بنانے اور نماز میں اس کی طرف منہ کرنے کا بیان ہے اس کو پنڈت صاحب نے شرکت و بت پرستی بتایا اور نہایت خلاف تہذیب کلمات سے اس پر اعتراض کیا۔ پنڈت کے چند کلمے نقل کیے جاتے ہیں:

اعتراض: محمد صاحب نے چھوٹے بت کو مسلمانوں کے مذہب سے نکالا لیکن بڑا بت جو پہاڑ کی مانند مکہ کی مسجد ہے، وہ تمام مسلمانوں کے مذہب میں داخل کر دیا، کیا

یہ چھوٹی بُت پرستی ہے ہاں جیسے ہم لوگ (ویدک) وید کے ماننے اور اس پر عمل کرنے والے ہیں، ویسے تم لوگ بھی ویدک ہو جاؤ، تو بُت پرستی وغیرہ بُرائیوں سے بچ سکو گے ورنہ نہیں۔

جواب: اتنا بڑا طوفان و بہتان ہے، جس آدمی کو جھوٹ بولنے میں شرم نہ ہو، وہ جو چاہے کہے اس کی بندش ہی کیا ہو سکتی ہے۔ کعبہ معظمہ کو پنڈت نے خود مسجد جتایا اور خود ہی بڑا بت بتایا۔ اب کوئی پوچھے کہ مسجد عبادت خانہ کو کہتے ہیں۔ دنیا میں عبادت خانہ کو بُت کس نے بتایا؟ آپ کو ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ بے شعور مخلوقات میں سے جس کو پوجا جائے جس کی پرستش و عبادت کی جائے وہ بت ہوتا ہے نہ کہ پوجا کی جگہ یا پرستش و عبادت کا مقام۔ یہ انوکھی ہی بات ہے کہ مقام عبادت کو بُت اور معبود سمجھ لیا جائے، جس کی سمجھ کا یہ حال ہو اس کا معترض ہونا جائے تعجب و مقام حیرت نہیں۔

یہی حال ہے تو پنڈت جی ہر چیز کے مکان پر اسی کا حکم جاری کر دیا کریں گے، مہمان خانہ کو مہمان اور مسافر خانہ کو مسافر اور بیمار خانہ کو بیمار اور قمار خانہ کو قمار اور شراب خانہ کو شراب سمجھ لیں گے۔ اس سمجھ کی آریے بھی تعریف کریں گے، مسجد جائے سجود ہے نہ کہ معبود۔ پارسیوں کے آتش خانے اور ہندوؤں کے بت خانے کو کوئی بت نہیں کہتا۔ پھر پنڈت کی عقل کو کیا ہو گیا کہ اس نے مسجد کو معاذ اللہ بت بتا دیا۔ تعصب کی کچھ انتہا ہے۔ پنڈت کا یہ الزام کسی دوسرے پر اس قدر قبیح نہ ہوتا جتنا مسلمانوں پر بے جا ہے کیونکہ ہر مسلمان نماز کی نیت میں یہ کلمے کہتا ہے تب نماز شروع کرتا ہے: نویت ان اصلّی (رکعتی صلوۃ الفجر) للہ تعالی متوجھا الی الکعبۃ الشریفۃ۔ میں نیت کرتا ہوں کہ کعبہ کی طرف منہ کر کے خاص اللہ تعالی کے لیے دو رکعتیں نماز فجر پڑھوں، اس نیت میں جس وقت کی نماز ہوتی ہے۔ اسی کا نام لیتا ہے مگر باقی تمام کلمے ہر نماز میں یکساں رہتے ہیں اور نماز شروع کرنے سے قبل وہ یہ کہہ لیتا ہے کہ میری نماز خاص اللہ کے لیے ہے تو دوسرے کسی کو وہم بھی نہیں آسکتا۔ مسلمانوں کی عبادت میں توحید کی یہ مزیدار چاشنی ہے جو خدا پرست کو مست بنا دیتی، ان پر مفتری کا اتہام بت پرستی کب چسپاں ہو سکتا ہے۔ غیر کی پرستش کا تو اسلام نے شائبہ

بھی نہ چھوڑا۔ نماز کے اندر آنے سے پہلے ہی عابد نے تصریح کر دی کہ اس کی عبادت خالص اللہ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ کے لیے۔ اس کے بعد اللہ اکبر کہہ کر خدائے تعالیٰ کی کبریائی کے اعتراف و اقرار کے ساتھ وہ نماز میں داخل ہوتا ہے اور آغاز عبادت اپنے معبود برحق جل شانہ کی ثناء سے کرتا ہے اور کہتا ہے: سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کے بعد وہ توحید کا اعلان کرتا اور شرک کی گردن قطع کر دیتا ہے کہ لا الٰہ غیرک، کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، جس کی عبادت کی ابتداء میں یہ اعلان ہو اس کو بت پرست اور مشرک کہنا کیسا کذب، کیسا فریب، کتنا بڑا بہتان و افتراء ہے۔ جس طرح نماز میں وقت کا نام لینے کو کوئی وقت پرستی نہیں کہہ سکتا، اسی طرح کعبہ معظمہ کا نام لینے کو کعبہ پرستی نہیں کہا جا سکتا۔

پنڈت سے کہو کہ اپنے گریبان میں تو منہ ڈال، سندھیا کرنے والے کو ستیارتھ پرکاش ص ۴۴ میں ہدایت کی ہے:

"جنگل یا تنہا جگہ میں جا کر قائم مزاجی سے پانی کے نزدیک بیٹھ کر نت کرم کرنے کے بعد ساوتری کو پڑھے۔"

اب آریہ بتائیں پنڈت کے اصول پر یہ آب پرستی اور پانی کی پوجا ہوئی یا نہیں اور اگنی ہوتر میں جو آریوں کی عبادت ہے جس کا طریقہ پنڈت جی نے ستیارتھ ص ۴۵ میں لکھا ہے:

"اس میں ویدی کھودی جاتی ہے، آگ جلائی جاتی ہے، صندل وغیرہ کی عمدہ لکڑیاں پھونکی جاتی ہیں، آگ میں گھی ڈالا جاتا ہے۔"

یہ آتش پرستی ہوئی یا نہیں۔ پنڈت جی کو اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہ آیا۔

○ ○ ○

پنڈت نے آیہ کریمہ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ پر یہ

اعتراض کیا ہے:

بھلا خدا کی راہ میں مرنے مارنے کی کیا ضرورت ہے، یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ بات اپنے مطلب پورا کرنے کے لیے ہے، یعنی یہ لالچ دیں گے تو خوب لڑیں گے، اپنی فتح ہوگی، مارنے سے نہ ڈریں گے۔ لوٹ مار کرنے سے عیش و عشرت حاصل ہوگی۔ بعدازاں خوب گلچھرے اڑائیں گے، اپنی مطلب براری کے لیے اس قسم کی الٹی باتیں گھڑی ہیں۔

جواب: مرنے مارنے کی جگہ تو خدا ہی کی راہ ہے اور مرنا مارنا تو وہی کام کا ہے جو راہ خدا میں ہو، جو مرنا مارنا خدا کی راہ میں نہ ہو وہ فساد ہے، بدمعاشی ہے، جرم و گناہ ہے، ظلم و عدوان ہے۔ ہندوستان میں ہندو خونخوار جنگ کرتے رہے، اچھوت اقوام کے لیے ان کے تیرو تلوار ہمیشہ تشنہ خون رہے، ہندوستان کے قدیم باشندوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ منوسمرتی میں ان کے لیے وہ احکام لگائے، ایسی سختیاں کیں جو انسان کسی جانور کے لیے بھی گوارا نہیں کرتا۔ پنڈت صاحب نے اس پر کوئی حکم نہ دیا، خانہ جنگی کی ان کا مذہب تعلیم دیتا ہے، ان کے دین کے لوگ اس پر عامل رہے اور اب بھی وہی ستم گاری ان کی طبیعت میں ہے۔ ہندوستان کی سرزمین بے گناہوں کے خون سے رنگ ڈالی مگر پنڈت صاحب نے اس کی نسبت ایک لفظ نہ کہا، نہ ان کتابوں کو اپنے دین سے خارج کیا جن میں یہ تعلیم دی گئی ہے۔

راہ خدا میں جان دینا تو بڑے بلند حوصلہ، عالی ہمت، خدا پرستوں کا کام ہے، حق و صداقت کے شیدائی راہ حق پر قائم رہتے ہیں۔ دنیا کی قومیں اور ظالمانہ طاقتیں ان پر بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑتی ہیں اور سالکانِ راہ حق کو جادۂ صدق و صفا سے ہٹانے کے لیے جور و جفا کے پہاڑ ان پر ڈھائے جاتے ہیں۔ امتحان گاہ صداقت میں یہ ان کی آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ راست باز خدا پرست بلاؤں کی ان بھیانک گھٹاؤں کی کچھ پرواہ نہیں کرتے، گردنیں کٹوا لیتے ہیں مگر راہ خدا سے قدم نہیں ہٹاتے، صادق العہد ایمانداروں کو تیغ و سنان اور لشکر و فوج وفائے عہد سے منحرف نہیں کر سکتے۔ لذت طاعت و عبادت کے متوالے یادِ خدا میں مست رہتے ہیں، خواہ کوئی ان کے خون بہانے

سر کانے، دولتِ و مال چھینے یا گھر لوٹے مگر ان کے استقلال و استقامت میں فرق نہیں آتا۔ مئے توحید کے مستانے سر دے کر سودائے محبت خرید تے ہیں۔

ع طعمہ ہر مرغکے انجیر نیست

اہلِ باطل میں یہ حوصلہ کہاں؟ دنیا پرستوں کو اس جذبہ کی کیا خبر۔

سر مدغم عشق بو الہوس را ندہند

سوز دل پروانہ مگس را ندہند

دنیا کو اس صدق و راستی نے حیرت میں ڈال دیا، اس وارفتگی و صداقت نے متحیر کر دیا۔ بیر معونہ کے واقعہ میں کفار نے ستر حافظ قرآن صحابہ کرام کو دھوکہ سے لے جا کر شہید کر دیا۔ ان حضرات نے دشمنانِ دین کا خون نہ کیا تھا، مال نہ لیا تھا اور کسی طرح کی عداوت نہ تھی، بجز اس کے کہ وہ دل و زبان سے لا الہ اللہ محمد رسول اللہ کے معتقد و قائل تھے۔ ان سے بھی کہا جاتا تھا کہ تم یہ کہنا چھوڑ دو، پھر جو چاہو تمہارے لیے حاضر ہے، مال و دولت بھی، خوبصورت و حسین لڑکیاں بھی، اگر اس سے باز نہ آئے تو تمہیں سولی دے کر یا تیل میں جلا کر سختی کے ساتھ ہلاک کر دیا جائے گا۔ مگر ان صادق العہد وفا شعاروں نے دولت دنیا کو ٹھکرا دیا اور سولی کی پرواہ نہ کی۔ کلمہ شریف پڑھتے پڑھتے جانیں دے دیں اور حق یہ ہے کہ صدق و حقانیت کے جلوے دیکھنے والے ہی فداکاری کر سکتے ہیں، جنہیں اپنے دین میں حقانیت کی دلکش روشنی نظر نہ آئی ہو، وہ بے چارے فداکاری کی لذت سے کیا خبردار ہوں گے۔ جو دین خود اس دین والوں کی نظر میں اس قابل نہ ہو کہ اس پر جان نثاری کی جائے، اس کا بطلان اور کسی دلیل کا محتاج نہیں۔

رہا مسلمانوں پر مارنے کا الزام جس کا بڑا غوغا ہے اور بے جا طور پر مسلمانوں کو متہم اور بدنام کیا جاتا ہے۔ پہلے اس کی حقیقت سامنے لایئے، واقعات کی تحقیق کیجئے، اس کے بعد حکم لگایئے۔ یہ تو بڑی جہالت ہے کہ واقعات کو تو نہ دیکھا جائے اور محض توہم یا عناد سے کسی کو موردِ الزام بنایا جائے۔

حضور پُر نور سید انبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دنیا کو اسلام کی دعوت دی اور دینِ الٰہی کو قبول کرنے کی ہدایت فرمائی اور کتاب الٰہی قرآن کریم کو پیش

فرمایا۔ اس قرآن پاک کے ماننے پر کسی کو شمشیر سے مجبور نہ کیا' نہ جبر سے کام لیا بلکہ قرآن پاک کے کتاب الٰہی ہونے کا ایسی زبردست دلیل سے ثبوت دیا جس نے تمام دنیا کو ساکت کر دیا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ عرب میں ہوئی' نشوونما عرب میں پائی' عربوں کی گودوں میں پل رہے' عربوں میں جوان ہوئے' عربوں کی زبان میں کلام فرمایا' کسی دوسرے ملک میں تعلیم حاصل کرنے تشریف نہ لے گئے' بلکہ اپنے ملک میں بھی کسی کے سامنے شاگرد بن کر نہ بیٹھے' کسی سے ایک حرف نہ سیکھا باوجود اس کے آپ جو کتاب لائے وہ عربی میں تھی۔ زمانہ ایسا تھا کہ عربی علم و ادب انتہائی عروج پر تھا' فصحاء بلغاء سے ملک بھرا ہوا تھا' فصاحت و بلاغت و زبان دانی کا شہرہ تھا' نظم و نثر کی اعلیٰ ترین دست گاہ رکھنے والوں سے ملک بھرا ہوا تھا' زبان کے ماہر غرور یکتائی کے نشہ میں چور تھے' اسی حالت میں حضور سید انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جو کتاب لائے' اس کے ساتھ یہ اعلان تھا کہ یہ کتاب فصاحت و بلاغت میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ کسی صاحب کمال کی مجال نہیں کہ وہ اس کا مثل بنا کر پیش کر سکے' تمام مخلوق جن و انس کو اعلان دے دیا گیا کہ یہ کتاب الٰہی ہے' اس لیے کسی مخلوق کی قدرت میں نہیں کہ اس کا مثل بنا سکے۔ قل لئن اجتمعت الجن والانس علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔

جب تمام جن و انس اور کل کائنات قرآن پاک کا مثل پیش کرنے سے عاجز رہی اور مقدرت مخلوق سے اس کتاب پاک کا مثل بنانا ناممکن ہوا' تب اس کے کمال و بے مثالی کے اظہار کے لیے اور ترقی کی اور فرمایا کہ اگر تم سب مل کر ایک دوسرے کے مددگار ہو کر بھی قرآن پاک کا مثل بنانے سے عاجز رہے تو اتنا ہی کرو کہ فقط دس سورتیں اس کی مثل بنا لاؤ۔ یہ تو اس کا چھوٹا سا حصہ ہے۔ فاتوا بعشر سور مثلہ۔ جب وہ دس سورتیں بھی نہ بنا سکے تو اور تخفیف فرمائی اور ان کے کمال عجز کے اظہار کے لیے فرمایا: فلیاتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صدقین۔ کہ ایک بات ہے اس کی مثل بنا لاؤ۔ ایک چھوٹی سی سورت کے برابر ہی کوئی عبارت لکھ لاؤ۔ زبان کے ماہر ہو' فصاحت و بلاغت میں شہرہ آفاق ہو' اگر قرآن پاک کے کتاب الٰہی ہونے میں تردد رکھتے

ہو تو اس کی مثل بنالاؤ۔ یہ بھی نہ کر سکو تو صرف دس سورتوں کی مثل بنالاؤ، یہ بھی امکان میں نہ ہو تو صرف کسی ایک سورۃ کی مثل بنالاؤ، مگر عرب کے تمام فخر روزگار، ماہر زبان اور آسمانِ فصاحت کے نیرِ اعظم اتنا بھی نہ کر سکے، عاجز رہے، ان کو قرآن پاک کی اس تحدی نے مجبور و لاچار کر لیا، شرم سے سر نہ اٹھا سکے اور یقین کامل ہو گیا کہ اس کتاب کی مثل بنانا ہمارے امکان میں نہیں ہے، تو انہوں نے بجائے علمی مقابلہ کے مقاتلہ شروع کر دیا اور ہنگامہ کارزار گرم کر ڈالا چنانچہ ان کے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کو میدان میں آنا پڑا۔ مسلمانوں کی حالت پر نظر کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ ابتدائی عہد میں جبکہ ان کی تعداد محدود اور جماعت مختصر تھی۔ دس کہیں رہتے تھے، بیس کہیں اور سب طاقتور، دولت مند، جتھے دار، جنگجو کفار کے انبوہ میں گھرے ہوئے تھے۔ وہ لوگ اپنے زور و زر کے غرور میں رات دن ان پر ظلم کرتے تھے، ان کے پاس نہ رہنے کے لیے محفوظ مکان تھے نہ گزر اوقات کے لیے کافی اسباب معاش، کیونکہ مسلمان ہونے والوں کو اسلام لا کر اپنی تمام دولتوں سے دستبردار ہونا پڑتا تھا، وہ صرف اپنی جان لے کر سید عالم کے حضور حاضر ہوتے۔ زن و فرزند اور عزیز و اقارب تک ان کے دشمن جان ہو جاتے تھے۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس بھی کوئی دنیوی خزانہ ظاہر میں موجود نہ تھا، اگرچہ درحقیقت وہ تمام عالم کے مالک ہیں لیکن کفار جس چیز کو دولت یا خزانہ سمجھتے ہیں اس کا یہاں پتا نہ تھا۔

دولت سرائے اقدس میں کئی کئی روز مطبخ سرد رہتا اور دھواں تک نہ اٹھتا۔ پیہم فاقوں سے ہادی عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شکم مبارک پر پتھر باندھنا پڑے تو اسلام قبول کرنے والوں کے لیے یہاں بھی آسائش زندگانی کے لیے سامان موجود نہ تھے۔ نہایت بے بسی اور بے کسی کا عالم تھا، ضروری لباس تک بھی ان کے پاس نہ تھا۔ اس حالت میں کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں ہوس ملک گیری پیدا ہو سکتی تھی اور وہ معدود افراد باوجود ان مصائب تمام اور بے سامانی کے زبردست طاقتور ملک سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے، جن کی تعداد بدرجہا زیادہ، ہر قسم کا سامان ان کے پاس موجود، نبرد آزما دیو پیکروں کے مسلح لشکر ہر وقت تیار، اور جوش عداوت زور پر۔ اگر اس قسم کی حالت دنیا

کی کسی اور جماعت کو پیش آتی تو وہ ہرگز اپنے آئین و دین پر قائم نہ رہ سکتی اور ضرور اس کو ملک کی ایسی زبردست اکثریت کے سامنے گردن جھکانا پڑتی اور اپنا دین چھوڑ کر دشمن کی اطاعت کے سوا چارہ نہ ہوتا۔ لیکن ان حالات میں مسلمانوں کا استقلال کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہنا اور مصائب کے طوفانوں کو خیال میں نہ لانا اور جانوں کو راستی و خدا پرستی پر قربان کر دینا اور حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ایک تعلیم سے جذبۂ خدا پرستی میں ایسا سرشار ہو جانا کہ دنیا کی آفت و مصیبت اور سخت سے سخت بلا اور تمام ملک کا شمشیر بکف ہو کر تشنہ خون ہو جانا انھیں مرعوب نہ کر سکا نہایت حیرت انگیز اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا بہت واضح اور روشن معجزہ ہے۔

ان واقعات پر نظر کر کے کون عاقل کہہ سکتا ہے کہ مسلمان خود درپے جنگ ہو بھی سکتے تھے۔ ہاں! جب کفار نے انہیں چین نہ لینے دیا اور بجائے اس کے کہ قرآن کریم کی ایک چھوٹی سی سورت کا مثل بنا سکتے، لڑنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور ہر طرف سے لشکر کشی شروع کر دی اور مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے ٹوٹ پڑے تو اس وقت مسلمانوں کا استقلال کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہنا اور ان ہولناک مصائب کے ہجوم میں ثابت قدم رہنا اور شجاعت و بسالت کے ساتھ اعدائے دین کا مقابلہ کرنا اور بتائید الٰہی اپنی قلت اور بے سامانی کے باوجود ان پر فتح پانا اور تمام ملک کا بادشاہ اسلام کے مقابل عاجز ہونا اور ان کی دولتوں، لشکروں، مکروں کا ان کے کام نہ آنا اسلام کی حقانیت اور ربانی تائید کی کھلی دلیل ہے۔ ایک طالب حق اتنا ہی دیکھ کر اسلام کی حقانیت کی طرف سے مطمئن ہو سکتا ہے اور یہ حالات اس کی ہدایت کے لیے کفایت کر سکتے ہیں، بشرطیکہ چشم بینا اور منصف دل اس کے پاس موجود ہو۔

یہی وجہ تھی کہ لاکھوں آدمی اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے چلے گئے اور وہی جو سرگرم مخالفت تھے، اسلام کے شیدائی بن گئے اس جنگ پر جو مسلمانوں کے لیے ناگزیر تھی، کون عاقل انہیں الزام دے سکتا ہے۔ اسلام کے آئین میں ملک و مال کے لیے جنگ کرنا داخل ہی نہیں ہے اور یہی سبب ہے کہ اسلام کے پیشوائے اعظم حضور پرنور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں اگرچہ بہت سی فتوحات ہوئیں اور

سرکش قومیں اطاعت گزار اور فرمانبردار بنیں، محارب ناکام ہوئے، اسلام کو فتح پر فتح حاصل ہوتی چلی گئی، لیکن بایں ہمہ فتوحات سلطان کونین بادشاہ دارین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی سکونت و آسائش کے لیے کوئی قلعہ یا گڑھی تیار نہیں فرمائی، نہ کوئی خزانہ، نہ ذاتِ خاص کے لیے املاک کا ذخیرہ، نہ اپنے اہل و عیال کے لیے فراغت عیش کے اسباب، وسیع جاگیریں اور وافر مال بہم پہنچایا بلکہ اس سرور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس زندگی اول سے آخر تک درویشانہ و زاہدانہ رہی۔

○ ○ ○

اعتراض: پنڈت نے آیات "اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ" کو بے جوڑ طریقہ سے ملایا، کسی کا ٹکڑا کسی کے ساتھ جوڑا، سخن فہمی تو اسی سے ظاہر ہے کہ اتنا بھی شعور نہیں کہ بات کہاں پوری ہوئی، دو باتیں تھیں ان میں سے پہلی بات کا نصف حصہ علیحدہ کیا اور پچھلا نصف دوسری بات کے ساتھ ملایا، اتنا بے شعور آدمی اگر اعتراض کرے تو کیا تعجب ہے وہ خود اپنی نادانی کا ماتم کرتا ہے، پھر بھی اس جوڑ گانٹھ، قطع و برید سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب پنڈت کی عبارت دیکھیے اور اندازہ کیجیے کہ کونسی قابلِ اعتراض بات اس کے ہاتھ آسکی۔ پنڈت نے آیت کی قطع و برید کر کے جو اٹکل پچو ترجمہ لکھا ہے، وہ یہ لکھا ہے: "اور یہ کہ اللہ سخت تکلیف دینے والا ہے، شیطان کے پیچھے مت چلو، وہ دافعی تمہارا دشمن ہے۔" اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ برائی اور بے شرمی کی اجازت دے، اور یہ کہ تم کہو اللہ پر جو نہیں جانتے۔

اعتراض: کیا تمہارا خدا بدوں کو عذاب دینے والا اور نیکوں پر رحم کرنے والا ہے یا مسلمانوں پر رحم کرنے والا اور دوسروں کو عذاب دینے والا ہے، موخرالذکر صورت میں وہ خدا ہی نہیں ہو سکتا، اگر خدا طرفدار نہیں ہے تو جو آدمی جبکہ دھرم کرے گا اس پر خدا رحم اور جو ادھرم کرے گا اس کو سزا دے گا۔ ایسی حالت میں محمد صاحب اور قرآن کو شفیع جاننا ضروری نہ رہا اور جب سب کو برائی کرانے والا ہر ایک

انسان کا دشمن شیطان ہے اس کو خدا نے پیدا ہی کیوں کیا؟ کیا وہ آئندہ کی بات نہیں جانتا تھا؟ اگر کہو کہ نہیں جانتا تھا لیکن آزمائش کے لیے بنایا تو بھی درست نہیں کیونکہ آزمائش کرنا محدود العقل کا کام ہے، ہمہ داں خدا سب روحوں کے اچھے برے اعمالوں کو ہمیشہ ٹھیک ٹھیک جانتا ہے اور اگر شیطان سب کو بہکاتا ہے تو شیطان کو کس نے بہکایا ہے؟ اگر کہو کہ شیطان خود بخود بہکایا جاتا ہے تو اور بھی خود بخود بہکائے جا سکتے ہیں، درمیان میں شیطان کا کیا کام ہے اور اگر خدا ہی نے شیطان کو بہکایا تو خدا شیطان کا بھی شیطان ٹھہرے گا۔ ایسی بات خدا کی نہیں ہو سکتی اور جو کوئی کسی کو بہکاتا ہے وہ بد صحبت اور لاعلمی کے باعث خود گمراہ ہوتا ہے۔

جواب: یہ وہی باتیں ہیں جو پنڈت کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں اور بارہا ان کو لکھ چکا ہے اور مکرر سہ مکرر جواب گزر چکے ہیں، جب اسلام دین الٰہی ہے اور وہ ہدایت کے لیے آیا اور اس نے نیک باتیں بتائیں تو نیک وہی ہے جو اس کا متبع ہوا اور جو متبع نہ ہو، اسلام قبول کرے، وہ بد ہے تو پھر یہ کیا پوچھتا ہے کہ خدا بدوں کو عذاب دینے والا اور نیکوں پر رحم کرنے والا ہے، مسلمانوں پر رحم کرنے والا نیک تو مسلمان ہی ہیں جو خدا کی ذات و صفات کی نسبت حق (اچھا) اعتقاد رکھتے ہیں اور وہ ناخدا شناس جو خدائے عزوجل کو نہ پہچانیں اور مخلوقات کے ذرہ ذرہ کو خدا کی طرح واجب الوجود اور قدیم جانیں وہ ہر بد سے بدتر ہیں مگر پنڈت کے اعتراض سے آریوں کی نصرت کے لیے ایک نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ خدا کا رحم و کرم آریہ دھرم کے قبول کرنے پر منحصر نہیں۔ ہر مذہب میں آدمی نیک رہ کر پنڈت کے اعتقاد میں رحمت الٰہی کا مورد ہو سکتا ہے، پھر آریہ ہونا بے کار اور اس کے لیے کوششیں کرنا، کتابیں لکھنا، لیکچر دینا، شور مچانا، فساد برپا کرنا، نہایت ظلم اور پرلے سرے کا گناہ ہے۔ اسی طرح پنڈت کا یہ اعتراض بھی لایعنی ہے کہ "جب شیطان انسان کا دشمن ہے تو خدا نے اس کو پیدا ہی کیوں کیا۔" ایسی بات تو معمولی سمجھ کا انسان بھی زبان پر لانا گوارا نہ کرے گا۔ سانپ، بچھو، بھیڑیے، شیر، ریچھ اور موذی جانور سب انسان کے دشمن ہیں۔ وہ کیا خدا کے سوا کسی اور نے پیدا کیے اور خود مسلمان اور عیسائی جنہیں آریہ اپنا دشمن جانتے ہیں اور ان کی طرف سے دل میں بہت

عناد غضب سر کھتے ہیں، انہیں بھی خدا ہی نے پیدا کیا تو پنڈت جی نے کبھی ایشور کو ٹیلی فون نہ کیا کہ آپ سے یہ کیا غلطی ہوئی کہ ویدک دھرم کا ناس لگا دینے والوں کو آپ نے پیدا کر کے مدت ہائے دراز تک دھرماتماؤں کو ان کی غلامی کی ذلتوں میں مقید رکھا اگر آپ جانتے تھے کہ یہ ادھرمی ہیں تو آپ نے پیدا ہی کیوں کیا اور اگر نہ جانتے تھے تو بایں جہالت ایشور ہونے کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ پنڈت جی کی نظر اپنے گریبان میں نہیں پڑتی اور اپنی آنکھ کا شہتیر انہیں نظر نہیں آتا۔

پنڈت جی کا ایک نہایت فرسودہ اور لغو اعتراض یہ بھی ہے کہ "اگر شیطان سب کو بہکاتا ہے تو شیطان کو کس نے بہکایا؟" یہ ہر عاقل جانتا ہے کہ بہکانے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کو بھی کسی نے بہکایا ہو۔ ہزاروں آدمی دوسروں کو اغوا کرتے ہیں تو کیا ضروری ہے کہ ان اغوا کرنے والوں کو بھی کسی نے اغوا کیا ہو۔ پنڈت جی کے نزدیک تو آریوں کو سوا ساری دنیا کے لوگ بہکانے ہی والے ہیں۔ سناتن دھرمی پنڈتوں کی شان میں پنڈت جی نے دل کھول کر الفاظ لکھے ہیں اور ان کو بہکانے والا بتایا ہے تو ان بہکانے والوں کو کیا پنڈت جی کے اعتقاد میں ایشور نے بہکایا ہے جب کہ خود ان کا قول ہے کہ کسی کی طبیعت میں خود اپنے آپ ہی خبث ہوتا ہے اور کوئی بہکائے سے راہ حق چھوڑ کر منحرف ہوتا ہے۔ شیطان میں خبث طبعی ہے اس کے لیے کسی اور بہکانے والے کی ضرورت نہیں، اتنی بات بھی نہ سمجھنا اور کسی مذہب کی پیشوائی کا مدعی ہونا اس مذہب کی حقیقت کو آشکار کر دیتا ہے۔

○ ○ ○

پنڈت جی نے آیہ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے: "تم پر مردار، لہو اور گوشت سور کا حرام ہے اور سوائے اللہ کے جس پر کچھ پکارا جائے۔" اس پر پنڈت نے یہ اعتراض کیا:

اعتراض: یہاں پر سوچنا چاہیے کہ کوئی جانور خواہ خود بخود مرا ہو یا کسی کے مارنے سے دونوں حالتوں میں وہ مُردار ہے' ہاں! ان میں کچھ فرق بھی ہے تو بھی موت میں کچھ فرق نہیں اور جب صرف سور کی ممانعت ہے تو کیا انسان کا گوشت کھانا روا ہے' کیا یہ بات اچھی ہو سکتی ہے کہ خدا کے نام سے دشمن وغیرہ کو عذاب دے کر اس کی جان لی جائے۔ اس سے تو خدا کے نام پر دھبہ لگتا ہے' ہاں! خدا نے بلا پورب جنم یعنی زندگی سابقہ کے گناہوں کے مسلمانوں کے ہاتھ سے جانداروں کو عذاب کیوں دلایا؟ کیا ان پر رحم نہیں کرتا؟ ان کو اولاد کی مانند نہیں جانتا؟ جس جان سے زیادہ فائدہ پہنچے مثلاً گائے وغیرہ ان کو مارنے کی ممانعت نہ کرنے سے خدا دنیا کو نقصان پہنچانے والا ثابت ہوتا ہے اور عام طور پر ایذا رسانی کے گناہ سے خدا بھی بدنام ہو جاتا ہے۔ ایسی باتیں خدا اور خدا کی کتاب کی ہرگز نہیں ہو سکتیں۔

جواب: یہ کفار مکہ کا اعتراض تھا کہ مسلمان اپنے ہاتھ کے مارے ہوئے کو حلال جانتے ہیں اور خدا کے مارے ہوئے یعنی اپنی موت مرجانے والے کو حرام۔ پنڈت جی نے اسی سے یہ اعتراض اڑایا اور جو حماقت انہوں نے کی تھی' آپ نے اس کا اتباع کیا۔ ہر عاقل جانتا ہے کہ طبعی موت فساد مزاج اور فنائے ارواح اور اکثر حالات میں انتشار سمیت سے واقع ہوتی ہے۔ قویٰ میں اگر ذرا سی رمق بھی باقی ہو تو جاندار نہیں مرتا۔ جب تمام اعضاء کی طاقتیں باطل ہو چکتی ہیں' اعضاء فاسد و خراب ہو جاتے ہیں' ان کے مزاج بدل جاتے ہیں یا ان میں سمیت آ جاتی ہے' اس وقت طبعی موت جاندار کے بدن پر وارد ہوتی ہے تو اس کے کھانے کا حکم دینا اقتضاء حکمت نہ تھا۔ صحیح سالم' تندرست جاندار جس کے بدن میں سمیت نہیں ہے' اس کو ذبح کر کے کھایا جائے اور ذبح کرنے سے اس کا دم بغیر گھٹے آسانی سے نکل جائے تو اس کے اعضاء فساد سے محفوظ رہتے ہیں اور وہ غذا صالح ہو کر بدن کی صحت و قوت کا سبب ہوتا ہے' اس لیے یہ اعتراض جہالت ہے کہ مُردہ اور ذبح کیے ہوئے میں فرق نہیں۔ دونوں کو مُردار بتانا ناواقفی ہے' لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر پنڈت اور اس کے ہمنواؤں کے نزدیک مذبوح اور مردار دونوں میں غذائیت کے اعتبار سے فرق نہیں ہے تو آریہ مردار خواری شروع

کر دیں کہ ماس میں بہترین غذا بھی ملے گی اور کسی کی ایذا بھی نہیں ہے، مگر آریوں کا گوشت سے بالعموم احتراز کرنا اس کی دلیل ہے کہ وہ مُردار کو مذبوح کی مثل صالح الغذا نہیں سمجھتے تو پھر مسلمانوں پر اعتراض کرنے کی کیا وجہ؟

پنڈت کا یہ قول کہ صرف سور کی ممانعت ہے، قرآن پاک پر افتراء اور بہتان ہے۔ اس میں یہ کہیں نہیں کہ ممانعت صرف سور کی ہے بلکہ جو آیت پنڈت نے نقل کی ہے، اس میں بھی کئی قسم کے محرمات کا ذکر ہے۔ یہ کیا اعتراض ہے جس کے شوق میں جھوٹے الزام لگائے جائیں اور بہتان اٹھائے جائیں۔ رہا مذبوح کا نام خدا ذبح کرنا، یہ ایک عارفانہ تعلیم ہے کہ جب تم نفیس غذا یعنی حیوان کے گوشت کا ارادہ کرو تو تمہارا فرض ہونا چاہیے کہ رب النعمت یعنی اپنے اور اس کے خالق کی یاد کرو اور اس کا نام لو۔ اب اس میں مومن کو مشرکین کے اطوار و عادات سے بچانا اور شبہ و شائبہ شرک سے محفوظ رکھنا بھی مدنظر ہے کیونکہ مشرک بتوں کے نام پر جانوروں کی قربانی کرتے ہیں تو مومن کو خدا کے نام کا اعلان کر کے ظاہر کر دینا چاہیے کہ ان کا فعل مشرکین کے افعال کی طرح باطل اور نجاست شرک سے آلودہ نہیں ہے اور جو گوشت وہ کھانا چاہتے ہیں یہ اس جانور کا نہیں ہے جس کی جان بتوں کے نام پر بے فائدہ ضائع کی گئی ہو اور اس کا ذبح شرک اور خدائے وحدہ لاشریک لہ سے بغاوت ہو۔

پنڈت جی نے اسی سلسلہ میں ایک یہ بھی اعتراض کیا ہے: "ہاں! خدا نے بلا پورب جنم یعنی زندگی سابقہ کے گناہوں کے مسلمانوں کے ہاتھوں سے جانداروں کو عذاب کیوں دلایا؟"

آریہ سوچیں پنڈت صاحب کا یہ اعتراض مسلمانوں پر ہوا یا آریوں پر۔ جب پنڈت کے اعتقاد میں ہر جاندار کی راحت و تکلیف اس کے عمل کی جزا اور پرکرتی کا پھل ہے تو ضرور مذبوح جانور اپنے سابقہ اعمال سے ذبح کا مستوجب تھا اور ایشوری عدل و داد کی رو سے اس کا ذبح ہونا عین انصاف اور نہایت ضروری تھا تو مسلمانوں پر ایذا رسانی اور بے رحمی کا اعتراض پنڈت کے اپنے عقیدہ کے خلاف ہے، بلکہ وہ بندے جن کے ہاتھ سے اس نے احکام عدل جاری کرائے اور مستحق سزا کو سزایاب کرایا، ضرور

مقبول و مقرب اور اپنے کارساز کی مرضی کے تابع ہیں جس طرح مجسٹریٹ شاہی قانون کو نافذ کر کے بادشاہ کے احکام عدل و انصاف کو عمل میں لاتا ہے اور ایوانِ حکومت میں صاحب منصب مانا جاتا ہے۔ ایسے ہی وہ بندے جو لائق سزا مخلوق کو سزا دے کر خداوندی انصاف کا قانون نافذ کرتے ہیں، خدائی حکومت میں منصب دار اور اس کے مقبول ہیں۔ یہ سمجھ کر تو پنڈت اور اس کے ہم اعتقادوں کو مسلمانوں کے سامنے گردن نیاز جھکا دینا چاہیے اور ان پر اعتراض کر کے ایشور کا مجرم اور باغی نہ بننا چاہیے اور اگر پنڈت یا اس کے ہمنوا یہ کہیں کہ جانور کا عمل تو ایسا نہ تھا کہ جس پر وہ قتل کی سزا کا مستحق ہوتا نہ ایشور کی دی ہوئی عمر ابھی تمام ہوئی تھی بلکہ ایشور کی عطا کی ہوئی عمر کے بہت سے سال ابھی باقی تھے لیکن مسلمانوں نے بغیر سابقہ عمل کے بے گناہ جانوروں کو وقت سے پہلے مار دیا اور ایشور کی دی ہوئی عمر کو پورا ہونے نہ دیا تو اب یہ بتائیں کہ ایشور زبردست ہوا یا مسلمان۔ ایشور کی قلمرو میں اس کا حکم تو نافذ نہ ہو سکا، مسلمان جو چاہتے ہیں، کرتے رہے۔ ایشور بے گناہوں کو محفوظ نہ رکھ سکا، اپنے قانون کو شکست سے بچا نہ سکا تو ایسے مجبور کو ایشور اور قادر مطلق ماننا خبط ہے اور جن مسلمانوں سے پنڈت جی کے ایشور کی بھی نہ چلی، ان سے لڑنا اور چھیڑ چھاڑ کرنا حماقت اور بدبختی کی نشانی ہے۔

اب اسی مسئلہ کے ایک دوسرے پہلو پر نظر کیجئے۔ گوشت بہترین اور قوی ترین غذا ہے۔ لذیذ بلکہ الذ ہے، مقوی اور ضعف دُور کرنے والا ہے۔ دریافت طلب یہ ہے کہ ایسی نفیس لذیذ، مقوی، نافع غذا مسلمانوں کو بغیر عمل سابق کے ملی تو تناسخ باطل ہوا اور اگر انھوں نے پہلی جون میں ایسے عمدہ عمل کیے تھے جن کی جزا میں وہ ایسی عمدہ غذا کے مستحق تھے تو پھر رونا اور اعتراض کرنا کیسا، خود ایشور نے یہ غذا انہیں ان کے عمل کے بدلے میں دی ہے۔ اس پر اعتراض ایشور کی بغاوت اور سخت توہین ہے بلکہ اس پر آریوں کو خوش ہونا چاہیے کہ روئے زمین پر مسلمان ایسے مقبول بندے ہیں جنہیں گوشت جیسی غذا دی جاتی ہے۔ ہاں ایک وجہ رنج کی یہی ہے کہ مسلمانوں کو تو لذیذ کھانوں سے قوت و طاقت دی جاتی ہے اور آریوں کو عمر بھر دال اور ساگ کھانے کو دیئے جاتے ہیں، عمدہ غذا سے زندگی بھر محروم رکھے جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے

کہ ان کے سلسلہ وصول کی بناء پر پہلی زندگی میں ان کے پاس ایسے اچھے عمل نہ تھے کہ وہ ایسی عمدہ غذا کے مستحق ہو سکتے تو اب انہیں رنج کا کیا موقع؟ اور مسلمانوں سے ذبح حیوانات کی کیا شکایت؟

جانداروں کے ذبح کو جرم بتانا اور تناسخ کو ماننا یہ ایسی دو متضاد باتیں ہیں جو کسی طرح جمع نہیں ہو سکتیں اور آریہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ان دونوں مسئلوں کو باہم ٹکرانے سے نہیں بچا سکے۔

اس سے عجیب تر معترض کی یہ نابینائی ہے کہ مسلمانوں کے ذبح گاؤ کو تو اس نے اپنے عقیدہ کے خلاف ظلم اور تکلیف بے سبقت عمل مانا لیکن اپنی گئو ماتا کو عمر بھر رسی باندھ کر ذلیل ترین قیدی کی طرح مقید رکھنا اور اس کے نوزائیدہ بچے کو بغیر کسی پچھلے عمل کے اس کی ماں کے سامنے علیحدہ باندھ دیا اور جاندار کی قدرتی غذا اس سے چھین لینا، بچے کی محبوسی قید، بھوک پیاس میں ڈکرانے، ماں کے پاس پہنچنے اور دودھ پینے کو ترسنے کی رُوح فرسا اور جگر کو پاش پاش کر ڈالنے والی مصیبت میں گئو کو مبتلا کرنا اور بچے کی بے کسی اور بے بسی کے دردناک مناظر اس کی ماں کی نگاہوں کے سامنے لانا اور پھر بچے کا دودھ چھین کر پی جانا یا دودھ دینے میں اگر گائے راضی نہ ہو اور خداداد غذا کو وہ اپنے بچے کے لیے بچا کر رکھنا چاہے تو اس کے پچھاند باندھنا، ڈھنگنا ڈالنا، لاٹھیوں سے مارنا، طرح طرح کی ایذائیں دینا، جس میں تمام ہندو مبتلا ہیں، تمام آریہ گرفتار ہیں، قرنوں سے ان کی نسلیں یہ ستم گاری کرتی چلی آئی ہیں، یہ کیوں ظلم نہیں؟ پنڈت نے اس کی مخالفت کیوں نہیں کی؟ اپنے معتقدین کو اس بے رحمی سے کیوں نہیں روکا؟ اس سے بڑھ کر وہ مصائب ہیں جو ان کی ماتا گئو کے شوہر بیل مہراج پر نازل ہوتے ہیں، لالہ اور پنڈت سب انہیں کے قابو کرنے کے لیے ناتھ ڈالتے ہیں اور بیاجی سے سواری لیتے ہیں اور اگر وہ آہستہ چلے تو آریے مار مار کر لہولہان کر ڈالتے ہیں۔ کیسے سعادت مند پتر ہیں جنہیں کبھی پتاجی کی تکلیف کا دھیان بھی نہیں آتا۔

زمین جوتنے میں بیل کی کیسی مرمت کی جاتی ہے۔ اس کی ساری زندگی پٹنے کٹنے، مار کھانے اور رات دن مصیبتیں جھیلنے میں گزرتی ہے بغیر سابقہ عمل کے یہ تمام طریق

ظلم ہوا اور ایسے ظلم ہوا کہ ملک کے ہر ہر بیل پر زندگی بھر یہ ظلم ہوتا ہی رہا۔ اسی طرح دوسرے حیوانات ہاتھی، گھوڑے، خچر وغیرہ کو مقید کر کے کیا کیا تکلیفیں نہیں دی جاتیں؟ مگر پنڈت جی نے کبھی آریوں سے ان بے محابا مظالم کے ترک کر دینے کی اپیل نہیں کی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ ان حیوانات پر حکومت، تسلط اور اپنے اختیار سے انھیں کام میں لانا انسانی حق ہے کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں، تو پنڈت کا اعتراض ہر پہلو سے لغو، باطل اور غلط ہے۔

اب ایک پہلو پر اور نظر ڈالیے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ ذبح گاؤ کا کام جس کے مسلمان مرتکب ہیں، ہندوستان اور یہاں کے باشندوں پر عظیم ترین احسان ہے، اس لیے کہ ہندوستان کے وسیع ملک میں مسلمانوں کی لاکھوں بستیاں، ضلع، شہر، قصبے ایسے موجود ہیں کہ جن میں روزانہ بکثرت گائے ذبح کی جاتی ہے۔ اگر یہ فرض کیجیے کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں میں سے چار کروڑ ایسے ہیں جو گائے کا گوشت نہیں کھاتے باوجودیکہ ہرگز یہ نسبت نہیں ہے، مسلمانوں میں گوشت کھانے والوں کا تناسب اسی فیصدی سے کسی طرح کم نہیں ہے لیکن اگر انتہا درجہ کی کمی کی جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ ایک گائے کو دو سو مسلمان کھاتے ہیں، یہ بھی فرض اوّل ہے، ورنہ اوسطاً فیصدی ایک گائے کی نسبت بڑی ہے لیکن کم سے کم آپ یہی مانئے کہ ایک گائے دو سو آدمی کھاتے ہیں تو چار کروڑ آدمی دو لاکھ گائے کھائیں گے۔ اس حساب سے کم از کم دو لاکھ گائے صرف ہندوستان میں روزانہ ذبح ہو جاتی ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ مسلمانوں کی نصف تعداد کو گاؤ خوار نہ مانا جائے، باقی نصف کی غذا بھی اتنی قلیل مانی جائے لیکن اب آپ غور کیجیے کہ جس ملک میں روزانہ دو لاکھ گائے صرف مسلمانوں کی خوراک میں آجاتی ہوں اور صدیوں سے مسلمان اسی نسبت سے گوشت کھاتے رہے ہوں باوجود اس کے پھر گائے کی قلت نہ ہو، گوشت کی گرانی نہ ہو۔ باوجود ہندوؤں کی کوششوں اور رکھشا خانوں کی بھرتیوں اور گئو شالوں کی حفاظتوں کے گائے بغیر گرانی کے نہایت آسانی سے اس کثیر تعداد میں روزانہ بہم پہنچ جاتی ہو تو اگر ایک سال کے لیے مسلمان گائے کا ذبح ترک کر دیں تو ہندوستان میں گایوں کی تعداد سات کروڑ تیس لاکھ

سے زیادہ ہو جائے اور لالہ لوگ اپنی غذا کے دانے بھی انہیں کھلا دیں تو بھی انہیں کفایت نہ کرے۔ تمام جنگل ویران ہو جائیں، سبزہ کا نام نشان کہیں باقی نہ رہے، غلہ بھی ان کی ماتاجی کھا جائیں جب بھی بھوکی کی بھوکی رہیں۔ ملک تباہ ہو جائے، کبھی اس تحریک کی معقولیت پر ہندوؤں نے غور نہیں کیا۔ اب پنڈت جی سے پوچھئے کہ اگر مسلمان گوشت کھانا ترک کر دیں تو ہندوؤں کے ایشور سے بھی ملک کا انتظام نہ ہو اور گاؤں کی بڑھتی ہوئی تعداد ہندوستان کی ساری پیداوار ہضم کر جائے، پھر بھوکی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان کی اقوام گائے کی قربانی اور اس کے ذبح کی عادی تھیں۔ ہندوؤں کی کتابوں میں اس کے ناقابل انکار ثبوت ملتے ہیں۔

علاوہ بریں گائے کے خون کا تنہا مسلمانوں پر الزام لگانا بھی انصاف کا خون ہے جبکہ گائے کے اجزاء میں سے ایک جزو گوشت تو مسلمانوں کے حصہ میں آتا ہے۔ اس کو بھی تنہا مسلمان نہیں کھاتے بلکہ بہت سی وہ قومیں بھی کھاتی ہیں جن کو مردم شماری میں ہندو لکھا جاتا ہے اور جن کی تعداد ہندو اپنے میں شامل کر کے نشستیں حاصل کرتے ہیں۔ گوشت کے علاوہ دوسرے اجزاء سینگ، ہڈی، تانت، چمڑا یہ سب ہندوؤں کے استعمال میں آتا ہے۔ بڑے بڑے بھگت بننے والے گھوڑوں کے ساز چمڑی استعمال کرتے ہیں، بانکیں ہاتھوں میں تھامے پھرتے ہیں، ہینڈ بیگ، سوٹ کیس وغیرہ بکثرت چیزیں چمڑے کی استعمال کرتے ہیں، پانی کے نلوں میں چمڑے کی کٹوریاں لگائی جاتی ہیں اور وہ ہمیشہ پانی میں ڈوبی ہی رہتی ہیں، پانی انہیں پر ہو کر آتا ہے، وہی پانی استعمال کرتے ہیں، کروڑوں روپیہ کا چمڑہ اور سینگ وغیرہ ہندوؤں کے استعمال میں آجاتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہندو گئو ماتا کے جسم کے اجزاء استعمال بھی کریں، چمڑے کی جوتیاں بھی بنائیں اور ان پر گاؤ کشی کا الزام نہ آئے، سارا غصہ مسلمانوں ہی پر رہے۔ پھر چمڑے کی تجارتوں میں ہندوؤں کا دخیل ہونا یہ کیوں گئو ہتیا نہیں بتایا جاتا اور جو مال گائے کے اجزاء کی تجارت سے حاصل کیا جائے وہ ہندوؤں کے لیے کس طرح جائز سمجھا جاتا ہے۔ جب ہندوؤں کے نزدیک گائے کا ذبح کرنا اور اس کی جان لینا ظلم ہے تو اس ذریعہ سے جو دولت پیدا کی گئی ویسی ہی ہے جیسے رہزنی یا قزاقی سے ثروت حاصل کر لی جائے۔ لیکن پنڈت جی نے ہندوؤں کی

طرف رخ نہیں کیا۔ ان کے اعتراض کی توپ کا دہانا فقط مسلمانوں ہی کی طرف ہے۔ ہندو گئو ہتیا بھی کریں تو اس پر چیں بہ جبیں نہیں ہوتے۔

یہ بات ضرور غور طلب تھی کہ اگر ہندو چمڑا' سینگ' ہڈی' تانت وغیرہ گائے کے اجزاء کا استعمال مطلقاً ترک کر دیتے تو مسلمانوں کے لیے اس قدر گراں ہو جاتا کہ اسے بڑے بڑے دولت مند ہی کھا سکتے تھے۔ گائے کی قیمت تو چمڑے ہی سے حاصل ہوتی ہے اس لیے ذبح کی جس قدر بھی کثرت ہوگی' چمڑے کے کاروبار کی ترقی سے ہوگی تو اس ذبح کا ذمہ دار ہندو کو ٹھہرانا چاہیے تھا مگر پنڈت جی نے انہیں بالکل صاف چھوڑ دیا۔ اس سے معترض کی نیت اور کدورتِ قلب کا پتا چلتا ہے۔

○ ○ ○

اعتراض: پنڈت نے آیہ کریمہ اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ الآیہ کا نہایت جاہلانہ مغلط ترجمہ لکھ کر اس پر انتہا درجہ کا لغو اعتراض کیا ہے۔ اس کی عبارت ملاحظہ فرمایئے: "روزے کی رات تمہارے واسطے حلال کی گئی کہ رغبت کرنا اپنی بیبیوں سے' وہ تمہارے واسطے پردہ ہیں اور تم ان کے لیے پردہ ہو' اللہ نے جانا کہ تم خیانت کرتے ہو' پر اللہ نے معاف کیا تم کو۔ پس ان سے ملو اور ڈھونڈو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے یعنی اولاد اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے واسطے کالے دھاگے سے سفید دھاگہ یا رات سے دن نکلے۔" (یہ پنڈت جی کا غلط ترجمہ تھا) اب آپ اس پر اعتراض لکھتے ہیں:

یہ تحقیق ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کا مذہب جاری ہوا تب یا اس سے پہلے کسی نے کسی پورا تک سے پوچھا ہوگا کہ چاند راین برت جو ایک مہینہ بھر کا ہوتا ہے اس کا طریق بیان کرو۔ شاستر کا طریق یہ ہے کہ چاند کی کلا کے گھٹنے بڑھنے کے مطابق لقموں کو گھٹانا بڑھانا اور دوپہر کے وقت کھانا چاہیے' اس کو نہ جان کر پورا تک نہ کہا ہوگا کہ چاند کو دیکھ کر کھانا کھانا چاہیے۔ اس چاند راین برت کو مسلمانوں نے اس قسم کا بنا لیا لیکن

برت میں مجامعت منع ہے، پر بیک بات ان کے خدا نے بڑھ کر کہہ دی کہ تم روزے کی رات کو مجامعت بھی کیا کرو اور رات میں جتنی دفعہ چاہو کھاؤ۔ بھلا یہ روزہ کیا ہوا کہ دن کو نہ کھایا، رات کو کھاتے رہے۔ یہ بات قانون قدرت کے خلاف ہے کہ دن میں نہ کھانا اور رات کو کھانا۔

جواب: جس شخص کو ترجمہ کرنے اور بات سمجھنے کا سلیقہ نہ ہو اس کا اعتراض اس کی بے علمی و نافہمی کا ثبوت ہے اور پھر اعتراض کیسا رکیک اور لایعنی جس سے معترض کی حقائق شناسی کا پردہ فاش ہوتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ یہ تحقیق ہوتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ویدک دھرم کی تحقیق کس پایہ کی ہوتی ہے۔ اس سے ان کے مذہب اور تمام اعتقادیات کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ معمولی سے معمولی عقل و فہم کا انسان کسی واقعہ کی نسبت تحقیق کا لفظ اس وقت زبان پر لاتا ہے جب اس کو واقعہ کی صحت قطعی طور پر معلوم ہو اور یقینی ذرائع سے شک و تردد رفع ہو چکے ہوں۔ دلائل اور شواہد سے اطمینان کامل حاصل ہو گیا ہو اور وہ جانتا ہو کہ واقعہ ہرگز اس کے خلاف نہیں اور اس کے ناقابل انکار ثبوت اس کے پاس موجود ہیں۔ لیکن پنڈت کی اصطلاح اور اس کی لغت میں تحقیق کے یہ معنی نہیں۔ آپ کے یہاں تحقیق اس کا نام ہے کہ واقعہ کی نسبت نہ کوئی ثبوت ہو، نہ کوئی دلیل، نہ کہیں سے خبر آئی ہو، نہ اس پر شہادت گزری ہو، نہ افواہ ہو، نہ کانوں کان اس کا کچھ پتا ہو، سپنے میں بھی نہ دیکھا ہو بلکہ جس طرح افیونی پینک میں کوئی تصور باندھ لیتا ہے اس طرح کا کوئی وہم پیدا ہو گیا وہ آپ کے یہاں تحقیق ہے۔ جہاں تحقیق اتنی زبردست ہو اس مذہب کی حقانیت کیسی کچھ ہو گی۔ اس تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ وہمیات کے بادشاہ ہیں اور آپ کا سرمایہ تحقیق بے اصل اوہام ہیں، چنانچہ یہاں آپ کی تحقیق کیا ہے یہ کہ جب مسلمانوں کا مذہب جاری ہوگا تب کسی نے پورانک سے پوچھا ہوگا۔ اس نے کہا ہوگا یہ ہوئی تحقیق جس کا مدار ہوا ہوگا اور پوچھا ہوگا اور کہا ہوگا پر ہے۔ تاریخ تو اس تحریر کے سامنے بے کار ہو گئی۔ واقعات کے لیے نقل و خبر کی حاجت ہی نہ رہی، ہوا ہوگا سے سارے عقدے حل ہو گئے۔ اس تحقیق نے تو خیالی پلاؤ کو بھی مات کر دیا۔

کاش پنڈت جی اس تحقیق سے ویدک دھرم کی تاریخ تصنیف کر جاتے تو بڑا مزہ دیتی، جہاں تحقیق کا یہ حال ہے وہاں کی معمولی خبریں تو بالکل برعکس ہوتی ہوں گی۔ یہی تحقیق ہے جس کے اعتبار سے پنڈت جی اپنے آپ کو محقق کہتے ہیں۔ اعتراض کا حاصل صرف اتنا ہے کہ اسلام میں روزہ ہندوؤں کے شاستر سے لیا ہو گا۔

اوّل تو بے ثبوت بات محض لغو ہوتی ہے، ثانیاً کہاں ہندو اور کہاں مرکز اسلام، اس زمانہ کے ہندو نہ عربی جانتے تھے نہ سمندر پار کا سفر جائز سمجھتے تھے، تو پورانک کہاں جا مرا ہو گا۔ علاوہ بریں آپ کے برت کو مسلمانوں کے روزے سے نسبت کیا۔ برت میں کواکب پرستی ہے، اس لیے چاند کے گھٹنے بڑھنے کے ساتھ لقمے گھٹائے بڑھائے جاتے ہیں، پھر برت میں ترک خورد و نوش کہاں؟ دودھ اور دودھ کی بنی ہوئی چیزیں کھویا، مکھن، بالائی وغیرہ کھاتے پیتے رہتے ہیں اور دن دہاڑے دوپہر کے وقت سب کچھ کھا جاتے ہیں، اس کو روزہ سے کیا علاقہ، جو خاص رضائے الٰہی کے لیے رکھا جاتا ہے اور کسی مخلوق کے لیے نہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک مخلوق پرستی شرک و کفر ہے، نہ ان کے لقمے چاند کے گھٹنے بڑھنے سے شمار ہوتے ہیں، نہ چاند دیکھ کر کھانے کا حکم، نہ دوپہر میں کھانے کی اجازت۔ برت میں نفس پر مشقت ہی کیا ہوئی، جب دوپہر میں کھا لیا اور دودھ وغیرہ کھاتے پیتے رہے، مسلمانوں کا روزہ صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور تمام دن وہ کھانے پینے، مجامعت کرنے سے باز رہتے ہیں، باوجودیکہ ہر قسم کے لذائذ پاس ہوتے ہیں لیکن خدا کا بندہ رضائے الٰہی کے لیے کسی طرف التفات نہیں کرتا۔

بھوک اور پیاس کی شدت سے روزہ دار کے نفس کو جو تعب پہنچتی ہے وہ تو آپ کو جب معلوم ہو کہ ایک ماہ مسلمانوں کے ساتھ روزہ دار کی مثل کھانا پینا ترک کرو اور ان کا وقت جو جاگنے اور محنت کرنے کا ہے، اس میں ترک خورد و نوش کارے دارد، روزہ دار کو خدا کی بے شمار نعمتوں کی قدر معلوم ہوتی ہے اور ہر وقت زبان و دل سے شکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں، عملی طور پر قادر مطلق کی کبریائی کا اعتراف ہوتا ہے اور روزہ دار کی زبان حال کہتی ہے:

"اے میرے پیارے مالک! میں ہمہ تن احتیاج ہوں، ہر دم کاہش اور گھٹنے میں

ہوں، میرے اعضاء و جوارح تھکتے ہیں، بھوکے ہوتے ہیں اگر انہیں وقت پر مناسب غذا نہ ملے تو وہ ناکارہ ہو جائیں۔ تیری کریمی ہے کہ تو اپنے فضل سے غذا عنایت فرماتا ہے۔ اس سے میرے جسم میں توانائی آ جاتی ہے، روزہ کی حالت میں بھوک اور پیاس نے مجھ پر تیری نعمتوں کی قدر ظاہر کی۔ میں اپنی عاجزی، بے بسی اور شانِ بندگی سے عاجز ہوا۔ میرے حالات نے مجھے بتایا کہ تُو ہی کارساز ہے، تیرے ہی فضل پر میری زندگی اور آسائش کا مدار ہے۔ میں ہر آن تیرا محتاج ہوں، تجھے راضی رکھنا مجھے ہر کام سے زیادہ ضروری ہے، تیری طاعت و عبادت میرا مقدس فرض ہے۔"

"اے میرے رب! میرے حقیقی سچے منعم! تُو میرا مالک ہے۔ میری موت، حیات، آسائش، تکلیف سب کچھ تیرے ہاتھ میں ہے۔ تُو قادرِ مطلق ہے جو چاہے کرے، میں تیری یاد میں تیری رضا کے لیے اپنی خواہشات ترک کرتا ہوں۔ تیرے حکم کے حضور نیازمندی کی گردن جھکاتا ہوں، اپنے عیش و راحت کو تیری رضا پر قربان کرتا ہوں۔"

اس قسم کے مخلصانہ بندگی و نیاز کے جذبے روزہ دار کے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بھوک، پیاس کی شدت روزہ کی خشکی اعضاء میں ضعف ہر وقت اس کو مولیٰ کی یاد دلاتے رہتے ہیں اور عطیات خداوندی کی قدر اس کو معلوم ہوتی ہے۔ سپاس گزاری کی شان پیدا ہوتی ہے، خودبینی اور اسباب پر تکیہ، اپنی عقل و تدبیر پر اعتماد، غفلت عن اللہ جو بدترین بیماریاں ہیں، روزہ ان کا بہترین علاج ہے۔ صبح سے شام تک کا بیداری و ہوش کا وقت جس میں ہر آدمی کو علیٰ قدر حیثیت و مرتبت کسی نہ کسی طرح کی محنت و مشقت کرنا پڑتی ہے، روزہ کی قیدوں و پابندیوں میں بے آب و نان گزارنا اور بے خورد و نوش بسر کرنا تزکیہ نفس کا بہترین نسخہ ہے۔

پھر رات آتی ہے، غروبِ آفتاب افطار کا وقت ہے، پانی کے چند قطرے یا نمک کی ایک کنکری یا خرما یا چند سیو اور دال کے دانوں سے افطار کیا، بھوک اور پیاس کی شدت میں طبیعت مچلتی ہے کہ خوب سیر ہو کر کھائے، آسودہ ہو کر پیجئے کہ اس میں اذانِ مغرب کی آواز کان میں آتی ہے اور اللہ کا منادی حی علی الصلوٰہ کہہ کر فریضہ مغرب

کے ادا کرنے کے لیے بلاتا ہے۔ یہ عاشق صادق اور سچے پرستار کے امتحان کا وقت ہے کہ پکارنے والا حاضری دربار کے لیے پکارتا ہے اور بھوکا پیاسا بندہ وہ صدا سنتے ہی الوانِ نعمت و انواع و اقسام فواکہ و اطعمہ سے بے دریغ ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور اپنی بھوک پیاس اور اپنے حوائج اور نفس کی خواہشات کو نماز پر قربان کر ڈالتا ہے، گھر سے نکلتا ہے، مسجد میں حاضر ہوتا ہے، باطمینان نماز ادا کرتا ہے، نماز سے فارغ ہو کر گھر آیا، کھانا سامنے لایا گیا، جس قدر خواہش ہوئی کھایا۔

اب طبیعت آرام کی طرف مائل ہے، دن کا تھکا ہوا بدن راحت چاہتا ہے، آنکھوں میں خمار پیدا ہوتا ہے، اعضاء بکھرتے ہیں کہ نماز عشاء کا وقت آجاتا ہے، موذن کی پیاری آواز کان میں آتی ہے اور پیارے مالک کی عبادت کی طرف اخلاص کیش بندوں کو بلاتی ہے۔ نیند مچل رہی ہے، اعضاء میں سستی اور تکان ہے مگر روزہ دار ان میں سے کسی کی پرواہ نہ کرکے مسجد کو روانہ ہو جاتا ہے اور نماز فرض کے بعد تراویح میں قرآن شریف کھڑے ہو کر خشوع و خضوع کے ساتھ سنتا ہے۔

زہے تقدیر کہ بندہ مولیٰ کا کلام سنے، محب کے کان محبوب کی پیاری باتوں سے لطف اندوز ہوں اور سننا بھی کس شان ادب سے کہ ظاہری و باطنی طہارت کے ساتھ پاک لباس میں پاک جگہ، دست بستہ حاضر ہے اور دل و دماغ چشم و گوش اور اس کی تمام کائنات زندگی محو تعمیلات ہو رہی ہے۔ تمام عالم سے تعلقات قطع ہو کر ایک واحد لا شریک لہ کی طاعت میں مصروف امام آگے کھڑا ہوا انہیں آداب کے ساتھ قرآن کریم سناتا ہے اور تمام مقتدی اس کے پیچھے صف بستہ ہو کر قرآن حکیم سنتے ہیں۔ کیا مجال ہے کسی کو جنبش ہو جائے، کوئی ادھر ادھر دیکھ سکے، بوڑھے بوڑھے آدمی شوق و ذوق میں اپنے رب کا کلام کھڑے ہو کر سنتے ہیں، کبھی دنیا میں کوئی کتاب اس ادب کے ساتھ نہیں سنی گئی۔ شب میں ایک تہائی یا اس سے زیادہ وقت تک تراویح میں مشغول رہتے ہیں۔

اب دو تہائی یا اس سے کم رات رہ گئی، اس میں سوتا ہے، اسی میں سحری کا انتظام کرتا ہے، اسی میں سحری پکاتا ہے اور کھاتا ہے۔ اب اتنے وقت میں اگرچہ پابندیاں اٹھا

دی گئی ہیں مگر تھکا اور ماندہ بدن سونا چاہتا ہے۔ لذائذ نفسانیہ کی طرف طبیعت کو میلان ہی نہیں ہوتا بلکہ بہت سے بندگانِ خدا ایسے ہیں جو تھوڑی دیر سو کر اٹھ جاتے ہیں اور شب کا بقیہ حصہ نمازِ تہجد یا تلاوتِ قرآنِ پاک میں صرف کرتے ہیں۔ بہت سے رمضان مبارک کی شب میں سوتے ہی نہیں اور تمام رات طاعت الٰہی میں بیدار رہتے ہیں۔ یہ روزہ کی شان ہے کہاں یہ زہد آفرین عبادت اور کہاں پنڈت جی کا برت' اس میں نفس کو تعب ہی کیا ہے اور پھر وہ کوا کب پرستی ہے' یہ خدا پرستی۔

یہ پنڈت جی کے حوصلہ کی بات ہے کہ انہوں نے روزہ کے مقابل برت کا ذکر کر دیا اور پھر آپ کو روزہ پر یہ اعتراض بھی ہے کہ روزہ دار کو شب میں کھانے اور پینے اور مقاربت کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس اعتراض سے پنڈت کا منشا کیا ہے۔ کیا آپ کی عقل و دانائی یہ چاہتی ہے کہ مہینہ بھر تک تمام اوقات روز و شب میں کھانے پینے اور تمام ضروریات زندگی سے روک دیا جائے۔ ایسا حکم وہی دے سکتا ہے جو عقل سے کورا اور علم سے عاری ہو جس نے جاندار کو پیدا کیا ہے' وہ اس پر تکلیف کا اتنا ہی بار رکھے گا جتنا کہ برداشت کی قوت اس کو عطا فرمائی ہو گی۔

مہینہ بھر تک اس طرح بھوکا پیاسا رکھنا' روزہ اور عبادت تو نہ ہوا قتل و ہلاک ہو گیا اور اگر پنڈت جی کے نزدیک یہی عبادت ہے تو انہیں بتانا چاہیے تھا کہ ان کے مذہب نے ایسے برت کی تعلیم دی ہے جس میں مہینہ بھر تک خورد و نوش اور آسائش حیات کے اسباب ترک کر دیے جائیں' کبھی آریوں سے ایسا برت رکھا کر دنیا کے سامنے ایک نظیر تو پیش کی ہوتی تاکہ یہ سمجھ میں آتا کہ پنڈت جی جو بات کہہ رہے ہیں' ممکن العمل تو ہے لیکن اگر پنڈت جی نے ایسا برت جاری کیا ہوتا اور آریہ مان بھی لیتے تو آریوں کا صفحہ ہستی پر نام و نشان باقی نہ رہتا' لیکن پنڈت جی نے ایسے برت کا حکم نہ دیا اور جب ان کے نزدیک برت کی یہی شان ہونا چاہیے تھی تو اپنے گھر والوں کے لیے یہ حکم نہ دینا کیا معنے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ معترض کی نظر میں بھی اس کا اعتراض محض باطل ہے۔

اب رہی یہ بات کہ کھانے پینے کی اجازت دے دی جاتی' مقاربت کی اجازت

کیوں دی گئی؟ مذکورہ بالا بیان سے اس کی حکمت بھی ظاہر ہے لیکن مزید تفہیم کے لیے، پھر شرح بیان کر دیا جاتا ہے کہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے، تمام اقوام، تمام بلاد پر اس کا حکم نافذ ہے، اس میں مختلف قوت اور مختلف طاقت کے لوگ اس کے زیر حکم ہیں۔ ایسے عالمگیر دین کے احکام اس قدر وسیع اور حکیمانہ ہونے چاہئیں کہ عالم کی کسی نسل و قوم کے انسان کو اس پر عمل ناممکن و متعذر نہ ہو جائے۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو زندگی بھر مقاربت نہ کریں تو ان کو پرواہ بھی نہ ہو اور ایسے بھی ہیں جنہیں ہفتہ دو ہفتہ صبر کرنا بھی دشوار ہے اور ان کی طاقت انہیں مجبور کر دیتی ہے۔ ایسی حالت میں سب کے لیے ایک ماہ تک ترک مقاربت کا حکم دینا حکمت کے خلاف تھا۔ اس لیے حکیم مطلق نے اس کی اجازت دی، تاکہ تمام دنیا اس پر عمل کر سکے اور روزہ کسی قوم اور کسی نسل کے لیے بھی ناممکن نہ ہو جائے۔

علاوہ بریں یہ بھی حکمت ہے کہ اتنی طویل مدت تک ترک مقاربت کا حکم دینے سے ایسا نہ ہو کہ قوی انسان غلبہ خواہش سے رات دن اسی خیال میں رہیں اور تخیلات فاسدہ روحانیت کو ترقی کرنے سے مانع ہو، اس اجازت میں یہ فائدہ ظاہر ہے کہ انسان کو روزہ کی حالت میں فارغ القلب اور شہوات کی امنگیں ایک سیلاب کی طرح امنڈ کر اس کے ذوق طاعت کو خراب نہ کر سکے گی اور توجہ الی اللہ یکسوئی کے ساتھ حاصل رہے گی۔ معترض بے چارہ ان حکمتوں کو کیا جان سکتا ہے یہ تو سالک و عارف کے سمجھنے کی باتیں ہیں۔

ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اسی سلسلہ اعتراض میں پنڈت نے یہ بھی کہا ہے کہ دن کو نہ کھایا، رات کو کھاتے رہے۔ یہ بات تو قانون قدرت کے خلاف ہے۔ پنڈت کے ہوا خواہ بتائیں کہ ایسا قانون قدرت پنڈت جی کو کہاں ملا، اس کا کچھ حوالہ تو بتایئے پتا تو دیجئے۔ یہ قانون قدرت کس نے بنایا، خود پنڈت جی نے بنایا تو ایشور پر اس کی پابندی کیسے لازم ہوئی اور اگر ہوئی تو ایشور پنڈت جی کے حکم کا مطیع ہوا اس فرمانبردار کو کس طرح ایشور کہا جائے؟ عجب مذہب ہے جس میں بندہ حکمران ہے اور ایشور فرمانبردار اور پھر یہ عجب بات ہے کہ جو

چیز پنڈت جی کے عقیدہ میں قانونِ قدرت کے خلاف ہے یعنی ان کے اعتقاد میں ایشور کے اختیارات سے باہر ہے' اس کو صدہا سال سے مسلمان کر رہے ہیں اور ایشور کی قدرت اس کو روکنے سے عاجز ہے۔ عجب سروشکتی مان ہے کہ جو کام بندہ کر سکے وہ ایشور سے نہ ہو سکے۔

پنڈت جی کا اعتراض ہے بہت معنی خیز۔ کیسے کیسے لطف دیئے ہیں اور کیا کیا کمالات اپنے عقل و فہم کے دکھائے ہیں؟ اب یہ بھی غور کرنا ہے کہ دن کو نہ کھانا اور رات کو کھانا اصولِ طب کے بھی خلاف نہیں ہے' اگر ہوتا تو وہ مسلمان روزہ رکھ کر اپنی تندرستی سے ہاتھ دھو بیٹھتے مگر مسلمانوں کی تندرستی بحمد اللہ ہندوؤں سے زیادہ بہتر ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا طریق عمل طب کے خلاف نہیں' پھر وہ قانونِ قدرت کس اصول سے بنتا ہے کہ دن کو نہ کھانا اس کے خلاف ہو گیا' انسان کو بسا اوقات ایسی صورتیں پیش آجاتی ہیں کہ دن کو کھانا نہیں ملتا یا کھانے کا موقع میسر نہیں آتا' اگر کبھی آریہ کو ایسا اتفاق ہو جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ رات کو بھی کھانا نہ کھائے' ورنہ پنڈت جی کے نزدیک قانونِ قدرت کے خلاف ہو جائے گا اور جب پورے چوبیس گھنٹے کھانا نہ کھایا تو اگلے روز کھانا تو پنڈت جی کے نزدیک قانونِ قدرت کے خلاف ہی نہیں' بلکہ قانون شکنی ہو گا۔ تو یہ نتیجہ نکلا کہ اگر کسی آریہ کو ایک وقت کھانا نہ ملے تو تا زندگی کھانے سے محروم کر دیا جائے۔

پنڈت جی کے بنائے ہوئے مذہب پر عمل کریں تو آریوں کو بہت جلد ایشور کی بھی سول نافرمانی کرنی پڑے اور پورا پورا ہی سوراج مل جائے اور اگر آریوں کو بہت جلد ایشور کا پاس کیا اور ایشور کے حکم کو نہ لوٹنے دیا تو ایشور کے لیے آریوں کا دنیا میں زندہ رکھنا محال ہو جائے گا۔ یہ ہیں نتیجے پنڈت جی کے اس دعوے کے دن میں نہ کھانا اور رات کو کھانا خلافِ قانونِ قدرت ہے۔ اس میں پنڈت جی خلافِ قانونِ قدرت کس کو کہتے ہیں؟ دن میں نہ کھانے کو یا رات میں کھانے کو' اگر رات کے کھانے کو غلط کہیں تو غلط ہے۔ تمام دنیا اس کے خلاف عامل ہے' ہر ملک میں' ہر مذہب و ملت کے لوگ رات کو کھاتے ہیں اور رات کے کھانے سے نہ بیمار ہوتے ہیں' نہ مرتے ہیں تو اس کو خلافِ

قانونِ قدرت کہنا باطل ہے۔

رہا دن میں نہ کھانا تو یہ کون سے قانونِ قدرت کے خلاف ہے اور جو برت پنڈت جی تجویز کرتے ہیں اس میں بھی نہ کھانے کا کچھ نہ کچھ التزام تو ہے ہی، خواہ رات میں ہو یا دن میں ہو، وہ کیوں خلافِ قانونِ قدرت نہیں۔ کیا انسان کو ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہنا قدرت نے لازم کیا ہے۔ ایسا ہو تو مریضوں کے پرہیز بھی خلافِ قانونِ قدرت ہو جائیں۔ روزہ بھی ایک طرح کا پرہیز ہے، دوسرے پرہیز جسمانی صحت کے لیے ہوتے ہیں، یہ رُوحانی قوت کے لیے ہے۔ ہر چیز کو خلافِ قانونِ قدرت کہنا ایک لایعنی دعویٰ ہے جس کو کوئی ثبوت و تائید بہم نہیں پہنچتی۔

○ ○ ○

پنڈت جی نے آیہ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ سے چند آیتیں قطع و برید کر کے لکھیں اور ایسے ہی بے جوڑ ترجمہ اس طرح لکھا: "اللہ کی راہ میں لڑو، ان سے جو تم سے لڑتے ہیں، مار ڈالو تم ان کو جہاں پاؤ، قتل سے کفر بُرا ہے یہاں تک ان سے لڑو کہ کفر نہ رہے اور ہووے دین اللہ کا۔ انہوں نے جتنی زیادتی کی تم پر، اتنی ہی زیادتی تم ان کے ساتھ کرو۔"

اعتراض: اس تراشیدہ قطع برید کیے ہوئے ترجمہ پر پنڈت جی نے یہ اعتراضات کیے: اگر قرآن میں ایسی باتیں نہ ہوتیں تو مسلمان لوگ اتنا بڑا ظلم جو کہ غیر مذہب والوں پر کیا ہے، نہ کرتے۔ بلاقصور کسی کو مارنا سخت گناہ ہے، ان کے نزدیک مذہب اسلام کا قبول نہ کرنا کفر ہے اور کفر سے قتل کو مسلمان لوگ اچھا مانتے ہیں یعنی کہتے ہیں کہ جو ہمارے دین کو نہ مانے گا اس کو ہم قتل کریں گے، چنانچہ وہ ایسے ہی مذہب والوں سے ظلم کرنا سکھاتا ہے، ان سے پوچھنا چاہیے کہ کیا چوری کا عوض چوری ہی ہے، جتنا نقصان ہمارا چور وغیرہ چوری سے کریں، کیا ہم بھی ان کا چوری سے کریں؟ یہ بالکل بے انصافی کی بات ہے۔ کیا کوئی جاہل ہم کو گالیاں دے تو ہم بھی اس کو گالیاں

دیں۔ یہ بات نہ خدا کی نہ خدا کے معتقد عالم کی، نہ خدا کی کتاب کی ہو سکتی ہے، یہ تو صرف خود غرض لاعلم آدمی کی ہے۔

جواب: جھوٹ، افتراء و بہتان ایسے عیوب ہیں جن کو دنیا کا ہر نیک طبیعت آدمی ذلیل اور ہر تنگ انسان سمجھتا ہے۔ جس دین کے بانی یا حامی اپنے دین کو رواج دینے کے لیے جھوٹ سے کاربرآری کرنے پر مجبور ہوں اور دوسرے کسی دین سے نفرت دلانے کے لیے ان کے پاس افتراء و بہتان کا ہی آلہ ہو اسی کو وہ کام میں لاتے رہے ہوں، ایسے مذہب کے باطل ہونے پر خود ان کا طریقہ عمل گھر کا گواہ ہے جس کی شہادت پر کوئی جرح نہیں ہو سکتی۔ پنڈت جی کا یہی دستور اور طریقہ ہے کہ وہ دوسرے ادیان کو بالخصوص اسلام کو جھوٹے، غلط، خلافِ واقع بہتانوں سے متہم کر کے اپنی قوم کو اس سے روکنا چاہتے ہیں، انھیں اندیشہ لگا ہوا ہے کہ اسلام کی تعلیمیں دنیا کو اپنی طرف جذب کر لیں گی، اس لیے وہ اور دوسرے کفار کی طرح اسلام کو بدنام کرنے کے لیے جھوٹے بہتان لگانے پر مجبور ہیں۔ کیا ستم ہے کہ قرآن پاک کی آیتوں میں قطع برید کر ڈالی اور پھر قطع برید کرنے کے بعد بھی جو کچھ باقی رہا وہ اصلاً قابلِ اعتراض نہ تھا۔ اس کو کوسا، بُرا کہا، خلافِ تہذیب و انسانیت کلمات لکھے، طوفان اٹھائے، بہتان گھڑے۔ غرض جو کچھ ان کا ضمیر اجازت دیتا تھا وہ سب کچھ کیا اور حق کا مقابلہ کرنے والے کی یہی حالت ہوتی ہے۔

اب پنڈت جی کے اعتراضات جدا جدا لکھ کر جواب دیا جاتا ہے۔

فقرہ منسوب بقرآن پاک: "اللہ کی راہ میں لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مار ڈالو تم ان کو جہاں پاؤ۔"

اعتراض: "اگر قرآن پاک میں ایسی باتیں نہ ہوتیں تو مسلمان اتنا بڑا ظلم جو کہ غیر مذہب والوں پر کیا ہے، نہ کرتے۔ بلا قصور کسی کو مارنا سخت گناہ ہے۔"

جواب: قرآن کریم میں ارشاد فرمایا تھا:

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ	خدا کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے نہ گزرو۔ اللہ تعالیٰ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا

وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔

اور انہیں قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا اور فتنہ قتل سے سخت تر ہے۔

پنڈت جی تو یہ اُڑا گئے کہ حد سے نہ گزرو، اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور یہ بھی کہ انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا، درمیان سے جملے کم کرنے کے بعد بھی جو باقی رہا اس پر اعتراض ناممکن تھا، اس لیے ان کو طوفان اٹھانا، بہتان باندھنا پڑا کہ اگر قرآن میں ایسی باتیں نہ ہوتیں تو مسلمان اتنا بڑا ظلم جو کہ غیر مذہب والوں پر کیا ہے، نہ کرتے۔ اسی اعتراض میں دو بہتان ہیں: پہلا یہ کہ قرآن پاک نے معاذ اللہ ظلم کی تعلیم دی، باوجودیکہ اس کی تعلیم سراسر حق و عدل، یہ فرمایا ہے کہ تم ان سے مقاتلہ کرو جو تم سے مقاتلہ کرتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ تو کیا پنڈت جی کا یہ مطلب تھا کہ کفار مسلمانوں کو قتل کریں تو تب بھی ہتھیار نہ اٹھائیں، خاموشی سے قتل ہو جائیں۔ جو قوم محارب ہو کر دراز دستی کرے اس کے مقابلہ کی اجازت دینا اور اس مقابلہ میں کسی حد سے تجاوز نہ ہونے پائے، اس کا لحاظ رکھنا انتہا درجہ کا عدل ہے، اس منصفانہ حکم پر یہ بہتان اٹھانا کہ قرآن پاک نے ظلم کی تعلیم دی، قرآن پاک پر نہایت قبیح افترا ہے۔

دوسرا افترا یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں پر بڑا ظلم کیا۔ مسلمانوں نے ہمیشہ ہندوؤں کے ساتھ ایسے سلوک کیے کہ اگر وہ تلاش کریں تو پچھلے زمانہ کے ہندوؤں نے بھی ان کے ساتھ ویسے سلوک نہ کیے ہوں گے، ریاستیں انہوں نے بخشیں، جاگیریں انہوں نے عطا کیں، عہدے اور منصب انہوں نے دیئے اور آج تک مسلمانوں کے دیئے ہوئے عطیے ان کے پاس موجود ہیں اور وہ ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن یہ آپ کی قوم کی خصلت ہے۔ خواہ اس کو اچھا کہئے کہ وہ محسن کی سپاس گزاری تو درکنار، اس کے درپے آزار ہو جاتے اور مسلمانوں کو ظالم بتاتے ہیں۔ یہ بات بڑی ناسپاسی اور دنائت کی ہے اور اگر واقعات کا تجسس کیا جائے تو ثابت ہو گا کہ مسلمانوں نے اپنی سلطنت کے

عہد میں جس وقت ہندوؤں کے ساتھ بہت کریمانہ سلوک کیے' اس وقت بھی یہ ناسپاس قوم شوریدہ سری کرتی ہی رہی۔ روزمرہ ہندوستان کے کسی نہ کسی گوشہ سے فتنہ اٹھتا رہتا تھا اور کوئی نہ کوئی قوم سر اٹھاتی رہتی تھی' اس پر مسلمانوں کو ظالم کہنا کیا طوفان ہے۔

ان دو بہتانوں پر اس اعتراض کا دارومدار ہے لیکن اگر شانِ محقق کے خلاف نہ ہو تو پنڈت جی ذرا گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں' ان کے مذہب نے کیسی کیسی ستم گاریاں سکھائی ہیں اور ہندوستان کی سرزمین میں ہندو کیسے کیسے لرزہ خیز مظالم کر رہے ہیں۔

خود پنڈت جی ستیارتھ پرکاش کے چھٹے باب میں سبھاپتی یعنی کونسل کے پریذیڈنٹ یا بادشاہ کے لیے یہ اوصاف تحریر کیے ہیں: بجلی کی مانند فی الفور قابو پانے والا' بد چلن لوگوں کو خاک کر دینے کے لیے آگ جیسا ہو۔ شریروں کو طرح طرح سے باندھنے' قید کرنے والا ہو۔ (صفحہ ۱۸) عاقل لوگ تعزیر ہی کو کہتے ہیں۔ شک نہیں کہ بلا تعزیر سب ورن مذموم ہو جائیں اور سب انتظام درہم برہم ہو جائے۔ (ص ۱۸۲)

یہ تو بادشاہ کے اوصاف کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے جو پنڈت جی حملہ آور دشمن کی مدافعت کو بھی ظلم قرار دیتے ہیں۔ وہی بادشاہ کا یہ ستم گاریاں سکھانا آئین عدل جانتے ہیں' اس دانائی اور انصاف پر افسوس' تعصب کی یہ کار فرمائی ہے کہ پنڈت جی کو دوسرے کی خوبی بھی عیب نظر آئے اور اپنے عیوب بھی اچھے معلوم ہوتے۔ لڑنے والے سے لڑنا آپ نے قابلِ اعتراض قرار دیا اور اسی منہ سے اسی کتاب ستیارتھ کے صفحہ ۱۹۳ میں لکھتے ہیں: جب رعایا پرور راجہ کو کوئی اپنے سے چھوٹا' خواہ برابر کا' خواہ بڑا' جنگ کے لیے طلب کرے تو کشتریوں کے دھرم کو یاد کر کے میدانِ جنگ میں جانے سے ہرگز پہلوتہی نہ کرے' بلکہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان سے اس طرح جنگ کرے جس سے اپنی فتح ہو۔

اس طرح جنگ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ چاہے دغا کرنی پڑے' دھوکا دینا' یہ سب کچھ دشمن پر غلبہ پانے کے لیے کر گزرنا چاہیے چنانچہ پنڈت جی اس کے بعد ہی

لکھتے ہیں: "جو راجہ لوگ میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خواہش میں ہیں، خوف سے پیٹھ نہ دکھا کر اپنی تمام طاقت سے جنگ کرتے ہیں، وہ راحت کو پاتے ہیں، اس سے کبھی ہلنا نہیں چاہیے۔ ہاں کبھی کبھی دشمنوں کو مغلوب کرنے کی غرض سے ان کے سامنے سے چھپ جانا واجب ہے کیونکہ جس ڈھنگ سے دشمن کو مغلوب کر سکیں، وہی کام کرنے چاہئیں۔"

یہ ہیں ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ مسلمانوں کے لیے تو دشمن کی مدافعت بھی قابلِ اعتراض اور اپنی خود غرضی کے لیے دھوکے اور فریب تک کام میں لانے کی تعلیم کرتے ہیں۔ اس مضمون کی مزید شرح دیکھنی ہو تو پنڈت کا یہ کلام دیکھیے جو ص ۱۹۸ میں لکھتے ہیں:

جنگلی بگلا تصور باندھے ہوئے مچھلی کے پکڑنے کو تاکتا رہتا ہے، دل سے ضروریات کی فراہمی کے لیے غور کیا کرے، دولت وغیرہ چیزوں اور طاقت کو بڑھا کر دشمن کو فتح کرنے کے لیے شیر کی مانند طاقت کو کام میں لائے اور چیتے کی مانند چھپ کر دشمن کو پکڑے۔ نزدیک آئے ہوئے طاقتور دشمن سے خرگوش کی مانند دُور بھاگ جائے اور بعد ازاں اِن کو حکمت سے پکڑے۔"

یہی پنڈت صاحب جو مسلمانوں کی مدافعانہ و منصفانہ جنگ پر معترض ہیں، اپنی کتاب میں اپنی قوم کو کیا کیا خونخوار سفاکیاں سکھاتے ہیں، عدل و انصاف تو کیا؟ سچائی اور دیانت داری کو بالائے طاق رکھ کر، دشمن کے ساتھ چال اور فریب کی تلقین و تعلیم کرتے ہیں۔ دو ایک تعلیمیں اور ملاحظہ فرمایئے، ستیارتھ ص ۲۰۵ میں لکھتے ہیں:

"دشمن سے میل کر کے وقت مناسب تک صبر کرے، دنیا کو آنکھیں کھول کر

اس تعلیم پر غور کرنا چاہیے اور اگر اپنی جان عزت عزیز ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہندوؤں کا میل دوستی و محبت نہیں ہے جس پر مغرور ہو کر اپنی حفاظت سے غافل ہو جانا درست ہو، وہ میل بھی کرتے ہیں تو پالیسی سے موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ اس میل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن کو غافل کر لیا جائے اور آپ اندرونی تیاری کرتے رہیں اور موقع پا کر غافل دشمن کو ہلاک کر ڈالیں۔"

ان چھٹکیوں کو دیکھ کر بھی جس کو ہوش نہ آئے اور ہندوؤں کے ظاہری میل سے دھوکا کھائے مسلمان کے برابر بے وقوف کون ہے۔ پنڈت جی اسی صفحہ میں لکھتے ہیں:

"جب فوج میں طاقت یا بار برداری کی کمی ہو تو دشمنوں کو بہ تحمل تمام کوشش کر کے ٹھنڈا کرے۔"

یہ ہے ہندوؤں کی نرمی اور اظہار موافقت کی حقیقت۔ اپنی کمزوری کے وقت دشمن کو دوست بنانا اور اس کو مغالطہ میں رکھ کر اپنے آپ ہر دم مقابلہ کی تدابیر میں رہنا اور جب طاقت آ جائے تو پھر اس نمائشی دوستی کا انجام یہ ہے جو پنڈت صاحب اسی صفحہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب اپنی طاقت یعنی فوج کو خوش اور مضبوط دیکھے اور دشمن کی طاقت برخلاف اس کے کمزور ہو جائے، تب دشمن کی طرف جنگ کرنے کے واسطے کوچ کرے۔

اب اس میل پر محبت کا نتیجہ نکل آیا، جو لوگ ہندوؤں کو اپنی طرح صاف دل سمجھتے اور ان کی خوشامد میں آ کر انہیں دوست سمجھ بیٹھے ہیں، وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں، انہیں اچانک معلوم ہو گا کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو برباد کیا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ یہ قوم اپنے محسن کو بھی چھوڑنے والی نہیں حتیٰ کہ پنڈت جی صفحہ ۲۰۶ میں لکھتے ہیں کہ

"جس کی پناہ لی ہو اس کے کاموں میں نقص دیکھے تو اس سے بھی اچھی طرح بلا اندیشہ جنگ ہی کرے۔"

جان بچانے اور پناہ دینے والے کے لیے یہ سلوک ہیں تو ایسی قوم پر اعتبار کرنے والا کس قدر نادان و بے خرد ہے۔ اسی ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۰۸ میں لکھتے ہیں:

"اپنی طاقت کو مکمل کر کے اور کوئی خاص مقصد مشہور کر کے دشمن کے شہر کے نزدیک آہستہ آہستہ جائے۔"

یعنی بے خبری میں حملہ کرے اور دشمن کو مغالطہ دے کہ یہ کسی اور مقصد کی تیاری کر رہے ہیں، انسان کا شکار کھیلنے کے لیے کیا کیا حیلے تعلیم کیے جا رہے ہیں۔ ہندو پنڈت صاحب کی اس تعلیم پر پورا پورا عمل کرتے ہیں۔

پنڈت صاحب کی رحم دلی کا کچھ اور بھی اندازہ کرنا ہو تو ستیارتھ کا صفحہ ۲۱۰ دیکھیے جہاں وہ لکھتے ہیں کسی وقت مناسب سمجھے تو دشمن کو چاروں طرف سے گھیر کر روک رکھے اور اس کے ملک کو تکلیف پہنچا کر چارا خوراک پانی اور لکڑی کو تلف و خراب کر دے۔ اسی کے آگے لکھتے ہیں، دشمن کے تالاب شہر کی فصیل اور کھائی کو توڑ پھوڑ دے۔ رات کے وقت ان کو خوف دینے اور فتح پانے کی تجاویز کرے۔ پنڈت صاحب کی تعلیموں کا یہ مختصر نمونہ پیش کیا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے قرآن کریم کی منصفانہ تعلیم پر اعتراض کرنا جس میں دشمن حملہ آور ہو تو مسلمانوں کو مردانہ وار ان کی مدافعت کی اجازت دی گئی ہے اور ساتھ ہی حد سے تجاوز کرنے کی ممانعت فرمادی ہے، عاقلوں کے نزدیک نہایت شرمناک اعتراض ہے۔

○ ○ ○

اعتراض کا دوسرا فقرہ: ان کے (یعنی مسلمانوں کے) نزدیک مذہب اسلام کا قبول نہ کرنا کفر ہے اور کفر سے قتل کو مسلمان لوگ اچھا جانتے ہیں۔ یعنی کہتے ہیں کہ جو ہمارے دین کو نہ مانے گا اس کو ہم قتل کر دیں گے۔ چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے ہیں اور مذہب کی خاطر لڑتے لڑتے اپنی سلطنت وغیرہ کھو کر برباد ہو گئے۔

جواب: یہ پنڈت جی کے اعتراض کا دوسرا جزو ہے، وہ مذہب قبول نہ کرنے کو کفر قرار دینا اور کافر کے قتل کو اچھا جاننا دونوں باتیں قابلِ اعتراض اور غلط قرار دیتے ہیں، تو ان کے نزدیک عدل و انصاف یہ ہے کہ مذہب کے قبول نہ کرنے والوں کو کافر بھی لکھا جائے۔ یہ تو گمان نہیں ہے کہ پنڈت صاحب اس قدر جاہل ہوں گے کہ کافر کے معنی بھی نہ جانتے ہوں گے۔ لفظ مشہور ہے خواص و عوام کی زبان زد ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام کے نہ ماننے والے کو کافر کہتے ہیں۔ تو کیا پنڈت جی کے نزدیک انصاف اور سچائی اس کا نام تھا کہ اسلام کے نہ ماننے والے کو بھی اسلام ماننے والا اور مسلم کہا جاتا۔ کیا آپ جھوٹ بولنے کو پسند کرتے ہیں اور مسلمانوں پر اس لیے اعتراض کرتے ہیں کہ

انہوں نے سچ بول دیا اور اسلام سے انحراف کرنے والے کو کافر یعنی منکر اسلام کہہ دیا۔ یہ کس اصول سے جرم ہوا؟ کس طرح لائق اعتراض ٹھہرا؟ کیا پنڈت جی ویدک دھرم کے نہ ماننے والے کو ادھرمی اور وجود الٰہی کے منکر کو ناستک نہیں کہتے ہیں؟ کتاب کی کتاب ان کے سخت ترین الفاظ سے بھری ہوئی ہے، مسلمانوں اور عیسائیوں کو بُرا کہنے میں انہوں نے کیا کمی کی ہے۔ شودر کا لفظ اور اس کے احکام تو ویدوں میں بھی آئے ہیں، ملکش آپ کی رات دن کی بول چال ہے، اگھوری اور مارگیوں پر جو عنایتیں آپ نے کی ہیں اور پنڈتوں اور برہمنوں کی جس طرح اہانتیں آپ کے قلم سے ہوئی ہیں، اس کے نقشے اسی ستیارتھ میں موجود ہیں۔ تہذیب کے خون بہانے کے بعد ایک سچے لفظ کافر پر آپ نے اعتراض کر دیا، کوئی وجہ اعتراض کی تو بیان فرمائی ہوتی۔

کافر کا لفظ گالی نہیں ہے، اس کے معنی کسی کے نسب، ذات یا قوم پر طعنہ کرنا نہیں ہے۔ اسلام کے نہ ماننے والے کو کافر کہتے ہیں اس پر آپ کو کیا اعتراض؟ اور ایسے لایعنی اعتراضوں سے کتاب بھر دی، پھر جھوٹی رعایت بھی کراتے ہیں آپ تو ادھرمی کی خدا کے منکر کی دین والوں کے نزدیک تو سب سے بڑا مجرم دین کا مجرم ہے۔ آپ کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ مسلمان کافر کے قتل کو اچھا کہتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جو ہمارے دین کو نہ مانے گا ہم اس کو قتل کریں گے۔ یہ آپ کی ناواقفیت کی بات ہے، تمام کفار کے لیے قتل کا حکم نہیں ہے۔

اہل ذمہ کے ساتھ مسلمان وہی سلوک کرتے ہیں جو مسلمان کے ساتھ کرتے ہیں، یہی شریعت نے بتایا ہے۔ ذمی کفار مسلمانوں کی سلطنت میں آسائش کے ساتھ رہتے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا اور بقول پنڈت جی کے مسلمانوں کے یہاں تمام کفار کا قتل ضروری ہوتا اور وہ اپنی سلطنت میں ایسا کرتے ہی رہے ہوتے تو آج بھارت ورت میں ہندو جنتا کا نام نہ ہوتا۔ صدیوں تک اس ہندوستان میں مسلمانوں نے جرأت کے ساتھ حکمرانی کی۔ اتنے طویل عرصہ میں اگر بتدریج قتل بھی ہوتا تو ہندوؤں کا نام و نشان نہ رہا ہوتا مگر ہوا یہ کہ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کو عزتیں دیں، منصب دیئے، عہدے دیئے، فراخ دلی کے ساتھ وزارت کے جلیل منصبوں پر متمکن کیا،

ریاستیں دیں، حکمرانی بخشی، اس پر بھی ان کے ساتھ دغا کی گئی اور انہوں نے اپنے اس طریق عمل میں تبدیلی نہ کی اور تنگ دلی کا داغ گوارا نہ کیا۔

اس پر کہتے ہیں کہ وہ ایسا ہی کرتے رہے ہیں اگر وہ ایسا کرتے رہے ہوتے تو آپ ایسا کہنے والے ہی نہ ہوتے۔ یہ کلم آپ نے کیے ہیں۔ ہندوستان کی قدیم اقوام کو آپ نے تاخت و تاراج کیا ہے۔ تم نے انہیں قتل کیا، تم نے انہیں غلام بنایا، تم نے انہیں آبادیوں سے ویرانوں کو نکالا، تم نے ان کا نام دیو اور راکھشس رکھا، تمہارے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے انہیں درندوں بھرے جنگلوں کے سوا کہیں پناہ نہ ملی۔ آج تک وہ اسی خانہ بدوشی و ویرانی کی زندگی کا عذاب بھگت رہے ہیں۔ بھیل، بھانتو، ہبوڑے، کنجر، نٹ، ماڑے، جوانگ یہ سب آپ ہی کے ممنونِ احسان ہیں کہ دنیا ترقی کرتی چلی جا رہی ہے اور انہیں اس وقت تک بھی گھر در کیا، جھونپڑی تک بھی میسر نہیں ہے۔ وہ جنگل کے وحشی جانوروں سے زیادہ خراب زندگی جیتے ہیں، آپ بھلا ان کا جرم تو بتائیے۔ منوسرتی میں، اور وید میں ان کی خطا صرف یہی تو بتائی گئی ہے کہ وہ چار قوموں سے باہر اور ایشور کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔

عاقلِ دنیا کے نزدیک سفاکی اور ظلم کا یہ بہانہ لاکھوں نفرتوں کا مستحق ہے۔ محض اپنی قوم نہ ہونے کی وجہ سے کسی کا خون مباح کر دینا چاروں قوموں میں سے نہیں ہے۔ اس لیے اسے غلام بنانا جائز ہو گیا۔ وہ دیکھے تو اس کی آنکھ نکالنا حلال کر دیا گیا۔ بلی اور کتے کے ساتھ بھی یہ سلوک نہیں کیا جاتا، اگر محنت مشقت کر کے وہ کچھ پیسے جمع کر لے تو آپ کے دھرم کا حکم ہے کہ اسے مفلس کر دو، پیسے چھین لو، وہ کسی مال کا مالک نہیں ہو سکتا۔ ایشور نے اسے غلامی ہی کے لیے بنایا ہے، آپ نے اپنے ساتھ ایشور کو بھی اس ظلم میں شریک کر لیا۔ آپ کی تاریخیں خونخوارنہ مظالم سے بھری ہوئی ہیں، اس کے باوجود آپ اسلام جیسے عدل و انصاف کے دین پر اعتراض کریں۔

اسلام میں جس طرح ذمی کافر کو امن ہے، ایسے ہی مستامن کو بھی پناہ دی جاتی ہے اور وہ بادشاہ اسلام کی حفاظت و ذمہ داری میں امن و امان کے ساتھ رہتا ہے، کوئی اس کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اسی طرح جزیہ دینے اور اطاعت کرنے والوں پر تلوار نہیں

اٹھائی جاتی، عورتوں، بچوں، بوڑھوں کے قتل کی ممانعت ہے۔ قتال کس سے کیا جاتا ہے؟ صرف اس سے جو کارسازِ عالم سے باغی ہو، مسلمانوں کے درپے ایذاء و آزار ہو، نہ اطاعت قبول کرے نہ جزیہ دے، نہ امن چاہے۔ سرکش متکبر بنا ہوا مسلمانوں کے خلاف درپے جنگ ہو۔

یہ مضمون خود اس آیت میں موجود تھا جس پر پنڈت صاحب نے اعتراض کیا: و قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم۔ پنڈت نے خود اس کا ترجمہ کیا ہے: "اللہ کی راہ میں لڑو، ان سے جو تم سے لڑتے ہیں۔" دنیا میں کون عاقل کہے گا کہ محارب جنگجو کے سامنے سر جھکا کر گردن کٹوا لینا دانائی ہے۔ جب ایک قوم کسی جماعت پر چڑھ کر آئے تو اپنے تحفظ و بقاء کے لیے اس کی مدافعت ضروری ہو جاتی ہے۔ اب مدافعت کرنے والا کسی عاقل کے نزدیک موردِ الزام نہیں ہو سکتا۔

کیا پنڈت جی اور ان کے ہمنوا گوارا کرتے ہیں کہ اگر کوئی قوم ان پر حملہ آور ہو تو خاموشی کے ساتھ گردنیں کٹا کٹا کر مر جائیں اور اس کی مدافعت نہ کریں۔ جب یہ اپنے لیے گوارا نہیں، عالم کی کوئی قوم گوارا نہیں کرتی تو ایسی جنگ کس طرح قابلِ اعتراض ہو سکتی ہے۔

آیت میں ایک بڑا مزیدار کلمہ فی سبیل اللہ کا بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جنگ کا مقصد نہ مال و دولت اور سلطنت و حکومت کی طمع ہوتی ہے، نہ اقطاعِ ارض پر قبضہ، نہ زر و جواہر کا لالچ، نہ غضبانی جذبہ۔ ان کی جنگ نفسانیت سے بالکل پاک اور للہیت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس وصف میں مسلمان تمام دنیا سے منفرد ہیں اور سارے جہاں میں یکتا ہیں کہ ان کے تیغ و سنان کو دنیوی مقاصد کے لیے حرکت نہیں ہوتی۔ وہ سر کٹاتے اور خون بہاتے ہیں تو اللہ کے لیے، دین کے لیے، سچائی اور راست بازی کے لیے، حقانیت و خدا پرستی کے لیے، یہ بات تو دنیا کی ہر قوم کو پانی پانی کیے دیتی ہے جنگ کا ایسا پاک جذبہ اسلام کے سوا عالم میں کس نے بتایا ہے؟ یہ مقام اور یہ پاک حال کس قوم کو میسر آیا ہے جو لڑا نفس کے لیے، لڑا جوشِ غضب میں انتقام کے لیے، لڑا طمعِ دولت و مال کے لیے، لڑا حرص کے لیے، انسانی خونوں کی ندیاں بہائیں، ایسا

خراب حال شخص اس پیکر تقدس پر معترض ہو جس نے جنگ جیسا ہولناک میدان بھی ہمیشہ للہیت اور خدا پرستی کے جذبوں سے طے کیا ہو تو اس معترض پر ہزار بار نفرین۔ وہ طمع کا اندھا زاہد، پاکباز پر اعتراض کرے، یہ منہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

پھر پنڈت جی اور ان کے ہمنواؤں سے پوچھئے کہ اس اعتراض نے آپ کی عزت پر کیا اثر ڈالا۔ آپ ایک آدمی کی جان کے بدلے میں قاتل کا خون بہا دیتے ہیں، اس کو عدل و انصاف کہتے ہیں مگر کیسے خدا شناس ہیں، کیسے خدا پرست ہیں کہ خدا کے منکر کے قتل پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں، اعتراض کرتے ہیں تو آپ کے نزدیک خدا کی اتنی عزت ہے، ایشور کا اتنا مرتبہ ہے کہ اس کا انکار کرنے والا ایک چمار کے قاتل کے برابر بھی مجرم نہیں سمجھا جاتا، یا یوں کہئے کہ آپ کے نزدیک آپ کا دین اتنا حق نہیں ہے کہ اس کے منکر کو کافر کا خطاب دیا جا سکے اور اس سے انحراف و بغاوت شدید ترین جرم ٹھہرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود پنڈت جی کے دل میں اپنے دین کی حقانیت کا نقش نہیں ہے، مسلمان اپنے دین کو حق جانتا ہے اور اس سے انحراف کو ہر جرم سے بدتر جرم قرار دیتا ہے اور یہی خدا شناسی کی شان ہے۔ پنڈت جی کی دیانت بھی قابل دید ہے۔ اعتراض میں لکھا ہے کہ بلا قصور کسی کو مارنا سخت گناہ ہے اور خود ہی آیت کا ترجمہ لکھا: "لڑو ان سے جو تم سے لڑتے ہیں۔" تو جو لڑتا ہے، جنگ کرتا ہے، حملہ آور ہوتا ہے، وہ بے قصور ہے اور جو مدافعت کرتا ہے، اپنی جان بچاتا ہے، وہ بے قصور مارنے والا اور گناہ گار ہے۔ یہ کس ملک کا انصاف ہے؟ کہاں کی دیانتداری اور سچائی ہے؟ جس مذہب کے پیشواؤں کی دیانت کا یہ حال ہو اس کی نسبت دنیا خود رائے قائم کرے۔

پنڈت جی نے مسلمانوں پر یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ وہ مذہب کی خاطر لڑتے، اپنی سلطنت وغیرہ کھو کر برباد ہو گئے، سلطنت کھونا غلط بات ہے۔ آج بھی مسلمانوں کی دنیا میں بہت سی سلطنتیں موجود ہیں: سلطنت افغانستان، سلطنت ایران، سلطنت عراق، سلطنت ہائے عرب، سلطنت ترکی، سلطنت مصر، سلطنت افریقہ و مراکش وغیرہ۔ مسلمانوں کی سلطنت تو آج تک دنیا سے معدوم ہوئی نہیں اور اگر مذہب پر مسلمانوں نے سلطنت قربان کی ہو تو بسا مبارک، حق کے حامی اور صدق کے علمبردار کو ایسا ہی کرنا چاہیے کہ وہ

صدق و حق کی حمایت میں ملک و مال کی پرواہ نہ کرے اور حکومت و سلطنت کو دین حق پر فدا کر دے لیکن اپنی تاریخ پر تو ایک نظر فرمایئے۔

ہندوؤں نے اپنی حکومت و سلطنت کس چیز میں گنوائی اور وہ کس طرح برباد ہوئے کہ آج ان کی سلطنت کا روئے زمین پر نام و نشان نہیں ہے۔ خدا کی وسیع زمین میں وید ماننے والوں کی سلطنت کا پھریرا کسی خطہ پر نہیں لہراتا۔ ان کا سکہ کسی گاؤں میں بھی نہیں چلتا۔ یہ کس عمل کی پاداش ہے جو سلامتی ہماری قوم غلامی کی زندگی جیتی ہے اور صدیاں کی صدیاں اسی حال میں ذلت و خواری کے ساتھ گزر چکی ہیں۔ ان کے اعتقاد میں تو نعمت آخرت کوئی چیز نہیں ہے جو یہ سمجھا جائے کہ نیک عمل کی جزاء آخرت میں مل جائے گی۔ انہیں جو کچھ ملتا ہے، ان کے اعتقاد میں تناسخ کے چکر میں یہیں دنیا کے اندر ملتا ہے اور ملی دنیا میں ذلت، محکومی، غلامی ہزار برس سے ایسا ہو چکے کہ جس سلطنت کی شکل خواب میں بھی نظر نہ آئی تو معلوم ہوا کہ ایشور کے یہاں اہن دھرم کا یہی ثمرہ ہے۔ اب اگر آزادی کی خواہش ہو، غلامی سے نکلنا ہو تو ہزار برس کے تجربہ کو مشعل راہ بناؤ اور اس مذہب کے پھندے گلے سے اتار کر پھینک دو جس کی بدولت دنیا ذلت و رسوائی کے ساتھ بسر کرنی پڑی۔

اس مذہب کی طرف آؤ جس کی سلطنت دنیا سے کبھی ایک دن کے لیے بھی معدوم نہیں ہوئی۔ وہ کون ہے؟ وہ دین اسلام ہے۔ پنڈت جی نے اسی سلسلہ اعتراض میں تحریر فرمایا ہے۔ ان سے یعنی مسلمانوں سے پوچھنا چاہیے کہ چوری کا عوض چوری ہی ہے۔ اس سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ جب حملہ آور مقاتلہ شروع کرے اور گردنیں اڑانے لگے تو اس کی مدافعت کے لیے قرآن کریم کا یہ حکم دینا کہ لڑنے والوں سے لڑو۔ یہ ایسا ہے جیسے چوری کے بدلے چوری کرنا۔ یہ بات ایسی صریح البطلان ہے جس کو رد کرنے کی بھی حاجت نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ چوری جرم ہے، گناہ ہے، حرام ہے جو مستحق سزا ہے لیکن قاتل کا دفع فرض ہے، اپنی حفاظت ہے، ہم اس طرف متوجہ نہیں ہوتے اور ہم پر اس اعتراض کا کچھ اثر نہیں ہے۔ دنیا کی نظر میں ایسے اعتراض ایک مضحکہ خیزیات ہیں اور خود معترض کے سرشار تعصب ہونے کی دلیل ہیں

لیکن اس موقع پر ہم آریوں کو ان کے پیشوا کے کلام کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ وہ جب پنڈت جی کو اپنا دینی پیشوا مان چکے ہیں تو پنڈت صاحب کے حکم کے سامنے فرمانبرداری کے ساتھ گردن جھکا دینا ان کی سعادت ہے۔

وہ اس اصول پر عمل کرنا شروع کریں کہ اگر کوئی شخص حملہ آور ان پر حملہ کرے تو اس کے جواب میں ہاتھ اٹھانا، حملہ کرنا، لڑائی لڑنا وہ ایسا ہی برا سمجھیں جیسا چوری کے بدلہ میں چوری کرنا۔ کوئی پیٹ دے تو پٹ جایا کریں، مار دے تو مار کھالیا کریں اور یہ سمجھ کر دل کو تسلی دے لیا کریں کہ یہی پنڈت کا حکم اور یہی دھرم کا نیم ہے، اگر آریوں نے پنڈت جی کی اس تعلیم پر عمل نہ کیا تو بیچارے کی بات رائیگاں گئی، نہ اپنوں نے مانی نہ غیروں نے اور ان کے اصول کو ٹھکرا دینا پیشوا ماننے کے خلاف بھی ہے۔ ابھی تک آریہ اس پر عامل نہیں ہیں بلکہ وہ خود جنگجو بنے ہوئے ہیں، ہمسایہ قوموں کے درپے آزار رہتے ہیں، انہیں طرح طرح کے دکھ دیتے اور ایذائیں پہنچاتے ہیں۔

آریو! کچھ پنڈت جی کی لاج رکھو اور شانتی کا یہ اصول جو پنڈت جی نے تعلیم کیا ہے "اختیار کرو" پھر دیکھو دنیا سے کس قدر جلد تمہارا سفر ہوتا ہے اور بعد کی قوموں میں تمہارے اس بھولے پن اور پنڈت جی کی اس موثر تعلیم کا کیا خوب تذکرہ رہتا ہے۔

اور اللہ نہیں دوست رکھتا ہے فساد کو اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، داخل ہو بیچ اسلام کے۔ (پارہ دوم سورۃ البقرہ)

اعتراض: اگر خدا فساد نہیں چاہتا تو کیوں آپ ہی مسلمانوں کو فساد کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور مفسد مسلمانوں سے دوستی کیوں کرتا ہے اگر مسلمانوں کے مذہب میں داخل ہونے سے خدا راضی ہوتا ہے تو وہ مسلمانوں ہی کا طرفدار ہے۔ سب دنیا کا خدا نہیں، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نہ قرآن خدا کا بنایا، نہ اس میں کہا ہوا سچا خدا ہو سکتا ہے۔

جواب: نہ مسلم مفسد ہیں، نہ انہیں فساد کا حکم دیا گیا بلکہ فساد کو شریعت اسلامیہ نے حرام کیا۔ اس کی ممانعت پر بہت تاکیدیں فرمائیں خود یہ آیت بھی فساد کی ممانعت میں ہے۔ اس سے بڑھ کر حق سے دشمنی اور اس کی عداوت کیا ہوگی کہ جو

کتاب فساد کو روک رہی ہے اور جو آیت اس کو مذموم قرار دیتی ہے اس کو پیش کر کے مسلمانوں پر اور خداوند عالم پر فساد کا بہتان باندھا چونکہ مسلمانوں کا دین سچا ہے فساد اور تمام بری باتوں سے روکتا ہے بھلائی کی راہ بتاتا ہے' دین الٰہی ہے اس لیے اللہ اس سے راضی ہے اور اس میں داخل ہونے والوں سے راضی بھی ہے اور دنیا میں جو اسلام کے مخالف ہیں' حق کے دشمن ہیں' فسادی اور جھگڑالو ہیں' باطل پرست ہیں' ان سے راضی ہونا خلاف حکمت ہے' خدا کی شان نہیں۔ یہ اعتراض عناد اور ناخدا شناسی پر مبنی ہے۔

اور اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے شمار۔

(منزل اوّل سپارہ دوم سورۃ البقرہ آیت ۲۰۹)

اعتراض: کیا بلا گناہ و ثواب کے خدا ایسے ہی رزق دیتا ہے؟ تو پھر بھلائی برائی کا کرنا یکساں ہے کیونکہ رنج و راحت حاصل ہونا اس کی مرضی پر ہے اس لیے جرم سے منحرف ہو کر مسلمان لوگ من مانی کرتے ہیں اور کئی اس قرآن کے فرمودہ پر اعتقاد نہ رکھ کر دھرماتی ہوتے ہیں۔

جواب: آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی شانِ رزاقی اور اس کی عطا کا بیان ہے اور اس کی قدرتِ کاملہ و حکمت بالغہ کا ذکر ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ پنڈت جی کی ذہنی رسائی و پرواز سے بھی یہ مقام بالاتر ہے' وہ عطاء و سخا کے پاکیزہ و شاہانہ اوصاف سے بالکل نابلد ہے' ہر قوم اپنے معمولات و مالوفات کی خوگر ہوتی ہے۔ پنڈت جی کی زندگی اس قوم میں گزری ہے جس کا طرز معاش بالکل سودی لین دین ہے' داد و دہش سے وہ کیا واقف ہوں' کیا چیز ہے وہاں تو دینا بھی لینے کے لیے ہے اور یہ معاملہ ان کے دماغوں پر اس قدر غالب آ گیا کہ وہ امتنان و احسان کے معنی کا تصور کرنے سے بھی عاجز ہو گئے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے احسان کا ذکر و بیان دیکھ کر گھبرا اٹھے اور کہنے لگے' کیا بلا گناہ و ثواب کے خدا ایسے ہی رزق دیتا ہے یعنی ان کے نزدیک الشور کی مقدرت میں بھی کمی ہے کہ بغیر عوض کسی کو کچھ دے سکے۔

انہوں نے اپنی زندگی میں یہی تجربہ کیا ہے کہ کوئی مہاجن کسی کو بغیر اپنے فائدہ کے کچھ نہیں دیتا۔ اس سے انہوں نے اپنے معبود کے حق میں بھی یہی قیاس کیا ہے کہ

وہ بھی بلامعاوضہ کسی کو کچھ نہیں دے سکے گا۔ یہی بنائے اعتراض ہے اور یہ اس قوم کی بہت تنگ دلی و تنگ نظری ہے کہ جود و احسان کی صفت سے بالکل معریٰ اور محض بے خبر ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ اس قوم کے بھی تمام افراد یکساں ہی ہیں، بعض ان میں بھی سخی ہوتے ہیں تو پنڈت جی پر اور زیادہ سخت الزام عائد ہو گا کہ انہوں نے نیک مزاج انسانوں کے لیے بھی جو صفت تسلیم کر لی وہ بھی خدا کے لیے نہ مانی اور اس شہنشاہ عظیم الشان مالک کون و مکان ولی جود و احسان کا مرتبہ اس کی مخلوق انسان سے بھی کم کر دیا اور شان الٰہی کو عیب لگایا اور اس کے کمال و کرم کا انکار کر دیا، بلکہ اس کو ناممکن ٹھہرایا۔ ایک طرف تو صفاتِ الٰہی کے انکار کا شدید جرم، دوسری طرف وید میں غلط بیانی اور ویدک دھرم میں جھوٹی تعریف پنڈت جی کے اس مضمون سے لازم آتی ہے۔ ویدک دھرم نے خدا کے جو نام بتائے ہیں وہ پنڈت جی کی اس تحریر کے بموجب جھوٹے ٹھہرتے ہیں اور ان کی اتنی ہی حقیقت ثابت ہوتی ہے جتنی کسی ایک محتاج نادار کا نام مہاراج یا نکلے بدہیکل نام سندر یا کمزور و ناتواں کا نام دیو رکھنے کی ہو سکتی ہے، جیسے یہ سب نام جھوٹے ہیں، ایسے پرمیشور کا لفظ بھی ہے جس کے معنی تو اعلیٰ قدرت والا ہے مگر وہاں قدرت کا حال پنڈت جی یہ بتلاتے ہیں کہ وہ بغیر عوض ایک حبہ کسی کو دینے پر قادر نہیں۔ تمام عالم نعمتوں سے بھرا ہوا ہے، محتاج بھوکے مر رہے ہیں مگر پنڈت جی کے نزدیک ان کے خدا کو یہ قدرت نہیں کہ اس بے شمار دولت و حشمت میں سے ایک لقمہ بھی کسی کو عطا کر دے سکے۔ اس پر بھی اس کا نام پرمیشور رکھنا کیا بالکل ایسا نہیں ہے جیسا کسی بھکاری منگتا کا نام داتا رکھ دینا۔ اسی طرح اس کا نام آنند یعنی راحت بخشنے والا، یہ بھی غلط اور جھوٹ ہے۔ لوگ مصیبتوں میں سڑتے رہیں اور وہ کسی کو محض کرم سے ایک آن کے لیے راحت نہ بخش سکے پھر بھی نام آنند، ایسے نام رکھنا تو خدا کے ساتھ مسخرہ پن کرنا ہے، اسی طرح اس کے ناموں میں ویدک دھرم نے ایک نام سرو شکتی مان بتایا ہے، جس کے معنی کامل القدرت رکھنے کے ہیں۔ یہ نام بھی پنڈت جی کے اعتقاد پر جھوٹا اور غلط ہے جس بے چارے کی مجبوری کا یہ عالم ہو کہ وہ کسی کا قصور معاف نہ کر سکے، خطا نہ بخش سکے، ایک آن کے لیے آرام و راحت نہ پہنچا سکے اس کا نام سرو شکتی مان یعنی کامل

القدرت رکھنا تمسخر ہے، مضحکہ ہے، اس کی توہین ہے۔ یہ خدا تو نہیں تمہاری دل لگی کا ایک کھلونا ہے جس سے مسخرہ پن کیا کرتے ہو اور اس سے بڑھ کر اس کا نام دیالو رکھ دیا۔ دیا کے معنی ہیں کثیر الالطاف عمیم الاحسان وسیع الجود اور صفت اس کی آپ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ مفت ایک جو کسی کو نہیں دے سکتا تو اسے احسان کس لغت میں کہتے ہیں اور یہ عطا کس معنی سے ہوئی۔ بڑا ہی خوش قسمت معلوم ہوتا ہے آپ کا وہ فرضی ایشور جو بغیر دیا ہی کے دیالو بن گیا۔ یہ ایسا ہی ہوا جیسے کوئی بھیک منگا محتاج اپنا نام راجہ رکھ لے، دینے کو تو خاک نہیں اور کہنے کو دیالو، کیا کہنا۔

ع فلاطون ہیں مگر بیمار سے پرہیز کرتے ہیں

ایسے ہی بھگوان اس کا نام رکھا ہے، بھگوان کے معنی ہیں صاحب دولت و حشمت تو وہ صاحب دولت و حشمت کیا ہوئے جنہیں اپنی مرضی سے ایک کوڑی خرچ کرنے اور دینے کا اختیار نہیں۔ اسی طرح ایک نام شیو ہے جس کے معنی عافیت کو بخشنے والا جو کھیا کو کچھ بھی بخشنے والا نہ ہو، اسے شیو کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

کسی نے خوب کہا ہے ۔

وہ مفلس ہے پاس اسکے کوڑی نہیں ہے	دیالو اسے کہنا بالکل خطا ہے
نہیں اس کو قدرت کہ دے ایک دانہ	وہ ایک جو کسی کو نہیں بخشا ہے
نہ بدنام اس کو کرو کہہ کے داتا	وہ مجبور ہے نام ہی کا خدا ہے
لگاؤ نہ دل اس سے کچھ بھی نہیں ہے	نہ قادر نہ مالک نہ صاحب عطا ہے
جو قادر ہے، معطی ہے، صاحب کرم ہے	وہ اللہ ہے، وہ ہمارا خدا ہے
جھکاؤ جو سر اس کے آگے جھکاؤ	وہی نعمت و سلطنت بخشا ہے

ویدوں کا آغاز پرارتھنا سے ہوتا ہے، ابتدائی جملے دعاؤں کے ہوتے ہیں جس میں طرح طرح کی حاجتیں ایشور کے سامنے پیش کی جاتی ہیں، قسم قسم کی استدعائیں کی جاتی ہیں۔ جب پنڈت جی کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے کسی کو کچھ نہیں دے سکتا تو یہ دکھلاوے کی دعائیں، جھوٹا ہیڈنگ، غلط عنوان نہیں تو کیا ہے اور جس کتاب کا عنوان ہی واقفیت سے دور ہو اس کے آئندہ مضامین کی نسبت آپ ہی بتائیے کیا کہا

جائے، پھر ایسی کتاب کو دینی کتاب قرار دینا خلق کو ان کے عملوں کی قدر رنج یا راحت پہنچائے جس طرح ایک ملازم تنخواہیں تقسیم کرنے والا مجبور ہے جس کی جتنی تنخواہ واجب ہے، اتنا اسے دے دے، ایک حبہ کم و بیش نہیں کر سکتا، اگر لے تو اس پر اس سے جواب طلب ہو۔ اس کے افسر دارو گیر کریں، یہی حیثیت پنڈت جی نے ایشور کی قرار دی ہے کہ وہ ایک مزدوری بانٹنے والا ہے جس نے جتنا کام کیا اس کا مقرر معاوضہ اسے دے دیا اس کا وہ ایک مجبور ملازم کی طرح پابند ہے، اپنی طرف سے ایک حبہ کسی کو نہیں دے سکتا، نہ کسی کا ایک حبہ روک سکتا ہے۔ جب یہ بات تو پرارتھنا، دعا و التجا کس لیے ایک شخص کے جیسے عمل ہیں۔ پرارتھنا کیجئے نہ کیجئے، انہی کا بدلہ دینا اس پر واجب و لازم ہے اور وہ اس کا بھگتان کرنے کے لیے مجبور ہے اور کسی کو دینا ہی پڑے گا اور اگر عمل کچھ نہیں ہے یا خراب عمل ہیں تو لاکھ پرارتھنا کرو، رات دن مانگتے جاؤ، وہ دینے کا کچھ اختیار ہی نہیں رکھتا تو اب ویدوں میں پرارتھنا کی تلقین و تعلیم کس فائدہ کے لیے اس کا کیا ثمرہ ہے۔ یہ طلب بے حاصل کیوں کی جاتی ہے اور ایک مجبور محض کی جھوٹی تعریفیں کیوں کرائی جاتی ہیں۔ درحقیقت آریہ کا یہ اعتقاد خدائی عزت و جلالت الوہیت کے نہ پہچاننے سے ہے، اگر وہ شانِ خدائی سے کچھ بھی واقف ہوتے تو اس کو رحم و کرم سے اس طرح معطل کر کے بدنام نہ کرتے۔

اسی غلط عقیدہ کی بناء پر پنڈت جی نے یہ اعتراض کر دیا: "کیا بلا گناہ و ثواب کے خدا ایسے ہی رزق دیتا ہے۔"

اور یہ نہ سمجھے کہ بے شک دیتا ہے۔ یہی کرم ہے، یہی شانِ خدائی ہے، یہ نہ ہو تو اس میں اور بندۂ مجبور میں کیا فرق ہے۔ کیا ظلم ہے اپنی سی مجبوری کو شانِ خدا سمجھا جا رہا ہے اور جو دین پاک شانِ الٰہی بیان کرتا ہے اس پر جاہلانہ اعتراض کیے جاتے ہیں۔

اب رہا پنڈت جی کا یہ اعتراض کہ خدا کے لیے عطا و کرم یعنی بغیر عمل کے بخشش فرمانا ثابت کرنے سے لوگوں میں گناہوں کی جرأت اور دلیری پیدا ہو گی۔ یہ بھی بالکل لغو ہے اگر پنڈت جی کبھی کسی مدرسہ میں پڑھے ہوں گے تو انہوں نے دیکھا ہو گا کہ طلباء کو انعام دیئے جاتے ہیں، انعام وہی چیز ہے جو اظہار خوشنودی کے لیے بے لحاظ معاوضہ دیا

جائے۔ اسی طرح اپنے نوکروں کو، حکومتیں اپنے ملازموں کو انعام دیتی ہیں باوجودیکہ ان کے کام کا معاوضہ تنخواہ کی صورت میں انہیں مل جاتا ہے پھر بھی انعام واکرام، داد و دہش ہوتی رہتی ہے اور یہ عام تجربہ ہے کہ جو لوگ مورد انعام واکرام ہوتے ہیں وہ مزدوروں کی طرح خود سر نہیں ہو جاتے، بلکہ موقع آتا ہے تو جانیں قربان کر دیتے ہیں۔

پنڈت صاحب کو یہ تجربہ کہاں بہم پہنچا کہ عنایت و کرم کا لازمی نتیجہ گناہ گاری و بغاوت ہے، دنیا کا ہر شخص اس سے واقف ہے کہ انسانی طبیعت کا مقتضاء ہی یہ ہے کہ آدمی اپنے محسن کا سپاس گزار رہے۔ عرب میں مثل مشہور ہے: الانسان عبد الاحسان تو کرم الٰہی کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ بندے اس کی طاعت میں سرگرم رہیں، اگر پنڈت جی کے اصول کے مطابق داد و دہش کا لازمی نتیجہ فسادِ اعمال ہوتا تو دنیا کے عقلاء اور تمام حکومتوں کے والی اس خطرناک مہربانی سے دست کش کر لیتے اور دنیا سے انعام واکرام کا نام ہی ناپید ہو جاتا مگر جب ایسا نہیں ہے تو تمام دنیا کا عملی اتفاق اس پر شاہد ہے کہ عنایت و کرم اور بے معاوضہ داد و دہش ایک بہترین عمل ہے اور اس کے نتائج بہت اعلیٰ ہیں۔ الحمدللہ! پنڈت جی کے اعتراض کی رکاکت و لغویت آفتاب سے زیادہ روشن ہو گئی۔

پنڈت جی سے یہ اور دریافت کر لیجئے کہ ان کے اعتقاد میں وید تمام انسانوں کی ہدایت و تبلیغ کے لیے چھپا مخصوص لوگوں کے واسطے اگر کسی مخصوص جماعت کے لیے ہو تو بقول ان کے ایشور پر اس قوم کی طرف داری کا الزام پنڈت جی کے اعتقاد میں ایشور ہونے کے منافی ہے تو لامحالہ ان کو کہنا پڑے گا کہ وید تمام انسانوں کی ہدایت اور درستی کے لیے ہے۔ کتاب الٰہی کو ایسا ہی کہنا چاہیے اگر تمام انسانوں کے لیے وید مانا جائے تو ان میں نیک بھی ہیں، رشی اور منی بھی، بھی بھچاری بھی ہیں، بد بھی ہیں، پاپی بھی ہیں، مہاپاپی بھی ہیں، ایسے بھی ہیں جن کی عمریں گناہوں میں، بغاوت و سرکشی میں، ظلم و جفا میں، خراب حال میں گزر گئیں۔ رہنمائی اور سیدھی راہ کا بتانا منزل مقصود کا پتا دینا تو بڑی نعمت ہے۔ یہ پاپیوں کو کس استحقاق سے ملی۔ جب پنڈت کا اصول یہ ہے کہ کوئی نعمت یا کلفت بغیر بدلہ کے نہیں مل سکتی تو اتنی بڑی نعمت کا بغیر بدلے کے ملنا پنڈت جی

کے اپنے مسلمات و اعتقادات کے لحاظ سے ان کے اس اصول کو باطل کرتا ہے نہ تنہا اسی اصول کو بلکہ ان کے تمام دین ہی پر پانی پھیر دیتا ہے۔

○ ○ ○

اور سوال کرتے ہیں تجھ سے حیض کی بابت جواب دے کہ وہ ناپاکی ہے۔ پس کنارہ کرو عورتوں سے، بیچ حیض کے اور مت نزدیک جاؤ ان کے یہاں تک کہ پاک ہوں، پس جب نہالیں، پس جاؤ ان کے پاس اس جگہ سے کہ حکم کیا تم کو اللہ نے بیبیاں تمہاری کھیتیاں ہیں، واسطے تمہارے، پس جاؤ کھیت اپنے میں جس طرح چاہو تم کو اللہ لغو قسم میں نہیں پکڑتا۔

اعتراض: ایامِ حیض میں مجامعت نہ کرنے کا حکم تو اچھا ہے لیکن عورتوں کو کھیت سے مشابہت دینا اور یہ کہنا کہ جس طرح چاہو ان کے پاس جاؤ، انسان کی شہوت بھڑکانے کا موجب ہے۔ اگر خدا لغو قسم پر نہیں پکڑتا تو سب جھوٹ بولیں گے، قسم توڑیں گے، اس سے خدا جھوٹ کا اجراء کرنے والا ہو جائے گا۔

جواب: معترض نے تعصب سے مغلوب ہو کر عقل و دیانت دونوں کا خون کر دیا اور آیات میں قطع برید کر دی، کہاں کی آیت کہاں ملا دی، درمیان کی آیتیں جن کا مضمون سے قوی ربط ہے، چھوڑ دیں، شوق اعتراض میں اس قسم کے تصرفات شاید ویدک دھرم میں جائز سمجھے جاتے ہوں۔ یہ تو پنڈت صاحب کی دیانت کا نمونہ تھا اور ایسے نمونے ان کے کلام میں بہت موجود ہیں۔ اب دانائی قابل دید ہے جو اعتراض کے لفظوں سے برس رہی ہے۔ آپ کا اعتراض یہ ہے کہ "عورتوں کو کھیت سے مشابہت دینا اور یہ کہنا کہ جس طرح چاہو ان کے پاس جاؤ، انسان کی شہوت بھڑکانے کا موجب ہے۔" نادان نے یہ نہ سمجھا کہ کھیت سے تعبیر کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اپنی بیبیوں کے ساتھ بھی قضاء شہوت مد نظر نہ ہو، بلکہ حصولِ اولاد اور بقاء نسل مقصود ہو۔ کیسی پاکیزہ تعلیم دی اور اس کی خوبی کو پنڈت جی بھی سمجھتے ہیں اور انہوں نے قرآن کریم کی اس عبارت

سے سبق لیا ہے مگر یہ سعادت مندی ہے کہ جس سے فیض پایا ہو جس سے نکتہ سیکھا ہو اسی پر غلط اور لغو اعتراض کرنے کے لیے بے محابا زبان کھول دیں، کھیت سے تشبیہ تو پنڈت جی نے خود ہی دی ہے اسی ستیارتھ پرکاش ص ۱۵۳ پر پنڈت جی خود لکھتے ہیں:

"کسان یا مالی جاہل ہو کر بھی اپنے کھیت یا باغ کے سوائے اور کہیں بیج نہیں بوتے جبکہ معمولی بیج اور جاہل کا ایک دستور ہے، تو جو شخص سب سے اعلیٰ انسانی جسم کے درخت کے بیج کو بڑے کھیت میں کھوتا ہے وہ بڑا ہی بے وقوف کہاتا ہے۔"

پنڈت جی نے اس عبارت میں خود عورت کو کھیت سے تشبیہ دی اور اس تشبیہ کا یہ فائدہ بھی سمجھے کہ جس طرح کاشتکار کو اپنا بیج بے محل ضائع نہ کرنا چاہیے اسی طرح آدمی کو اپنا تخم اپنے ہی کھیت میں ڈالنا چاہیے گویا کہ اس تشبیہ میں زناکاری کو روکنے کے معنی ہیں۔ یہ اقرار کرتے ہوئے یہ کہہ دینا کہ اس تشبیہ میں شہوت بھڑکانا ہے، کس قدر عناد ہے۔ ہم اس مدعا پر کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتے کیونکہ پنڈت جی کی اپنی عبارت ان کے لیے ایسا مسکت جواب اور ان کے عناد کی شہادت ہے جس سے وہ کسی طرح خلاصی نہیں پا سکتے۔ رہا شہوت بھڑکانا اس کا الزام اسلام اور قرآن پر تو ایسا ہے جیسا کوئی شخص آفتاب کے طلوع پر الزام یہ لگائے کہ اس سے بڑا ہی اندھیرا ہو جاتا ہے مگر شہوت کا سرو سامان دیکھنا ہو تو پنڈت جی کی کتابیں اس قسم کے ذوق رکھنے والوں کے لیے بڑی دلچسپی کا سامان ہیں۔ اس وقت صرف ایک عبارت نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جس سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ پنڈت جی نے اپنا حال دوسروں کی طرف نسبت کیا۔ پنڈت جی کی تحریروں سے اس قسم کی بہت سی شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں، مگر میری تہذیب اس قسم کا ذخیرہ پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتی، اس لیے میں صرف ایک عبارت وہ بھی ایسی جو اس رنگ میں سب سے ہلکی ہو پیش کرتا ہوں۔ پنڈت صاحب اسی ستیارتھ پرکاش ص ۲۹ میں لکھتے ہیں:

"زچہ دودھ نہ پلاوے، دودھ روکنے کے لیے پستان کے منہ پر ایسی دوا لگا دیں جس سے دودھ نکلنا بند ہو جائے۔ اس طریق پر عمل کرنے سے دوسرے مہینہ میں عورت دوبارہ جوان ہو جاتی ہے۔"

صاف بھی کوئی قابلِ داد اور تہذیب لائق تعریف شہوت انگیزی کی تعلیم میں یہ جذبہ شاید ہی کسی عیش پرست کو سوجھا ہو کہ اپنی لذت کے لیے عورت کو جوان رکھنے کے لیے بچوں کو دودھ تک سے محروم کر دیا جائے۔ حریص سے حریص جانور بھی ایسا نہیں کرتا۔ یہ حال اور اس پر اعتراض جو یہ تعلیم دے کہ اپنی بیبیوں سے بھی جو تعلقات ہیں' ان کا مقصد نسل انسانی کی بقاء ہونا چاہیے شہوت کے خیال سے طبیعت کو بچانا چاہیے۔ اس پر اعتراض کرنا اچھے کو برا بتانا اور اپنے گریبان میں منہ نہ ڈالنا کتنی حیاداری کی بات ہے اور جس مذہب کا بانی اس قسم کے حرکات کا مرتکب ہو' اس کو مذہبوں کی فہرست میں شمار کرنا لفظ مذہب کی توہین ہے۔ کوئی باطل مذہب بھی اس اعلان کے ساتھ جھوٹ بولنے کی اجازت تو نہ دیتا ہو گا۔

پنڈت جی کے اسی اعتراض کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اگر خدا اللغو قسم پر نہیں پکڑتا تو سب جھوٹ بولیں گے' قسم توڑیں گے اس سے جھوٹ کا اجرا کرنے والا ہو جائے گا۔

(ستیارتھ پرکاش ص ۱۷۷)

معاذ اللہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ اس افتراء پردازی کی کوئی حد ہے۔ اس جھوٹ کی کوئی انتہا ہے' آدھی آیت لکھی اور اس کا غلط سلط ترجمہ کیا' آدھی چھوڑ گئے تاکہ دنیا کو مغالطہ دیا جا سکے۔ یہ عمل کس دین اور کس آئین میں جائز ہے کہ ایک عبارت میں سے درمیان کا جملہ نکال دیا جائے اور اول آخر کے حصے لکھ کر ان پر اعتراض کیا جائے۔

اربابِ دانش کے لیے پنڈت جی کا یہ طرز عمل اس کی دلیل ہے کہ معاند متعصب کو بھی قرآن کریم میں اعتراض کی جگہ نہیں ملتی' اس لیے وہ مجبور ہوتا ہے کہ اعتراض کرنے کے لیے قرآن پاک کے معانی میں بے جا تصرف کرے' اس کے مضامین میں تراش خراش کرے۔ یہاں پنڈت جی درمیان سے جو عبارت چھوڑ گئے اس میں یہ تھا: "لا تجعلوا اللہ عرضۃ لایمانکم۔" اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ پنڈت جی نے اسے اپنے مخالف مدعا سمجھا اس لیے امانت و دیانت کی گردن ناپ دی' پھر بھی جو جزو آیت کا لکھ کر اعتراض کیا ہے اس میں کمال یہ ہے کہ معنی جناب کے ذہن نشین و خاطر

گز یہاں نہیں ہیں۔

سمجھنے سے پہلے اعتراض ہو رہا ہے' تو جس اعتراض سے پہلے فہم کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہو' وہ اعتراض کیا وقعت رکھتا ہے۔ ابھی تک پنڈت صاحب کو یہ تو خبر ہی نہیں کہ قسم میں کیا ہوتا ہے اور لغو سے کیا مراد ہے جب تک آدمی یہ نہ سمجھ لے کہ اس لفظ سے قائل کا ادعا کیا ہے' اس وقت تک اس کی نسبت کوئی رائے کس طرح قائم کر سکتا ہے۔ جب آپ یہ جانتے ہی نہیں' لغو کیا چیز ہے؟ کس کو کہتے ہیں تو آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس پر گرفت کرنی چاہیے یا نہ کرنی چاہیے۔ لغو سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا ارادہ قسم کا نہیں' نہ عمل قسم کا ہے' بے ضرورت' بغیر ارادہ کے زبان سے کلمہ قسم نکل گیا تو اس پر گرفت نہ ہوگی۔ یہ عین مقتضاء انصاف ہے' اچھے اچھے بولنے والوں کی زبان لغزش کرتی ہے اور کبھی کوئی کلمہ بے ارادہ زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ اس پر کوئی عاقل گرفت نہیں کرتا اور وہ قابل درگزر ہوتا ہے بلکہ ایسے کلمہ پر گرفت کرنے والا قابل اعتراض سمجھا جاتا ہے۔ اگر پنڈت جی یہ سمجھ لیتے تو شاید اعتراض نہ کرتے۔

اعتراض: کون ہے وہ جو قرض دے اللہ کو اچھا' پس دگنا کرے اس کو واسطے اس کے۔ (منزل اوّل سپارہ دوم سورۃ البقرۃ آیت ۲۴۵)

اس پر پنڈت جی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بھلا خدا کو قرض لینے سے کیا؟ کیا جس نے ساری خلقت کو بنایا وہ انسان سے قرض لیتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ایسا تو بلا سمجھے کہا جا سکتا ہے۔ کیا اس کا خزانہ خالی ہو گیا تھا؟ کیا اس کو ہنڈوی پرچہ سوداگری وغیرہ میں مصروف ہونے سے خسارہ پڑ گیا تھا جو قرض لینے لگا؟ اور ایک کا دو دو دینا قبول کرتا ہے۔ یہ ساہوکاروں کا کام ہے؟ ایسا کام تو دیوالیوں یا فضول خرچوں اور کم آمدنی والوں کو کرنا پڑتا ہے' خدا کو نہیں؟

جواب: انسان کا جوہر سخن گوئی اور سخن فہمی ہے اور اسی میں وہ دوسری مخلوق پر امتیاز رکھتا ہے جو شخص اس سے محروم ہوا اس کو انسان کہنا ایسا ہی ہوگا جیسا کسی پتھر کی تصویر کو آدمی کہہ دینا بلکہ اس سے بھی بدتر صدقات اور غرباء کی دستگیری کی اسلام نے تعلیم دی اور کتاب الٰہی نے اس کی ترغیبیں ایسے حسن ادا کے ساتھ بیان فرمائی ہیں

جو دل میں اثر کرتی ہیں اور طبائع انسانیہ اس سے پند پذیر اور منتفع ہوتی ہیں، ساتھ ہی ان میں نیکیوں کے جذبے اور بنی نوع کی ہمدردی کا ذوق پیدا ہوتا ہے، فصاحت و بلاغت کے جوہر نظر آتے ہیں اور اہل خرد خواہ کسی مذہب و ملت یا کسی قوم و نسل کے ہوں، اس عبارت سے صحیح مدعا تک پہنچ جاتے ہیں اور اس طرز بیان سے استلذاذ کرتے ہیں۔ جس کو ذرا بھی زبان دانی کا شعور یا سلیقہ ہے، وہ جانتا ہے کہ استعارات میں اداء مدعا شان فصحاء و طریق حسن ہے۔ اللہ کو قرض دینے کا یہ مطلب کہ راہ خدا میں محتاجوں پر صرف کرنا اجر و جزا کا موجب ہے اور جس طرح قرض دینے سے مال ضائع نہیں ہوتا بلکہ مدیون کے پاس محفوظ رہتا ہے، اسی طرح صدقات مال کے زوال کا سبب نہیں ہیں جیسا کہ دنیا پرستوں کا خیال ہے بلکہ وصال صاحب مال کے لیے سبب خیر و برکت ہیں، اس پر یہ سمجھنا کہ خدا کو قرض لینے کی ضرورت پیش آ گئی ہے اور وہ دیوالیہ ہو گیا ہے، پنڈت جی جیسے دماغ کے شخص کا کام ہو سکتا ہے۔ جاہل بھی عبارت سے مطلب سمجھ سکتا ہے مگر پنڈت جی کے دماغ کو رسائی حاصل نہ ہوئی۔ اس لطیف استعارہ پر اعتراض اور کبھی گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھا کہ وید میں کیسے کیسے گندے استعارے موجود ہیں جن کا نقل کرنا بھی ہمیں گراں اور ناپسند خاطر ہے اور سائیں مہی دہر کا ترجمہ وید دیکھئے اور پنڈت جی کو ان کے محبوب طرز سخن کی داد دیجئے۔ پنڈت مہی دہر نے عبارت وید کا ترجمہ کیا ہے اس کو کوئی شائستہ آدمی دیکھنا پسند نہ کرے گا فحش مضامین ایسی بے حیائی کے طریقہ پر بیان کیے گئے ہیں کہ اوباشوں کو بھی اس سے شرم آ جائے۔ پنڈت دیانند صاحب اس تعلیم کے حامی ہیں اور اس کو (النکار) استعارہ بتاتے ہیں۔ ایسے شرمناک استعاروں میں بدترین فحش گالی کے الفاظ میں اس کو ادا کرنا پنڈت جی پسند کرتے ہیں اور اس نفیس تعلیم پر معترض ہیں، کیا دماغ اسی طریق کلام کا خوگر تو نہیں ہو گیا ہے کہ شائستہ گفتگو اور لطافت کلام سے طبع والا مانوس نہ ہوتی ہو اور در حقیقت انسان کا ذوق جب بگڑ جاتا ہے تو وہ اپنے مالوفات کو دنیا کی بہتر نعمتوں پر ترجیح دیتا ہے۔ خواہ وہ کیسی ہی ناقص ہوں، افیونی نشہ والے جن نشوں کے عادی ہیں، ان کے سامنے وہ دنیا کی تمام نعمتوں کا ہیچ جانتے ہیں اور اصحاب ذوق سلیم کو نا آشنا قرار دیتے ہیں اگر اس طرح جس ادا قرآنی پر

کوئی فاسد الذوق معترض ہو، تو جائے حیرت نہیں۔

اعتراض: آیہ "مِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ" کا ترجمہ لکھا ہے: ان میں سے کوئی ایمان لایا اور کوئی کافر ہوا جو اللہ چاہتا نہ لڑتے جو چاہتا ہے اللہ کرتا ہے۔ اس پر پنڈت جی یہ اعتراض کرتے ہیں: کیا جتنی لڑائیاں ہوتی ہیں وہ سب اللہ کی مرضی سے ہوتی ہیں۔ کیا وہ ادھرم کرنا چاہتا ہے تو کر سکتا ہے، اگر ایسی بات ہے تو وہ خدا ہی نہیں کیونکہ نیک آدمیوں کا یہ کام نہیں کہ صلح توڑ کر لڑائی کرا دیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قرآن (معاذ اللہ) نہ خدا کا بنایا اور نہ کسی دیندار عالم کا بنایا ہوا ہے۔

جواب: خداوند عالم عزو علا تبارک و تعالیٰ پر اعتراض اور اس کی جناب پاک میں دریدہ دہنی اور بے باکی تو کفار کا شعار ہے اور یہی بے ادبی اور بے باکی ان کے بطلان و خسران کی دلیل و برہان ہے۔ معقول اور مہذب انسان خواہ مخواہ برے کلموں سے کسی انسان کا ذکر بھی گوارا نہیں کرتا اور اگر کسی آدمی کے حق میں بھی کوئی شخص ناشائستہ کلمے کہے تو وہ جاہل بد تمیز، وحشی، بے تہذیب کا نمونہ پیش کیا کرتے ہیں اور اعتراض کرنے میں تو آپ کی قابلیت اس درجہ کمال پر پہنچ چکی ہے کہ آپ جس چیز پر اعتراض کیا کرتے ہیں، اعتراض اس سے چھوتا تک نہیں۔ اس کا رخ دوسری ہی طرف ہوتا ہے۔ قرآن پاک کی جو آیت پنڈت جی نے نقل کی اس میں یہ کہیں نہیں کہ جتنی لڑائیاں ہوتی ہیں وہ سب خدا کی مرضی سے ہوتی ہیں یہ محض افترا ہے اور ایسا جیتا بہتان کہ خدا کی پناہ۔ قرآن کریم کی آیت سامنے موجود ہے اس کا ترجمہ پنڈت جی نے خود لکھا ہے۔ نہ آیت میں ہے، نہ ترجمہ میں ہے کہ سب لڑائیاں خدا کی مرضی سے ہوتی ہیں مگر پنڈت جی نے اپنے دل سے یہ مضمون تراش کر قرآن کریم پر اعتراض کر دیا۔ یہ اعتراض قرآن کریم پر تو نہ ہوا بلکہ معترض کی دیانت اور سچائی کا مرثیہ ہو گیا۔

غضب خدا کا اس قدر جھوٹ آیت سامنے ہے، ترجمہ خود لکھ رہے ہیں۔ صفحہ دو صفحہ بھی نہیں ہوا پیٹ سے جھوٹ بول دیا، کچھ تو شرم کی ہوتی۔ منع قتال کا تحت مشیت ہونا اور چیز اور قتال کا پسندیدہ اور موافق مرضی ہونا دوسری بات۔ کہاں یہ کہاں وہ، گیا

زمین، کیا آسمان مگر معترض تو بہان مستی بنا ہوا ہے جو تماشائیوں کی نگاہ میں دھول جھونکنا چاہتا ہے لیکن یہ اس کی نادانی ہے۔ دنیا اتنی بے سمجھ نہیں ہے جو اتنے کھلے فریب کو بھی نہ پہچانے۔ اللہ حکیم ہے نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے منع فرماتا ہے۔ لاتفسدوا فی الارض اس کا حکم ہے یعنی زمین میں فساد نہ کرو۔ فساد سے وہ راضی نہیں، ہاں جو قتال رفع فساد کے لیے ہو اس کو مذموم سمجھنا غلط ہے۔ قتل و خونریزی بری چیز ہے لیکن قاتل کو قتل کرنا امن کی حفاظت ہے اور قتل ناحق کو روکنے کی تدبیر ہے۔ وہ عین حکمت ہے اس کو خون ناحق کی طرح قابل ملامت قرار دینا جہل و ضلال ہے۔ تمام لڑائیوں کو خدا کی مرضی سے بتانا پنڈت کا افترا تھا۔ اس کے ہوا خواہوں کو اس سے شرمندہ ہونا چاہیے۔ "ادھرم" کیا بلا ہے، کیا خدا کے لیے بھی کوئی دھرم تجویز کیا ہے؟ اس کے لیے بھی کچھ فرائض و پابندیاں ہیں جو نادان خدا کی یہ شان جانتا ہو وہ مخلوق میں جس قدر گمراہی پھیلائے کم ہے۔

○ ○ ○

اعتراض: آیت الکرسی قرآن کریم میں ایک آیت ہے۔ اس میں حضرت رب العزت تبارک و تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات کا نہایت رُوح پرور، ایمان افروز بیان ہے۔ معرفت کے طلب گاروں کے لیے وہ فیض کا ایک عجیب سرچشمہ ہے، اس کی تجلیاں تاریک دلوں کو منور کر دیتی ہیں۔ پنڈت صاحب کی آنکھوں پر پتھر کا چشمہ ہے مگر اس پتھر کا جو بینائی سے بالکل محروم کر دے آپ نے اسے عینک سے اس آیت کو دیکھنا چاہا۔ پوری آیت میں سے دو جملے لیے جو آیت شریفہ میں جُدا جُدا تھے، ان کے درمیانی جملے حذف کر کے دونوں کو ملا کر ایک کر دیا۔ یہ تو آپ کی تراش خراش، آپ کی دیانت و سچائی کا ایک معمولی کرشمہ ہے، اس قسم کے گند تو پنڈت جی میں بھرے ہوئے ہیں۔ جو دو جملے پنڈت جی نے اعتراض کے لیے اخذ کیے ہیں ان میں ایک جملہ جملہ لہ ما فی السموات والارض اس کے معنی ہیں، اسی کا ہے جو کچھ آسمان میں ہے اور جو

کچھ زمین میں، یعنی موجودات ارضی ہوں یا سماوی سب کا مالک اللہ ہے، اس میں اس کی مالکیت کا بیان بھی ہے اور ملک عظیم کا اظہار بھی اور ایک لطیف پیرایہ میں رد شرک بھی کہ مشرکین جن کسی کو اس کا ساجھی کرتے ہیں اور شریک قرار دیتے ہیں وہ یا تو سماویات میں سے ہے جیسے چاند، سورج اور کواکب جن کی پرستش کی جاتی ہے یا اس کے ماتحت ارضیات کے قبیل سے جیسے دریا، پہاڑ، پتھر، حیوان، نباتات وغیرہ جن کی ہندو اور دوسرے بت پرست پرستش کرتے ہیں۔ ان سب کے لیے ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور ظاہر ہے کہ مملوک معبود نہیں ہو سکتا تو کائنات ارضی و سماوی میں سے کسی موجود کی نسبت معبودیت کا اعتقاد باطل ہے، توحید کا شیدائی تو اس انداز تعلیم پر فدا ہو جاتا ہے لیکن پنڈت جی جیسا متعصب شخص اس ایمانی و روحانی تعلیم پر زبان اعتراض کھولتا ہے اور اپنی سفاہت کا اس طرح اظہار کرتا ہے۔

○ ○ ○

اعتراض: جو آسمان و زمین پر چیزیں ہیں وہ سب انسانوں کے واسطے خدا نے پیدا کی ہیں، اپنے واسطے نہیں۔ کیونکہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

جواب: اب اس اعتراض کو اس جملہ مبارکہ سے کیا لگاؤ ہے جس میں کائنات ارضی و سماوی کی مالکیت کا بیان فرمایا گیا۔ اس میں ضرورت کا کیا دخل۔ کیا پنڈت اور اس کا دین خداوند عالم کو مالک نہیں جانتا اور یہ کس طرح ممکن ہے جب پیدائش کی نسبت اس کی طرف کرتا ہے اور اسی کا پیدا کیا ہوا جانتا ہے تو مالکیت میں کیا شبہ رہا۔ آیت میں بیان مالکیت ہی کا تھا وہاں یہ ذکر نہ تھا کہ کس کے نفع اور آسائش کے لیے یا کس حکمت کے لیے پیدا کیا۔ پیدا کرنے والا وہی مالک وہی اپنی ملک اور خلق میں سے جس چیز سے جسے چاہے نفع پہنچائے۔ بے شبہ وہ ضرورت و حاجت سے پاک ہے۔ اتنا بھی پنڈت جی نے قرآن پاک ہی سے سیکھا جس میں شان الٰہی یوں بیان کی گئی ہے۔ غنی عن العلمین ورنہ پنڈت جی بے چارے کیا جانتے تھے کہ اسے کسی چیز کی

ضرورت نہیں کیونکہ ہر چیز کا خالق و مالک ہونا ہی ہر چیز سے غنی و بے نیاز ہونے کی دلیل ہے جو سب کا پیدا کرنے والا ہے' سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ سب سے بے نیاز ہے' محتاج وہی ہوتا ہے جو خالق نہ ہو' ملک ذاتی نہ رکھتا ہو جیسا کہ پنڈت جی کا دھرم اپنے فرضی ایشور کو مانتا ہے وہ کسی چیز کا' کسی ذرہ کا' کسی روح کا' کسی جیو کا خالق نہیں تو مالک بھی نہیں اور جب خالق و مالک نہیں تو غنی بالذات نہیں۔ اس کی حکومت تو روح کی مہربانی سے چل رہی ہے' روحیں گناہ کرتی ہیں تو آریوں کے اعتقاد میں ایشور کو حکومت کا موقع ملتا ہے۔ آریوں کا ایشور روحوں کا ایک مجسٹریٹ ہے کہ بنائی ہوئی تو اس کی کوئی چیز نہیں' جبر و تعدی سے ان پر سطوت قائم کیے ہوئے ہے' جہاں یہ اعتقاد ہے وہاں پنڈت جی کا ذاتی مالکیت سے چونک اٹھنا اور بدک پڑنا زیادہ قابل حیرت و استعجاب نہیں' وہ بے چارے اپنے عقیدے کی بناء پر مالک بالذات اور خالق سمجھنے سے عاجز و قاصر ہیں مگر بایں ہمہ پنڈت جی کا اعتراض تو آیت شریفہ سے کوئی علاقہ ہی نہیں رکھتا' اگر کسی نے یہ کہا ہوتا کہ آسمان و زمین کی چیزیں اس نے اپنی ضرورت کے لیے پیدا کی ہیں تو یہ اعتراض درست ہو سکتا تھا کہ وہ ضرورت سے پاک ہے' اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں مگر یہاں یہ کسی نے کہا ہی نہیں۔ قرآن پاک میں ہے تو یہ ہے کہ وہ آسمان و زمین کی ہر چیز کا مالک ہے' اس پر یہ اعتراض کس طرح چسپاں ہو سکتا ہے۔ آریوں میں لکھے پڑھے آدمی ہی سوچیں تو۔

شوق اعتراض میں پنڈت جی کچھ ان کہی بھی بول گئے اور اعتراض کے کل پرزے ملا کر دیکھیے تو اس کی کوئی چول درست نہیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ جو آسمان و زمین پر چیزیں ہیں وہ سب انسانوں کے واسطے خدا نے پیدا کی ہیں' زمین پر انسان بھی تو ہیں' وہ کس کے لیے پیدا کیے ہیں اور انسانوں کے علاوہ جس قدر چیزیں ہیں' وہ سب انسانوں کے لیے پیدا کی ہیں۔ جب آپ نے یہ تسلیم کر لیا تو گوشت خوری پر اعتراض اور گئو کو ماتا بتانا' اس کی پوجا کرنا' اس کے عوض مسلمانوں کے خون بہانا یہ سب باطل ہوا جو چیز ہمارے ہی لیے خدا نے پیدا کی ہے اگر ہم اس کو اپنی غذا بنائیں تو پنڈت جی کا کیوں دل دکھتا ہے۔ آریے کیوں برا مانتے ہیں جو ہمارے لیے پیدا ہوئی' ہم اسے کام میں لائیں'

غذا بنائیں تو انہیں بگڑنے کا کیا موقع۔

آیت شریفہ کے دوسرے جملہ مبارکہ وسع کرسیہ السموات والارض پر پنڈت جی نے یہ اعتراض کیا: "جب اس کی کرسی ہے تو وہ محدود المکان ہوا جو محدود المکان ہے، وہ خدا نہیں کیونکہ خدا تو دیاپک یعنی ہمہ جا موجود بذاتہ ہی ہے۔"

جواب: اس علم و قابلیت کی داد تو کچھ آریہ ہی دیں گے جن بے چاروں کے نزدیک ایسی دُور از علم عقل باتیں ہی قابل سامعت ہوں اور ہذیانات کے باوجود کوئی شخص حلیم الحواس ہی نہیں بلکہ پیشوائی کے لائق سمجھا جاتا ہے۔ پنڈت نے اتنا ہی سمجھا کہ اس کی کرسی ہے، انہیں یہ معلوم نہیں کہ آسمان بھی اسی کا اور زمین بھی اس کی، تری بھی اس کی، خشکی بھی اس کی۔ ہندوستان بھی اس کا اور ہر اقلیم اس کی۔ سب کا وہی مالک ہے لیکن اس کے یہ معنی کہ وہ مکانی ہے اور مکان میں محدود ہے، کس طرح سمجھے جا سکتے ہیں۔ پنڈت جی کو مالک اور ساکن و متمکن میں فرق معلوم نہیں۔ ملک کے ہر ایک حصہ کو بادشاہ کی ملک بتایا جاتا ہے اور اس کا کہا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سرکاری گاؤں ہے، یہ شاہی رقبہ ہے تو اس کے معنی کوئی جاہل بھی نہیں سمجھتا کہ اس گاؤں یا اس رقبہ میں بادشاہ سکونت رکھتا ہے۔ پنڈت جی کی اتنی سمجھ ہے کہ کسی مکان کے مالک ہونے کو آپ اس میں رہنا اور محدود ہونا سمجھتے ہیں۔

ایسا محروم العقل انسان اگر کسی بلیغ کلام پر اعتراض کرے تو اس بے چارے کے اعتراض سے اس مقدس کلام کو کیا نقصان۔ یہ تو کسی مسلمان کی زبان سے پنڈت جی کے گوش زد ہو گیا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ محدود و محاط نہیں ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا ہے: وھو بکل شیء محیط۔ مگر اس گوش زدہ لفظ کے معنی پنڈت جی بے چارے کیا سمجھتے۔ آپ نے بہت اونچی اڑان اڑ کر جو خدا کی توصیف کی وہ یہ ہے کہ خدا دیاپک یعنی ہمہ جا موجود بالذات ہی ہے۔ ان کلموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قائل علم و عقل دونوں سے عاری ہے کیونکہ جس کی ذات کو ہمہ جا موجود مانتا ہے تو ہمہ جا اسی کے لیے مکان ہوا، اب اسے نامحدود کس منہ سے کہا جائے گا؟

○ ○ ○

اعتراض: قرآن کریم میں نمرود کافر مدعی ربوبیت کے ساتھ سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا مناظرہ مذکور ہے۔ اس کا ایک جزو یہ ہے:

قال ابراھیم فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب فبھت الذی کفر واللہ لا یھدی قوم الظالمین۔

پنڈت جی نے یہ آیت نقل کر کے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں لکھا ہے: "اللہ آفتاب کو مشرق سے لاتا ہے۔ پس تو مغرب سے لے آ، تب وہ کافر حیران رہ گیا۔ تحقیق اللہ گناہ گاروں کو راہ نہیں دکھلاتا۔"

یہ غلط سلط ترجمہ لکھنے کے بعد پنڈت جی نے یہ اعتراض کیا:

"دیکھیے! لاعلمی کی بات یہ ہے، آفتاب نہ مشرق سے مغرب اور نہ مغرب سے مشرق کبھی آتا جاتا ہے، وہ اپنے محور میں گردش کرتا رہتا ہے۔ اس سے تحقیق جانا جاتا ہے کہ قرآن کے مصنف کو علم ہیئت و جغرافیہ بھی نہیں آتا تھا۔ اگر گناہ گاروں کو راہ نہیں بتلاتا تو پرہیزگاروں کے لیے بھی مسلمانوں کے خدا کی ضرورت نہیں کیونکہ دھرماتما تو دھرم کی راہ میں ہوتے ہیں جو گمراہ ہوں ان کو راستہ بتلانا چاہیے اس لیے اس فرض کا ادا نہ کرنا قرآن کے مصنف کی بڑی غلطی ہے۔"

جواب: پنڈت جی کی کڑک اور گرج قابلِ دید ہے۔ آپ نے علم ہیئت اور جغرافیہ کا نام ہی کہیں سے سن پایا ہے اور آپ کو یقین ہے کہ آفتاب محوری حرکت کرتا ہے اس کو سوا اس میں اور کوئی حرکت نہیں۔ علم ہیئت کی اس قابلیت کی داد تو کچھ ان کے عقیدت مند ہی دیں گے جنہیں پنڈت جی علم ہیئت کے ذریعہ بتا گئے ہیں کہ فقط محوری حرکت سے رات دن کے انقلاب کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ پنڈت جی نے یہاں وید کے علم ہیئت اور اس کے دلائل کا کچھ اظہار نہ کیا جو ان کے اعتقاد میں سرچشمہ علوم ہے۔ اب اگر پنڈت جی کے ہوا خواہوں میں ان کی کچھ حمیت باقی ہو تو وہ وید کے اوراق تلاش کریں اور حرکت آفتاب کے متعلق وید میں کیا لکھا ہے۔ اسے معرض تحریر میں لائیں تو دنیا کو ان کے علم و قابلیت کا کچھ اندازہ ہو۔

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کی گفتگو نمرود بادشاہ سے تھی جو خدا کا

مدعی تھا اور آثار قدرت کو اپنی طرف نسبت کر کے ربوبیت کا دعویٰ کرتا تھا، اس کے مقابلہ میں جو دلیل حضرت ابراہیم علی نبینا و علیہ الصلوۃ والسلام نے پیش فرمائی اس نے تو نمرود کو ساکت و حیران کر دیا مگر اس کے ہزاروں برس بعد پنڈت جی اس دعویدار خدائی کے طرفدار بنے، اگر پنڈت جی نمرود کے وقت میں ہوتے بھی اور اپنی یہ گفتگو پیش کرتے تو نمرود اور اس کی قوم اتنی کودن اور بے وقوف نہ تھی جو اپنی طرفداری میں ایسی خلاف علم و عقل بات پیش کرا کے مزید رسوائی پسند کرتی، اتنا وہ لوگ جانتے تھے کہ آفتاب کی اپنی حرکت اور کواکب کی طرح مغرب سے جانب مشرق ہے اور حرکت قریبہ ان سب کو مشرق سے مغرب کی طرف لے جاتی ہے۔ حجت یہ قائم کی گئی تھی کہ ایک کوکب کو اس کی حرکت کے خلاف حرکت میں لانا اور گردش دینا یہ تو قدرت الٰہی کی تاثیر ہے۔ اے ربوبیت کے دعویدار! تجھ سے یہ بھی نہ ہو سکے گا کہ تو آفتاب کو اس کی حرکت کے موافق حرکت دے کہ یہ سہل ہے۔ نمرود اور اس کی قوم کے لوگ علم نجوم کے جاننے والے تھے، وہ اس دلیل کو سمجھ کر حیران ہو گئے مگر پنڈت جی تو محسوسات تک میں سب سے اور اک ہیں۔ آفتاب کی حرکت جانب مشرق سے مغرب کو محسوس ہے۔

ہر کوئی دیکھتا ہے کہ جس نے صبح و شام دیکھی ہے، جس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اس نے دیکھا ہے کہ آفتاب صبح مشرق میں تھا اور مغرب کی جانب سیر کرتا رہا، شام کو سمت مغرب میں غروب کر گیا، لیکن پنڈت جی کو اتنا نظر نہ آیا عمر بھر گزری اور آپ کو یہ نہ سوجھا کہ آفتاب کدھر سے کدھر کو چلتا ہے۔ آپ جغرافیہ کی کتابیں ٹٹول رہے ہیں۔ ہندوستان کے نقشہ ہی میں نہ دیکھ لیا، آسمان کی جانب دیکھنا اور دن میں چلتا ہوا سورج نظر آنا آپ کے لیے دشوار تھا تو پھر کسی بچے تکے ہی کھانہ ہی کو تلاش کیا ہوتا۔ دن میں کسی کو سوئی نظر نہ آئے آپ کو سورج نظر نہیں آتا۔ یہ زور بینائی قابل تعریف ہے اور یہ بات تو بھلا پنڈت جی اور ان کے ہوا خواہ کیا سمجھے ہوں گے کہ کواکب کی اپنی حرکت جانب مشرق سے مغرب کو ہے اور حرکت محسوسہ قریبہ ہے مگر حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کی برہان قوی نے خدائی کے مدعی نمرود کو عاجز و حیران کر دیا اور وہ ساکت و لاجواب ہو گیا اور اس کے دعویٰ کا بطلان جیسا دیکھنے والوں پر ظاہر ہوا خود اس کے اپنے

اور پھر بھی اس کے آثار مرتب ہو گئے۔

کوئی ذی علم شخص ہوتا تو حضرت خلیل کے اس استقامت حجت اور برہان روشن کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا اور کہتا کہ سبحان اللہ کیا دلیل قائم فرمائی ہے۔ یہ نبی ہی کا کام تھا اور ایسے سرکش مدعی خدائی کو اس قدر عاجز و شرمندہ کر دینا ہادی حق کا ایک بڑا کارنامہ ہے مگر پنڈت جی بے چارے سوچتے یہ ہیں کہ اگر وہ اس کی تعریف کریں تو کوئی ان سے یہی پوچھے گا کہ آپ جنہیں ہادی مانتے ہیں ان کا بھی تو کوئی کارنامہ پیش کیجئے تو وہ بے چارے ایسا کارنامہ کہاں سے لائیں گے۔ کھسیا کر عاجز و مجبور نمرود کے طرفدار ہو گئے اور بات عقل و علم ہی سے گری ہوئی نہیں بلکہ محسوسات کے خلاف زبان پر لائے۔ قرآن پاک پر اعتراض کرنے والے اسی طرح ذلیل و رسوا ہوتے ہیں۔

پنڈت جی کا دوسرا اعتراض اس آیت پر یہ ہے کہ اگر خدا گناہ گاروں کو راہ نہیں بتاتا تو پرہیز گاروں کے لیے بھی مسلمانوں کے خدا کی ضرورت نہیں کیونکہ دھرماتما تو دھرم کی راہ میں ہوتے ہی ہیں جو گمراہ ہیں، ان کو راستہ بتلانا چاہیے۔

جواب: پنڈت جی نے آیت کے ترجمہ میں خطا کی لا یھدی کا ترجمہ راہ نہیں بتلاتا غلط ہے۔ اسی طرح ظلمین کا ترجمہ محض گناہ گار۔ آیت میں کافر کا بیان ہے، نظم عبارت کا جاننے والا اور طرز کلام سے فہم مطلب حاصل کرنے کی قدرت رکھنے والا جانتا ہے کہ آیت کریمہ میں ایک کافر سرکش کا ذکر ہے جو کفر میں اس قدر راسخ تھا کہ خدائی کا دعویٰ کرتا تھا اور خود اپنی حقیقت جانتے ہوئے اور اپنے عجز اور بے بسی کو پہچانتے ہوئے اور اپنے اوپر قدرتی آثار کے تغیرات متواتر دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو خدا کہتا تھا، لوگوں سے اپنے آپ کو خدا کہلواتا تھا، اس کا تذکرہ فرما کر ارشاد کیا کہ اللہ ظالم قوم کو راہ نہیں دیتا یعنی جس نے براہین ساطعہ و حجج لائحہ سے قصداً آنکھیں بند کر لیں وہ ظالم ہے۔ اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا، اپنے آپ کو منزل مقصود تک پہنچنے سے روکا، منزل مقصود تک پہنچانے والے تک پہنچنے کے لیے مجبور نہ کیا جائے تاکہ وہ اپنے انتہائی سرکشی و عناد کی سزا پائے جس طرح روز روشن میں آفتاب رہنمائی کرتا ہے اور راستہ صاف اور واضح دکھا دیتا ہے کہ منزل کا جویا اس کی روشنی میں با آسانی مقصود تک

پہنچ جاتا ہے، اگر کوئی سیاہ بخت آفتاب سے عداوت کر کے آنکھوں پر پٹی باندھ لے اور آفتاب سے فائدہ نہ اٹھانے کی قسم کھالے تو آفتاب اس کو منزل تک نہ پہنچائے گا اور منزل سے محروم رہتا اور بھٹکتے پھرنا اور جابجا ٹکریں مارنا اور ٹھوکریں کھانا یہ اس کے عناد کی منصفانہ سزا ہوگی۔ اسی طرح اس متکبر مدعی خدا کو راہ تو دکھائی گئی۔ حضرت رب العزت تبارک و تعالیٰ کے ربوبیت و قدرت کاملہ کی ظاہر دلیلیں تو اس کے سامنے پیش کی گئیں جن سے وہ عاجز و لاجواب ہو گیا اور اس کو اور اس کی جماعت کو اس کے دعاوی کا بطلان آفتاب سے زیادہ روشن نظر آگیا لیکن اس کی سیاہ دلی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ دلیلوں سے عاجز و لاجواب ہونے کے باوجود اس نے قبول حق کا ارادہ نہ کیا اور اپنی اسی گمراہی میں پڑا رہا تو اب اس کی حکیمانہ و منصفانہ سزا یہی ہے کہ اس کو بغاوت و عناد کی سزا بھگتنے دی جائے۔ حکمت و دارالعمل کا اقتضا ہی نہیں ہے کہ اسے قبول حق کے لیے مجبور کر دیا جائے۔ لہٰذا پنڈت جی کا یہ کہنا کہ خدا گناہ گاروں کو راہ نہیں بتلاتا محض کذب اور باطل اور منطوق آیت کے صریح خلاف ہے۔ صریحاً تو مذکور ہے کہ راستہ بتادیا، دلائل قائم کیں، عاجز و لاجواب کر دیا، خود پنڈت نے اس کو نقل کیا پھر خود یہ کہہ دینا کہ خدا راستہ نہیں بتاتا دانش مندی و صداقت سے کس قدر دُور ہے۔

پنڈت جی کو ہدایت کا ترجمہ معلوم نہیں اور وہ نہیں جانتے کہ ہدایت کہاں ارادت کے معنی میں آتا ہے اور کہاں ایصال الی المطلوب کے معنی میں۔ ایسی بے علمی میں جو اعتراض کیا جائے، وہ ایسا ہی لغو ہوتا ہے پھر پنڈت جی کا یہ کہنا کہ پرہیزگاروں کے لیے رہنمائی کی ضرورت ہی نہیں، دھرماتما تو دھرم کی راہ میں ہوتے ہی ہیں اور انھیں خدا کی راہنمائی کی ضرورت ہی نہیں۔ بلکہ عقل انسانی ہی منازل خدا شناسی کے جاننے کے لیے کافی ہے تو پھر نہ وید کی ضرورت ہے، نہ شاستر کی، نہ رشی کی، نہ تربیت کی، نہ تعلیم کی سب کو دیا سلائی دکھاؤ، پھر آریہ کس منہ سے وید کو خدا کی کتاب بتاتے ہیں جب بغیر اس کے ہی انسان خدا کی راہ جان سکتا ہے تو وید کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تو یہ ہی سمجھتے ہیں کہ آدمی پرہیزگار خدا کی کتاب اور ربانی تعلیم ہی سے ہو سکتا ہے اور منازل خدا شناسی تک رسائی اسی کے فضل سے میسر آتی ہے۔ اسی حکمت کا اقتضا کہ رسول بھیجے

جاتے ہیں، کتابیں آتی ہیں، جو کوئی پرہیزگار بنتا ہے، وہ انہیں سے بنتا ہے اور جو ان کتابوں سے منحرف ہو، عداوت کرے، رسولوں کی تعلیم کا مخالف رہے، وہ منزل مقصود سے محروم رہتا ہے۔ اب پنڈت جی اور ان کے معتقدین یہ بھی بتائیں کہ کیا ان کے اعتقاد میں وید اپنے مخالفوں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے جو پنڈت جی کے عقیدہ میں گناہ گار ہیں اگر ایسا نہیں تو پھر پنڈت جی وید اور وید کے ایشور کے لیے کیا کہیں گے اور اگر سب کو اپنے راہ راست پر پہنچا دیا ہے تو پھر دنیا کے تمام مذاہب و ادیان اور انسان کے تمام طبقوں کو صحیح راہ پر مانیں اور مخالفت کیسی بلکہ وہاں تو حقیقت یہ ہے کہ نہ وہ اپنوں کو نفع پہنچاتا ہے، نہ بیگانوں کو، نہ موافقوں کو، نہ مخالفوں کو جس طرح کہ سراب نہ قریب والے کو سیراب کر سکتا ہے نہ دُور والے کو۔

کہا پرندوں میں سے چار پرندے لے پھر ان کو اپنے ساتھ ہلا تاکہ پہچان ہو جائے پھر ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک ایک ٹکڑا رکھ دے پھر ان کو بلا دوڑے تیرے پاس چلے آئیں گے۔ (سپارہ سوئم)

اعتراض: واہ واہ دیکھو جی مسلمانوں کا خدا شعبدہ بازوں کی طرح کھیل رہا ہے۔ کیا ایسی باتوں سے خدا کی خدائی ظاہر ہوتی ہے، عقل مند لوگ ایسے خدا کو خیرباد کہہ کر کنارہ کشی کریں گے اور جاہل لوگ پھنسیں گے، اس سے بھلائی کے بدلے برائی اس کے بدلے پڑے گی۔

جواب: اس سفاہت و نادانی کی کیا نہایت ہے کہ قدرتِ الٰہی کے آیات، جو معرفت کا اعلیٰ ذریعہ ہیں، ان کو پنڈت نے شعبدہ بازی اور کھیل کہہ دیا۔ معاذ اللہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ خداشناس ہی خدا کی قدرت جان سکتا ہے جو بصیرت کی روشنی سے محروم ہو، وہ برگشتہ بخت کب یہ سعادت پا سکتا ہے۔ دشمن عقل پنڈت کے نزدیک آفتاب و ماہتاب کواکب کے تمام نظام ان کی لرزشیں لیل و نہار کے تعاقب و ادوار فصول کے تبدل اور ان کی تاثیرات عالم جمادات کے عجائب اور عالم نباتات کی حیرت انگیز حالتیں اشخاص کا گونہ گوں حالتوں میں تبدیل ہونا اور ہر حالت پر جداگانہ احکام کا مرتب ہونا اور خود پنڈت کا اپنا وجود اس کا کبھی شیر خوار بچہ ہو تاکہ دانت بھی پیدا نہ

ہوتے ہوں، کبھی قریب بلوغ حالت میں شوخ و شنگ بھاگے بھاگے پھرنا، کبھی طالب علموں کی قطار میں کتاب بغل دبائے چلنا، کبھی جوان توانا ہونا، کبھی ضعیف القوت بوڑھا ہونا، یہ سب حالتیں کیا پنڈت نے خود پیدا کی ہیں یا اس کے ماں باپ نے اس کا وجود کسی متصرف کے دست تصرف میں انقلاب کے دھکے کھا رہا ہے اور کون اپنی تاثیرات قدرت کی رنگا رنگی دکھا رہا ہے۔ پنڈت شاان تمام تصرفات کو اپنے سلیقہ و تمیز سے شعبدہ و بازی گری کہے گا یا کیا کرے گا۔ ہر ایک سلطنت اپنے نائبوں کو اپنے نشان دیتی ہے، اس مخصوص نشان سے وہ پہچانے جاتے ہیں، فوج کے ہر ہر سپاہی کے پاس شاہی نشانی ہوتی ہے اور تمام افواج کے سپہ سالار بھی نشانیاں رکھتے ہیں، ان کی وردیاں بھی خاص ہوتی ہیں، ان وردیوں، نشانیوں سے ہر شخص ان کو پہچان لیتا ہے تو ضرور ہے اور اقتضاء حکمت یہی ہے کہ حضرت رب العزت جس کسی کو ہدایت خلق کے لیے مبعوث فرمائے اس کے ساتھ قدرت کے وہ نشان ہوں جن کو دیکھ کر دنیا یقین کر سکے کہ یقیناً ربانی شہادتیں اس ہادی کے ساتھ ہیں تو یہ ضرور حق پر ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور و مبعوث ہے، اگر ایسا نہ ہو تو خدا کے فرستادے جھوٹے مدعیوں سے کس طرح ممتاز ہوں گے مگر چونکہ پنڈت کے دین میں ایسا کوئی شخص نہ تھا جس کو آثار قدرت کی تائید حاصل ہوتی، اس لیے وہ بے چارہ اس تائید کے ساتھ تمسخر کرنے لگا اور اپنی بے چارگی و عاجزی پر نظر کر کے اس نے مقربان بارگاہ حق کے الٰہی تمغوں اور خدائی نشانوں کو شعبدہ بازی بتا دیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے نہایت کریہہ منظر حبشی اپنی قوم میں حسن و جمال کا مدعی ہو اور وہاں کسی طرف سے ایک عالم آرا ترک صاحب جمال پہنچے تو کالا بھجنگا حبشی اس کا منہ چڑانے لگے۔ اس منہ چڑانے اور شکل بگاڑنے سے ترکی جمیل کے حسن و جمال میں تو کوئی نقصان نہیں آئے گا مگر سیاہ رو حبشی کا چھوٹا منہ چڑانے سے اور بھی بگڑ جائے گا۔ پنڈت کا یہ اعتراض اس منہ چڑانے سے زیادہ ذلیل حرکت ہے۔ کاش! آریوں کے صاحب فہم و خرد لوگ اس ذلیل حرکت کو نفرت کی نظر سے دیکھیں اور پنڈت کی اس دریدہ دہنی پر افسوس کریں۔

○ ○ ○

جس کو چاہے حکمت دیتا ہے۔ (منزل اوّل سپارہ سوم)

اعتراض: اگر جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے تو جس کو نہیں چاہتا حکمت نہیں دیتا ہو گا۔ یہ بات خدا کی نہیں بلکہ جو طرف داری چھوڑ کر سب کو حکمت کی ہدایت کرتا ہے وہی خدا اور سچا واعظ ہو سکتا ہے' دوسرا نہیں۔

جواب: دیکھنے والے خیال کریں گے کہ اس کلام کا قائل نہایت کودن اور سادہ لوح ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ جس دین کا پابند ہے' اس کے اصول و اعتقاد ایسی بے خردانہ باتیں کہنے پر مجبور کرتے ہیں' وہاں ایشور کو نمائش کے لیے نام کا قادر مطلق مانا گیا ہے اور حقیقت میں اس کو تحصیل کے چپراسی کے برابر بھی اختیار نہیں۔ آریوں کے اعتقاد میں جہان کا تمام کاروبار گناہوں کے صدقے میں چل رہا ہے اور ہر شخص اپنے عمل کی جزا و سزا استحقاق سے پاتا ہے۔ ایشور میں کچھ بھی قدرت نہیں' وہ کسی کو ایک حبہ نہیں دے سکتا۔ ایک چپہ بھر زمین نہیں دے سکتا' ایک قطرہ پانی نہیں دے سکتا' بیمار کو تندرست نہیں کر سکتا' کسی کی تکلیف کو لحہ بھر کے لیے گھٹا نہیں سکتا۔ جہاں یہ اعتقاد ہو' جہاں خدا کی شان ایسی مجبور سمجھی گئی ہو' جہاں خدائی کے اختیارات نواب ٹونک کے برابر بھی نہ ہوں' وہ اپنی مشیت سے کچھ دینا کس طرح مان سکتے ہیں۔ وہ تو اسی کو خدا سمجھتے ہیں جو مجبور محض ہو اور قدرت و اختیار سے اس کا کوئی واسطہ اور علاقہ نہ ہو۔ آریوں کے بنائے ہوئے قانون قدرت کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہو۔ پنڈت کو خدائے قادر مختار کی قدرتِ کاملہ کا تصور ہی نہیں ہوا' اس لیے وہ اس لفظ سے چونک گیا' بدک گیا' گھبرا اٹھا' ایک زمیندار اپنی مرضی سے کاشتکار کو جو چاہے' انعام دے سکتا ہے' ایک آقا اپنے نوکر و خادم کو نواز سکتا ہے۔ ہر حیثیت کا آدمی دوسرے شخص کو اپنے املاک میں سے جو چاہے ہبہ کر سکتا ہے مگر آریوں کا ایشور ایسا نہیں کر سکتا' وہ مجبور ہے۔ یہ اس کی قدرتِ کاملہ ہے' اس کے گیت گائے یا باجہ بجائے' پھر ایسے خستہ حال مجبور ایشور کو ماننا ہی کیا اور اس کا کیا حاصل۔

اب پنڈت سے یہ کہئے کہ نصیحت اور وعظ تو جب ہی کسی کو نفع ہو سکتا ہے جب وہ صاحب فہم ہو' اگر پنڈت کی رائے میں اس کے اصول و دین میں ایشور کے لیے

ضروری نہیں ہے کہ ہدایت ہر شخص کو پہنچا دے تو لازم ہے۔ اس ایشور پر کہ کسی کو مجنون، مخبوط الحواس، مفقود العقل پیدا نہ کرے، اگر اس نے کچھ لوگ عاقل پیدا کیے، کچھ مجنون تو ہدایت کا سب تک پہنچانا جو اس کا فرض تھا ادا نہ ہوا۔ اب بتائیے پنڈت کہ ایشور پر طرف داری کا الزام آیا یا نہیں آیا۔ اب ایسے ایشور کی کیا سزا اور پنڈت کی زبان پر کلمہ آئے کہ سب کو ہدایت پہنچا دی جائے، کس قدر حیرت ناک بات ہے، کتنی شرم کی بات ہے، کتنی غیرت کی بات ہے؟ بقول پنڈت جی کے وید کو ایک ارب چھیانوے کروڑ برس سے زیادہ گزر چکے مگر اب تک وہ دنیا کے سب انسانوں کو تو کیا پہنچتا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھی نہ پہنچ سکا۔ کیسی ہی خراب خستہ بھینسا گاڑی بھی ہوتی تو وہ بھی اتنی مدت میں لاکھوں چکر لگا چکی ہوتی مگر واہ رے ایشور کے وید! اربوں برس گزر گئے اور گھر والوں تک کو نہ ملا۔ اس پر یہ کہنا کہ حکمت کی بات سب کو پہنچانا چاہیے، یہ وہ طمانچہ ہے جو قائل اپنے منہ پر مار رہا ہے، اس سے پوچھو کہ اگر وید میں کوئی حکمت کی بات تھی تو اربوں برس میں بھی وہ کیوں ساری دنیا کو نہ پہنچی اور اس میں کوئی حکمت کی بات نہیں ہے تو پھر اس پر کیوں سر منڈائے بیٹھے ہو اور کیوں اس کو کتاب الٰہی کہتے ہو۔ ہم تو اللہ تعالیٰ کو قادر و مختار جانتے ہیں، جس سرزمین میں چاہے بارش کرے، اس خطہ کو سرسبز و شاداب بنا دے، اس کو اختیار ہے، وہ مالک ہے تو کوئی دم نہیں مار سکتا، کسی کی مجال نہیں کہ زبان ہلائے اور اگر ہلائے اور اس حکمت میں چون و چرا کرے تو وہ مجرم ہے، باغی ہے، ناخدا شناس ہے، منکر قدرت ہے۔ کافر بے دین ہے، مستحق عذاب ہے، فی النار کیا جائے گا۔ پنڈت جی نے یہ نہ کہا یہ طرف داری کیسی؟ وید سنسکرت میں کیوں ہے؟ دنیا کی ہر زبان میں کیوں نہیں ایک خطہ ہند کے ساتھ اس کی کیا خصوصیت؟ یہ اعتقاد رکھتے ہوئے زبان کھولنا شرم۔

○ ○ ○

پھر چاہے گا معاف کرے گا جس کو چاہے گا عذاب دے گا کیونکہ وہ سب چیزوں پر قادر ہے۔ (پارہ ۳)

اعتراض: وہ کیا بخشش کے مستحق کو نہ بخشا اور غیر مستحق کو بخشا غیر منصف بادشاہ کا سا کام نہیں۔ اگر خدا جس کو چاہتا ہے گناہ گار یا دھرماتما بناتا ہے تو روح کو گناہ و ثواب کا کرنے والا نہ کہنا چاہیے۔ جب خدا نے اس کو ویسا ہی کیا تو انسان کو تکلیف و راحت بھی نہ ہونی چاہیے' جیسے سپہ سالار کے حکم سے کسی نوکر نے کسی کو مارا تو اس کا ثمرہ حاصل کرنے والا وہ نہیں ہوتا' ایسے ہی وہ بھی نہیں۔

جواب: آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی مشیت و قدرت کا کیسا نفیس بیان ہے جس سے شانِ خدائی ظاہر ہوتی ہے۔ ہر صاحبِ عقل سمجھ سکتا ہے کہ خدا کی یہی شان ہونا چاہیے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہو' ہر ممکن اس کے تحت و قدرت ہو' کہیں اسے عجز پیش نہ آئے۔ جو ایسا نہ ہو وہ خدا نہیں' مجبور ہے' عاجز ہے' ضعیف و ناتواں ہے۔ اگر آریہ ایشور کو ایسا نہیں سمجھتے تو اس کو خدا کہنا ہی غلط ہے اور اگر وہ یہ عموم قدرت تسلیم کر لیں تو آیت پر اعتراض کس درجہ کی لغویت ہے؟ معاف کرنا اور عذاب کرنا مشیت میں ہو' جسے چاہے معاف کرے جسے چاہے سزا دے' یہی شانِ خدائی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو سزا دینے اور معاف کرنے میں وہ مجبور ہوگا۔ مجبور ہونا خدا کی شان نہیں' جو مجبور ہو خدا نہیں ہو سکتا۔ جس کو اتنا بھی اختیار نہ ہو کہ اپنی مخلوق کو اپنی مرضی سے بخش سکے اور سزا دے سکے اس کو خدا کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ خدا کے مرتبے اور اس کی صفات کے جاننے والے اور خدائی کی عزت پہچاننے والے قرآن کریم کے اس عارفانہ ارشاد کے سامنے سر جھکا دیں گے اور جبینِ نیاز سجدہ میں رکھ دیں گے کہ وہ بے شک مالک الملک ہے' قادر مطلق ہے' سزا دینا اور معاف کر دینا اس کے قبضہ اختیار میں ہے۔

اگر پنڈت کے اعتقاد میں ان کے پرمیشور کو یہ اختیار حاصل نہ ہو اور وہ گناہ گار کا قصور معاف نہ کر سکے تو ویدوں میں پرارتھنا اور دعائیں کس لیے ہیں؟ کیا یہ دنیا کو دھوکے اور مغالطے دیئے گئے ہیں۔ ایشور سے التجائیں کیوں کی جاتی ہیں' عجب نہیں کہ پنڈت جی معاف کرنے اور عذاب دینے کے معنی بھی نہ سمجھے ہوں اگرچہ یہ ایسی صاف بات ہے جس کو دیہاتی بھی سمجھ سکتے ہیں کہ سزا دینا اور معاف کرنا ان دونوں باتوں کا تعلق خطاوار سے ہوتا ہے کہ خطاوار کی خطا چاہے حاکم معاف کرے' چاہے سزا دے تو

پنڈت جی کے نزدیک وہ کونسا خطاوار ہے جس کو بخشا ان کے اعتقاد میں ان کے ایشور پر واجب ہو جاتا ہے اور وہ کون سا خطاوار ہے جس کو سزا دینے کے لیے ایشور کو مجبور ہونا پڑتا ہے۔ سزا دینے اور معاف کرنے کا اختیار تو دنیا کے حاکم بھی رکھتے ہیں جو اتنا بھی اختیار نہ رکھتا ہو' اس کو صرف خالق مان کہنا صریح جھوٹ ہے' مغالطہ ہے' لوگوں کو دھوکے میں ڈالنا ہے' پھر جس کو چاہے گا معاف کرے گا' جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ اس مضمون پر اعتراض کورانہ عناد سے ہے یا محض بے عقلی ہے۔

پنڈت کو یہ معلوم نہیں کہ خدا کے لیے تمام صفات کمال ثابت ہیں۔ ان صفات میں سے حکمت بھی ایک صفت ہے تو جو حکیم ہے اس سے کس طرح متصور ہے کہ وہ غیر حکیمانہ فعل کو چاہے۔ لہٰذا جس امر کو وہ چاہے گا وہی مقتضائے حکمت ہوگا اور جو مقتضائے حکمت امر پر اعتراض کرے وہ عقل' دین' دیانت سب کا دشمن ہے۔ پنڈت کا یہ کہنا بالکل باطل ہے کہ روح کو گناہ و ثواب کا کرنے والا نہ کہنا چاہیے جب اپنے خداداد ارادے و اختیار سے عمل کرتا ہے تو وہ عمل کیوں اس کی طرف منسوب نہ ہوا اور کس لیے اس عمل کی جزا یا سزا اس پر مرتب نہ کی جائے' جہاں بندہ بے اختیار ہوتا ہے وہاں شریعت اسلام اس پر گرفت نہیں فرماتی' مجبور محض کو نہیں پکڑا جاتا' اس لیے مجنون پر تکلیفی احکام نہیں ہیں' جس سے بجز کوئی جرم کرایا جائے اس پر مواخذہ نہیں ہے۔ مواخذہ اور گرفت اسی پر ہے جس کو اختیار دیا ہے' نیک و بد بتا دیا ہے' اپنی مرضی ظاہر فرما دی ہے' پھر اس نے اختیار ہوتے ہوئے اس کے خلاف کیا تو ضرور وہ مجرم ہے' خطاوار ہے' قابلِ سزا ہے۔ پنڈت کی مثال غلط ہے کہ "سپہ سالار کے حکم سے کسی نوکر نے کسی کو مارا تو اس کا ثمرہ حاصل کرنے والا وہ نہیں ہوتا۔" یہاں یہ کسی نے نہیں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو کوئی کام کیا جائے اس پر سزا ہوتی ہے۔ سزا کا مستحق تو وہی ہوتا ہے جو حکم الٰہی کے خلاف کرے۔ پنڈت کے اعتراض کا ایک ایک جملہ غلطیوں اور نادانیوں کا مجموعہ ہے۔

○ ○ ○

اعتراض: کہہ دیں اس سے بہتر خبر پرہیز گاروں کو کہ اللہ کے پاس بہشتیں ہیں جنہیں نہریں چلتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والی پاک بیبیاں ہیں، اللہ کی خوشی ہے، اللہ دیکھتا ہے، اپنے بندوں کو۔ (منزل اوّل سپارہ سوم آل عمران)

بھلا یہ بہشت ہے یا طوائف خانہ؟ اس کو خدا کہیں یا سرین (عورتوں کا دلدادہ) کیا کوئی بھی عقل مند ایسی باتیں جس میں ہوں اس کو خدا کی بنائی ہوئی کتاب مان سکتا ہے۔ خدا طرفداری کیوں کرتا ہے جو بیبیاں ہمیشہ سے بہشت میں رہتی ہیں، کیا وہ یہاں سے پیدا ہو کر وہاں گئی ہیں یا وہیں پیدا ہوئی ہیں، اگر یہاں سے پیدا ہو کر وہاں گئی ہیں اور قیامت کی رات سے پہلے ہی وہاں بیبیوں کو بلا لیا تو ان کے خاوندوں کو کیوں نہ بلا لیا اور قیامت کی رات میں سب کا انصاف ہو گا اس عہد کو کیوں توڑا اگر وہیں پیدا ہوئیں تو قیامت تک وہ کیونکر گزارہ کرتی ہیں، اگر ان کے واسطے آدمی بھی ہیں یہاں سے بہشت میں جانے والے مسلمانوں کو خدا بیبیاں کہاں سے دے گا اور جیسے بیبیاں بہشت میں (ہمیشہ رہنے والی) بنائیں، ویسے مردوں کو وہاں ہمیشہ رہنے والے کیوں نہیں بنایا اسی واسطے مسلمانوں کا خدا بھی بے انصاف اور بے سمجھ ہے۔

جواب: بے حیائی و بد زبانی کی انتہا ہو گئی، کوئی سڑ بھنگ بھی ایسی بے محابا گالی گلوچ کی ہمت نہ کرے گا۔ شرم اس قوم پر، حیرت ہے جو ایسے گندہ ذہن، بد زبان گلیر کو دین کا پیشوا سمجھے۔ جہاں پیشواؤں کے اخلاق کا یہ عالم ہے، وہاں متبعین کے خصائل جیسے ہونے چاہئیں، ظاہر ہے کھلی گلوچ کرنا اور بد زبانی پر اترانا عاجزی کی نشانی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس غریق تعصب کو کوئی اعتراض کی جگہ ہاتھ نہ آئی تو جھنجھل میں گالیاں بکنے لگا۔ آیت شریفہ میں تو نفیس مضمون تھا اس پر سیاہ دلی سے کیسا زہر اگلا ہے، پرہیز گاروں کی جزا کا بیان تھا کہ آخرت میں ان کے لیے مساکن طیبہ و مناظر دل کشا اور ان کا دائمی عیش و سرور ہے اور پاک بیبیاں اور رضائے الٰہی، عقل ہوتی تو ان نعمتوں کی قدر سمجھتا۔ انسان رہنے کے لیے مکان کا محتاج ہے، ایک نہ ایک مسکن اس کو بہرحال ناگزیر ہے تو لامحالہ جو مستحق انعام ہو، مورد اکرام ہو، لائق مرحمت ہو، اس کو بہتر مقام اور بہتر مسکن عطا کیا جانا قرین حکمت و انصاف ہے۔ جو لوگ اکرام شاہی کے مورد

ہوتے ہیں، ان کی نفیس مکانوں میں میزبانی کی جاتی ہے اور قدر و منزلت کے مکان رہنے کو دیئے جاتے ہیں۔ تو جس نے اپنی زندگانی تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ راہ الٰہی میں صرف کی ہو اور کرم الٰہی سے وہ موردِ عنایت و مستحقِ کرامت بنا گیا ہو، اس کے لیے ضرور ایسا ہی مکان ہونا چاہیے جس تک اس دنیا میں انسان کی بلندی فکر بھی رسائی نہ کر سکے۔

انصاف والا، کرم والا، داد و دہش والا کائنات کا مالک اپنے اطاعت شعاروں کو ایسی ہی جزا عنایت فرماتا ہے اور اس کی شانِ کرم کے یہی لائق ہے۔ جس نے کریم کا دربار دیکھا ہی نہ ہو، ہمیشہ مفلسوں اور گداگروں میں زندگی بسر کی ہو اس کی فکر کریمانہ جود و عطا تک کب پہنچ سکتی ہے اور عظیم و جلیل نعمتوں کا عطا کیا جانا اس کے خیال خام اور اس کی عقل ناقص میں کب آ سکتا ہے۔ وہ اس سلوک کا عادی رہا ہے اور جیسے برتاؤ اس نے دیکھے ہیں، سب کو اسی اندازہ اور قیاس سے جانچتا ہے۔

بہرحال انسان کے لیے مسکن ضروری اور جس درجہ کا انسان ہو، جس مرتبہ کا اس کا اخلاص اور اطاعت شعاری ہو، جیسا تقویٰ اور پرہیزگاری وہ رکھتا ہو، اسی کے لائق اس کو مسکن ملنا تقاضائے حکمت ہے، اس لیے پرہیزگار ایمانداروں کے لیے جنتوں کے پاکیزہ دلکش منازل و مساکن ہیں اور ان میں ادراک عقل و فہم سے بالاتر زینت و زیبائش، راحت و آسائش کے اسباب، پھر اگر مسکن ہو، کیسا بھی وسیع ہو، کتنا بھی دل کشا ہو، کیسے ہی سامانوں سے مزین ہو مگر تنہائی ہو، اپنا ہم جنس کوئی نہ ہو تو طبیعت انسانی کی جبلت ہے کہ وہ ان سے لطف اندوز نہیں ہوتا، اس کو وحشت ہوتی ہے، تو جس نے اس کی راحت کے لیے اتنے کثیر سامان اور ایسے نفیس مکان عطا کیے اس کا کرم کب گوارا کر سکتا ہے کہ اس بندۂ مخلص کو تنہائی کی وحشت میں رکھ کر تمام نعمتوں سے بے لطف و بے کیف کر دے۔ جہاں اتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں وہاں دل پسند مونس اور مرغوب و محبوب ہمدم بھی عطا کرنا شانِ کرم ہے کہ بغیر اس کے عیش و راحت اور فرحت و مسرت کمال کو نہیں پہنچ سکتے، اس لیے بہ مقتضائے عقل بھی شایان ہے کہ نیکوں اور اطاعت شعاروں کو دارالجزاء میں بہترین مساکن اور محبوب و مرغوب ہمدم و

انہیں عطا کیے جائیں اور جب یہ راحت و سرور اپنے کمال کو پہنچ جائے تو محبوب حقیقی کے رضا و خوشنودی کی سب سے اعظم نعمت اور اعلیٰ دولت مرحمت فرمائی جائے۔ یہ عاقلانہ و حکیمانہ مضمون قرآن میں پڑھا، عقل ہوتی تو مدح و ثنا میں زبان کھلتی، دل اس کتاب کی طرف جھکتا، صادق جذبات ایمان لانے پر مصر ہوتے مگر تعصب کی تاریکی میں جو گرفتار ہوا اور عناد کی نابینائی نے جس کی بصیرت کو فنا کر ڈالا ہو وہ ان خوبیوں کو کیا سمجھے اور جوش تعصب میں اعتراض کی دھن ہوا تو بے چارہ کیا کرے جبکہ ان مضامین میں کہیں گنجائش اعتراض باقی نہیں۔ مجبوراً کھسیا کر گالیاں بکنے لگتا ہے۔

قرآن کریم میں یہ ذکر تھا کہ جنت میں پاک بیبیاں عطا ہوں گی، اس پر گندہ ذہن گستاخ نے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ اپنی ذہنیت کی گندگی کو قلم سے ادا کیا اور جنت کو بے دھڑک طوائف خانہ لکھ دیا۔ یہ لفظ کس قدر کریہہ، کتنا خلافِ تہذیب، قابلِ نفرت ہے، اتنا ہر شخص جانتا ہے مگر پنڈت اور اس کے ماننے والوں سے بجز اس کے کیا کہا جائے کہ بیبیوں کے رہنے کے مکان کو اگر تمہارے لغت و محاورہ میں طوائف خانہ کہا جاتا ہے تو تم سب طوائف خانوں ہی کی پیداوار ہو اور تمہارے سب کے گھر طوائف خانہ ہی ہیں۔ یہ میرا کلام نہیں، اسی معترض کا محاورہ اس کے گھر استعمال کرکے دکھا رہا ہوں اور وہ بھی ایک شمہ، پنڈت سے پوچھئے تو اس کے دین و ملت میں پرہیزگاروں، عبادت گزاروں کی کیا جزا بتائی گئی ہے۔ انہیں رہنے کو جو جگہ ملے گی جس کا نام پنڈت جی نے مکتی خانہ رکھا ہے، اس کی کیا شان و صفت ہے، جنت کی طرح مزین اور اسبابِ عیش و راحت اور سامانِ زیب و زینت سے آراستہ و پیراستہ تو وہ کہہ نہیں سکتا کیونکہ یہ بات اس کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے تو لامحالہ وہ مکتی خانہ ہیبت ناک جیل ہوگا یا وحشت ناک حوالات، جہاں ایک مدت طویل تک بڑے بڑے برہمچاریوں اور سنیاسیوں کو قید تنہائی کاٹنی پڑے گی، تو یہ ان کے عمل کی جزا ہوئی یا سزا؟

اسی کے بعد بدباطن معترض نے اور زیادہ بدزبانی کی ہے اور شانِ الٰہی میں بے قید بدمعاشوں سے بھی زیادہ کمینے الفاظ ادا کیے ہیں اور اس جناب پاک کو عورتوں کا دلدادہ بتایا ہے، کیا مردوں کے لیے جوڑے پیدا کرنا یہ عورتوں کا دلدادہ ہونا ہے؟ اگر کہئے ہاں! تو

پوچھو کہ پھر دنیا میں عورتیں کیا خدا کے سوا کسی اور نے پیدا کر دی ہیں یا عورتوں کا پیدا کرنا اس کی شان و حکمت کے خلاف ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اسے خدا کیوں کہتے ہو اور اگر خلاف حکمت نہیں ہے بلکہ نعمت و کرم ہے تو اس کا اعتراف کیوں نہیں کرتے، گالیاں کیوں بکتے ہو اور بد تمیزی سے اس کی شان میں زبان کیوں کھولتے ہو۔

اس کے بعد معترض سیاہ باطن کی حالت اور زیادہ ابتر ہوئی اور اس شخص نے حوران بہشت کے لیے ایسے ناقص کلمے استعمال کیے جن سے دنیا کے آوارہ، بد چلن آدمی بھی پناہ مانگ جائیں، معلوم نہیں اس شخص نے کس صحبت میں پرورش پائی ہے اور اس کی اخلاقی حالت کیوں اس قدر ردی اور زبوں ہے کہ وہ انسانیت کے درجہ سے گزر گیا۔ ایسی بے ہودہ باتیں کہ حوروں کی نسبت کہا کہ ان کی عمر کیسے گزرتی ہوگی، ایسے کمینہ پن کی باتیں کسی شریف الطبع انسان سے کس طرح صادر ہو سکتی ہیں اور کچھ بھی عقل ہوتی تو سمجھ لیتا کہ دنیا میں بھی پیدا کرنے والے نے عورتوں کو پیدا کیا اور ان کے لیے ایک ایسا زمانہ اور ایسی میعاد مقرر فرما دی جس میں قوائے شہوانیہ کالعدم ہوتی ہیں اور خواہشات کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ یہی سمجھ لیتا کہ اس کی قوم کی لڑکیاں بلوغ سے پہلے ماں باپ کے گھر کس طرح دن گزارا کرتی ہیں۔ معترض کے اس ناقص مضمون کی شناعت اور برائی کے بہت شرمناک پہلو ہیں جن کو زیر قلم لانے سے طبیعت کراہت کرتی ہے، اس لیے ان سے نظر ہٹاتا ہوں۔ پھر بھی اس قدر بیان بفضلہ تعالیٰ اس کے رد بالغ کے لیے کافی سے بہت زیادہ ہے اور اس کے ہواخواہوں میں سے کسی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس کا کوئی معقول جواب دے سکے اور معترض نادان نے جو حیاسوز جرم کیا ہے، اس کی کوئی معذرت پیش کر سکے۔